

اپریل 2018

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

BOOKSPK

Books & Magazines



بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خلفہ و کتابت کا پیٹہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

بانی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیر - رضیہ جمیل

مدیر منظم - افریقا ریاض

مدیر اغری - امت المصنوع

فلاحی و فن - شاہین رشید

اشتراکات - خالد جیلانی

قانونی مشیر - نور الدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈیٹوریل ایڈیٹر

ان آل پاکستان نوز پیمبر و سوسائٹی
پاکستان نوز پیمبر ذیلہ نوز

ME KINEM
APN
CPN





284	امت الصبور	17	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	274	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	286	واصفہ ہسین	ایٹینہ خالے میں
		276	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
		282	خالہ جیلانی	کھلتا کسی پہ

اپریل 2018
جلد 32 نمبر 8
قیمت 80 روپے

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



192	ایمل رضا	اباجی
74	عتیقہ الرب	تسیری راہ میں



66	نعیمہ ناز	آنکھن ٹیڑھا
95	عذیبہ زہرا	آنے والا محبِ سالا
136	امیر خالد	فارمولا کہانی
211	ماہ وصال طالب	پسِ آئینہ



273	حفیظہ ہوشیار پوری	غزل
273	سیما عابدی	نظم

زیر سالانہ تکبیر چنگٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع و اجست کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی کی وی بکسٹل پڑھنا، ڈرامائی تھکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

10	رضیہ جمیل	پہلی شعاع
11	رحمان بخاری	حمد
11	الطاف سکھتروی	نعت
12	ادارہ	نئی کی باتیں



279	سمیرا حمید	کتاب کہانی
28	شامین رشید	دستک
32	فیض بخش	جب تجھ سے ملتا



218	عفت گلار	خوب شیشہ کا
36	صائمہ اکرم	شہر زاد



146	ملوئی ملی بٹ	شہری دھوپ
98	مصباح علیہ	تمنائے روشنی
236	فرزاد بکھرل	بہارِ آرمی ہے
164	ہوشِ انتظار	شبِ تاب

شعاع اپریل کا شمار آپ کے ہفتوں میں ہے۔ یہ تیز رفتاری ہماری زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ ہمارے دوست بے ہوش، ہماری ذہنی اور فکری سطح میں تبدیلی آئی ہے اور ہماری معاشرتی زندگی بھی تیز رفتاری کے اثرات سے محفوظ نہیں رہی ہے۔ ذرائع ابلاغ کے پھیلاؤ سے تفریح کے نئے ذرائع سامنے آ رہے ہیں۔ اب خوش وقتی کے لیے بے شمار مشاغل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرنٹ میڈیا کے بارے میں خدشات ابھر رہے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی ناقابل یقین ترقی کے باوجود آج بھی پرنٹ میڈیا کی اہمیت برقرار ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ الیکٹرانک ذرائع کی ترقی نے قاری کی سوچ اور فکر کو بدلا ہے۔ اس کی نظر میں وسعت اور گہرائی آئی ہے۔ اس کے ہم دشور میں اضافہ ہوا ہے۔ اب اسے محض لفظوں کے گورکھ دھندے اور طوطا مینا کی کہانیوں سے نہیں بہلا یاں سکتا۔ اب اس کے پاس وہ فراغت نہیں رہی کہ وہ طویل قسط وار کہانیوں کو پڑھے اور ان کے کرداروں کو یاد رکھے۔

آج کے تخلیق کار کو خود کو منوالے کے لیے بدلتے حالات کے ساتھ چلنا ہوگا۔ وقت کی تیز رفتاری کو مد نظر رکھتے ہوئے کہانی کو اس انداز میں لکھنا ہوگا جو کم وقت میں قاری کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کر سکے۔ طویل اور قسط وار کہانیاں پڑھنے کے لیے آج کے قاری کے پاس وقت نہیں۔ قدرے کم طویل کہانیاں جہاں دریا اثر رکھتی ہیں وہیں قاری کی ذہنی و فکری آسودگی کا سماں ہوتی ہیں لیکن — تحریر میں معنویت کے ساتھ ساتھ فکر تازہ اور ندرت خیال بھی ضروری ہے۔ تاکہ قاری اور نگاری کا رشتہ برقرار رہے۔

مبارک باد

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے بے شمار خواتین کو اپنی تخلیقی صلاحیت کے اظہار کے لیے ایک پلیٹ فارم ملا اور اس کے ذریعے بے شمار مصنفات سامنے آئیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ خواتین کے عالمی دن کے موقع پر جو پچاس نمایاں اور بااثر خواتین کی فہرست سامنے آئی ہے، ان میں ہماری تین مصنفین کا نام بھی شامل ہے۔

عمیرہ احمد، غمراہ احمد سمیرا حمید۔
زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان ناموں کا انتخاب عوام کی کثرت رائے سے کیا گیا ہے۔
بلاشبہ یہ ہماری ان مصنفین کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے اور ہمارے لیے بھی۔
ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے ان مصنفین کو مبارک باد۔ ہماری دعا ہے کہ وہ ترقی کی منازل اسی طرح طے کرتی رہیں۔ آمین۔

اسٹس شمارے میں،

• مصباح علی کامکمل ناول۔ تنائے روشنی، فرزانہ کمرل کامکمل ناول۔ بہار آئی ہے،
• ہوش افشار کامکمل ناول۔ شب تاب، سوئی بینڈ کامکمل ناول۔ شہری دھوپ،
• عتیقہ ایوب امداد ایل رضا کے ناولٹ، صائمہ اکرم اور حفصہ سحر طاہر کے ناول،
• نعمت نانہ، حذیب زہراء، ابر خاں احمد ہوش طالب کے افسانے، معوض فکار محمود اسلم سے ملاقات،
• معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک، پیارے غی ملی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
• جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

بے مثل و بے بدل ہے ایک ایک کام تیرا
یکتا ہے ذات تیری، واحد ہے نام تیرا

مرشز زمیں پہ تو ہے، عرش علی پہ تو ہے
یہ بھی مقام تیرا وہ بھی مقام تیرا

طہر شہد و ماہ انجم یکے رواں دواں ہیں
ہم بشر سے بالا ہے انصرام تیرا

گلشن میں چہچہوں میں حمد و ثناء ہے تیری
کاتے ہیں گن پرندے ہر صبح شام تیرا

السان خود غرض ہے طامع ہے کم نظر ہے
ہڈی ہے جب مصیبت لیتا ہے نام تیرا

کلفت میں بھی ملا ہے اس کو سکون قلبی
الطاف ہو گیا ہے دل سے غلام تیرا

الطاف شکستروی

روز و شب ابھرتی ہے اک صدامدینے سے
سوئے غلہ جاتا ہے، راستہ مدینے سے

ہو گئی فضاؤں میں، جیسے عطر افشانی
میرے شہر تک آئی، جب ہوامدینے سے

دوری مدینہ اب، حسرت مجسم ہے
دور رہ کے کیا جینا، اے غلامدینے سے

حسن دین و دنیا کا، ایک رنگ پاؤ گے
اس جہان فانی کو، دیکھنا مدینے سے

جیسے چھوڑ آئے ہوں، خود کو ہم مدینے میں
گھر کو اپنے ہم واپس آئے کیا مدینے سے

اپنی اپنی قسمت ہے، جس کو جو بھی مل جائے
کیا بتائیں ہم کسی کو، کیا ملامدینے سے

روئے زیت کو خاور، اس طرح نکھاریں گے
عکس لیں گے کعبے سے، آئینہ مدینے سے

رحمان خاور



قرآن کریم پڑھنے کی فضیلت

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”قرآن (کثرت سے) پڑھا کرو، اس لیے کہ قیامت والے دن یہ اپنے (پڑھنے والے) ساتھیوں کے لیے سفارش بن کر آئے گا۔“ (مسلم)

فوائد مسائل:

(1) اس میں قرآن کریم کی تلاوت اور اس پر عمل کرنے کی فضیلت کا بیان ہے خوش الحانی سے پڑھ لینے کے ساتھ اسے سمجھنا بھی ضروری ہے تاکہ عمل کیا جاسکے۔

(2) سفارشی کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کو قوت گویائی عطا فرمائے گا اور وہ اپنے قاری اور عامل کے گناہوں کی مغفرت کا اللہ سے سوال کرے گا جسے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا۔

سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”قیامت والے دن قرآن کو اور ان لوگوں کو جو دنیا میں اس پر عمل کرتے تھے، (بارگاہ الہی میں) پیش کیا جائے گا۔ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران ان کے آگے آگے ہوں گی، اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑا کریں گی۔“ (مسلم)

فائدہ: بارگاہ الہی میں قرآن کریم اور خاص

طور پر مذکورہ سورتیں، اپنے پڑھنے والے اور ان پر عمل کرنے والے کے لیے سفارش کریں گی اور رب تعالیٰ سے اصرار و تکرار کر کے ان کی مغفرت کروائیں گی۔

بہتر شخص

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن

سیکھے اور اسے سکھلائے۔“ (بخاری)

فوائد مسائل: اس میں قرآن کریم کی تعلیم و تعلم، یعنی خود سیکھنے اور دوسروں کو، اللہ کی رضا کے لیے، سکھانے کی

فضیلت ہے۔ 2۔ عمر حاضر میں قرآن مجید اور دینی تعلیم حاصل کرنے والے اکثر و بیشتر ان خاندانوں کے بچے ہوتے ہیں جو مالی طور پر کمزور ہوتے ہیں اور کئی لوگ ان طلبہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس حدیث میں ایسے لوگوں کے لیے تنبیہ ہے کہ یہ قرآن پڑھنے والے سب سے افضل لوگ ہیں۔

3۔ دینی تعلیم سے وابستہ علماء اور طلبہ کو بھی اپنی قدر و منزلت پہچانی چاہیے۔ خود داری اور وقار کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی ضرورتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنی چاہئیں۔

دگنا اجر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے،

”وہ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور (صحت کے ساتھ) قرآن کریم پڑھنے میں ماہر ہے تو وہ (قیامت والے دن) بزرگ، نیکو کار فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جو قرآن انک انک کر پڑھتا ہے اور اس کے ہاتھ میں اسے مشقت ہوتی ہے، اس کے لیے دگنا اجر ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد مسائل:

1۔ ماہر سے مراد قرآن کریم کا حافظ اور تجوید و ان صوت سے پڑھنے والا ہے۔

2۔ دوسرا وہ شخص ہے جو حافظ نہیں ہے اور تجوید و ان صوت سے بھی بہرہ ور نہیں ہے۔ اس لیے قرآن فصاحت و روانی سے نہیں پڑھ سکتا، لیکن اس کے ہاں جو ذوق و شوق سے انک انک کر پڑھتا ہے اور پڑھنے میں جو مشقت ہوتی ہے، اسے برداشت کرتا ہے، اس مشقت کی وجہ سے اسے دگنا اجر ملے گا۔

مومن کی مثال

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اس مومن کی مثال جو قرآن کریم پڑھتا ہے، زمین (نارنگی، سیب) کی سی ہے کہ اس کی خوشبو بھی اچھی ہے اور ذائقہ بھی۔ اور اس مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا، کھجور کی سی ہے کہ اس کی خوشبو نہیں اچھی ہے اور اس منافق کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے، خوشبودار پودے (جیسے ناز بونچا سمیں و لیمو) کی طرح ہے جس کی خوشبو اچھی ہے لیکن ذائقہ نہیں ہے۔ اور اس منافق کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا، اندراکن (تے) کی طرح ہے جس کی خوشبو بھی اچھی ہے اور اس کا ذائقہ بھی کڑوا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد مسائل:

1۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا حافظ اور اس پر عمل کرنے والا مومن تو خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھل کی طرح عند اللہ بھی مقبول ہے اور لوگوں

میں بھی اس کی عزت ہے اور جو مومن حافظ قرآن نہیں ہے، تاہم قرآن کا عامل ہے، اللہ کے ہاں اور لوگوں کی نظروں میں یہ بھی اچھا ہے۔ اور قرآن پڑھنے والے منافق کا ظاہر اچھا ہے لیکن باطن گند اور تاریک ہے اور آخر میں اس منافق کا ذکر ہے جو قرآن نہیں پڑھتا، اس کا ظاہر و باطن ناپاک ہے۔

2۔ اس میں حاملین قرآن کے لیے یہ وعظ ہے کہ ان کا اخلاق اچھا ہونا چاہیے اور ان کا کردار خوش ذائقہ پھل کی طرح ہونا چاہیے جو اپنے کاٹنے والے کو بھی برابر مزہ دیتا ہے۔

سرفرازی

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن مجید) کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو سرفراز فرمائے گا اور اسی کی وجہ سے دوسروں کو ذلیل کر دے گا۔“ (مسلم)

فائدہ: سرفراز، اللہ کے حکم سے وہی ہوں گے جو قرآن کے احکام کو بجالائیں گے اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کریں گے اور اس کے برعکس کردار کے حامل لوگوں کے لیے بالآخر ذلت و رسوائی ہی ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کو اللہ نے ابتدائی چند صدیوں میں ہر جگہ سرخرو کیا اور انہیں سرفرازی عطا کی کیونکہ وہ قرآن کے حامل اور عامل تھے، اس پر عمل کی برکت سے وہ دین و دنیا کی سعادتوں سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن مسلمانوں نے جب سے قرآن کے احکام و قوانین پر عمل کرنے کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا، تب ہی سے ان پر ذلت و رسوائی کا عذاب مسلط ہے۔ کاش! مسلمان دوبارہ قرآن کریم سے اپنا رشتہ جوڑیں تاکہ ان کی عظمت رفتہ بحال ہو سکے۔

رشک

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا جائز ہے : ایک وہ آدمی جسے اللہ نے قرآن عطا کیا (اسے حفظ کرنے کی توفیق دی) چنانچہ وہ اس کے ساتھ رات اور دن کی گھڑیوں میں قیام کرتا ہے (اللہ کی عبادت کرتا ہے) اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے مال و دولت سے نوازا، وہ اسے (اللہ کی راہ میں) رات اور دن کی گھڑیوں میں خرچ کرتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

سکون

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص سورۃ کہف پڑھ رہا تھا، اس کے پاس ہی ایک گھوڑا اور سیبوں سے بندھا ہوا تھا۔ اس شخص کو ایک بادل نے ڈھانپ لیا، وہ بادل اس کے قریب ہوتا تھا اور اس کا گھوڑا بادل کو دیکھ کر اچھلنے کودنے لگتا۔ جب صبح ہوئی تو وہ آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے اس واقعے کا ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ سکینت تھی جو قرآن کی وجہ سے (مجھ پر) نازل ہوئی (اللہ کی خاص رحمت تیرے اطمینان قلب کے لیے نازل ہوئی)۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

اس میں ایک تو سورۃ کہف کی فضیلت اور دوسرے، نیک بندوں پر اللہ کی خصوصی رحمت و سکینت کے نزول کا بیان ہے جس سے ان کے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

تلاوت قرآن پر اس طرح بادل کی ظاہری صورت میں سکینت کا نزول ایک خرق عادت واقعہ (کرامت) ہے جس میں کسی نیک بندے کے اپنے اختیار کا دخل نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی مشیت پر منحصر ہے۔ اسی لیے یہ اصول مسلمہ ہے کہ معجزے یا کرامت سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوتا، نہ اس سے اس قسم کا کوئی استدلال کرنا ہی جائز ہے، جیسے اہل بدعت کرتے ہیں اور سادہ لوح عوام کے عقیدوں کو خراب کرتے ہیں۔

نیکی

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جس شخص نے اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کا ایک حرف پڑھا، اس کے لیے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اَلَمْ ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔“ (یہ تین حرفوں سے مرکب ہے اور دس ضرب تین، یعنی 30 نیکیاں پڑھنے والے کو ملیں گی۔)

(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: اس کی سند حسن صحیح ہے۔) فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر قرآن کا ملبہ نہیں سمجھتا لیکن تلاوت کرتا ہے تو ایسا شخص بھی ثواب سے محروم نہیں رہے گا۔ اور جو شخص تلاوت بھی نہیں کر سکتا اسے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے۔

ویران گھر

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بے شک وہ شخص جس کے دل میں قرآن کا کچھ حصہ (یاد) نہ ہو، ویران گھر کی طرح ہے۔“ (اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: اس کی سند حسن صحیح ہے۔)

بلندی درجات

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”(روز قیامت) صاحب قرآن (قرآن پڑھنے اور اسے حفظ کرنے والے) سے کہا جائے گا، قرآن پڑھتا جا اور (درجے) چڑھتا جا اور اس طرح آہستہ آہستہ تلاوت کر جیسے تو دنیا میں تریل سے پڑھتا تھا، چنانچہ تیرا مقام لوہ ہوگا جہاں تیری آخری

تلاوت ختم ہوگی۔“

(اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔) فوائد و مسائل:

1۔ اس میں قرآن کریم کے حافظ اور کثرت تلاوت اور اس کے احکام پر عمل کرنے والوں کی امتیازات کا ذکر ہے۔
2۔ چڑھنے سے مراد جنت کے درجوں پر نہ چڑھنا ہے۔ یعنی جتنا قرآن یاد ہوگا اسی حساب سے وہ تریل سے پڑھتا جائے گا اور جنت کے درجات پر فائز ہوتا چلا جائے گا۔
3۔ اس میں قرآن کی تلاوت اور اس کے حفظ کرنے کی ترغیب ہے تاکہ وہ جنت میں حفظ قرآن کی بدولت زیادہ سے زیادہ بلند درجات حاصل کر سکے۔

قرآن کریم یاد رکھنا

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اس قرآن کی حفاظت (دیکھ بھال) کرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! یہ (قرآن سینوں سے) نکل جانے میں اس اونٹ سے زیادہ تیز ہے جو رسی میں بندھا ہوا ہو (اور اسے کھول کر بھاگ نکلنے والا ہو)۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: قرآن کریم کی حفاظت اور دیکھ بھال کا مطلب ہے کہ پابندی سے اس کی تلاوت کی جائے، ورنہ غفلت کی صورت میں انسان اسے اتنی تیزی سے بھولتا ہے کہ اتنی تیزی سے اونٹ بھی رسی تڑا کے نہیں بھاگتا۔ یہ تیزی سے بھول جانے میں تشبیہ ہے۔

حافظ قرآن

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حافظ قرآن کی مثال رسی سے بندھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے۔ اگر وہ اس اونٹ کا خیال رکھتا ہے تو وہ (اپنے کھونٹے

سے) بندھا رہتا ہے اور اگر اسے کھول دے گا تو چلا جائے گا۔“ (بخاری و مسلم) فوائد و مسائل:

اس میں بھی وہی مذکورہ بات بیان کی گئی ہے۔ صاحب قرآن سے مراد، قرآن کا حافظ ہے، مکمل حافظ ہو یا کچھ آیات کا حافظ، جتنا بھی یاد ہو اسے پڑھتا رہے گا تو یاد رہے گا، جیسے اونٹ پر کڑی نظر رکھی جائے تو وہ بندھا رہتا ہے اور اگر اسے کھول دیا جائے تو ایسا بھاگتا ہے کہ اسے تلاش کرنا اور پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس میں ان والدین کے لیے بھی سبق ہے جو بچوں کو حفظ کروا کر قرآن کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے، اسی طرح منزل یاد کیے بغیر جلدی حفظ کرنے والے حضرات کے لیے بھی تنبیہ ہے۔

اچھی قرأت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

”اللہ تعالیٰ کسی چیز کے لیے اس طرح کان نہیں لگاتا جس طرح وہ اس خوش آواز پیغمبر کے لیے کان لگاتا ہے جو قرآن کو غنا کے ساتھ اونچی آواز سے پڑھتا ہے۔“ (بخاری و مسلم) فوائد و مسائل:

1۔ اللہ تعالیٰ کان لگا کر توجہ سے سنتا ہے، یہ جہاں ایک طرف اس کی رضا اور قبولیت کی دلیل ہے، وہاں دوسری طرف اس کی ایک صفت (کان) اور اس سے سننے کا بیان ہے جس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ تاہم ہم اس کی کیفیت بیان کر سکتے ہیں نہ اسے کسی کے ساتھ تشبیہ ہی دے سکتے ہیں۔

2۔ غنا کے ساتھ پڑھنے کا مطلب گانے کی طرح تکلف اور تصنع سے بڑھنا نہیں ہے، جیسے آج کل کے بہت سے قاری مانتھو ص مصر کے بعض قراء پڑھتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب تجوید و حسن صوت کے

ساتھ ایسے سوز سے پڑھنا ہے جس سے رقت طاری ہو۔

3۔ اس میں خوش آوازی اور سوز سے قرآن پڑھنے کی ترغیب ہے، تاہم یہ ضروری ہے کہ حرفوں کی ادائیگی اس طرح ہو کہ اس میں کمی یا بیشی نہ ہو۔

تعریف

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”تمہیں حضرت داؤد کے سروں میں سے ایک سر (خوش آوازی) دی گئی ہے۔“ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ”اگر تم مجھے دیکھ لیتے جب کہ گزشتہ رات میں تمہاری قرأت سن رہا تھا (تو یقیناً تم خوش ہوتے۔“)

فوائد و مسائل: حسن صوت اللہ کا ایک انعام ہے جس کو چاہے وہ اس سے نواز دے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں یہ نعمت ملی اور وہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو اللہ کا کلام سنا کر اللہ کی دین کی طرف بلا تے ہیں۔ خوش آوازی کو دنیا کمانے کے لیے بے حیائی پھیلانے کا ذریعہ نہیں بناتے، جس کا انجام نہایت برا ہے۔

خوش آواز

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

”کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی نماز میں سورت والہین والزیتون پڑھتے ہوئے سنا، چنانچہ میں نے آپ سے زیادہ اچھی آواز والا کوئی نہیں سنا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں صراحت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح دیگر تمام خوبیاں عطا کی گئی تھیں، حسن صوت سے بھی آپ کو نوازا گیا تھا اور دعوت و تبلیغ میں اس کی آپ کو ضرورت بھی تھی۔

غنا کے ساتھ پڑھنا

حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو قرآن کو غنا کے ساتھ نہ پڑھے، وہ ہم میں سے نہیں۔“ (اسے ابو داؤد نے جید سند سے روایت کیا ہے۔)

غنا کے ساتھ پڑھنے کے معنی ہیں: وہ خوش آوازی کے ساتھ قرآن پڑھتا ہے۔ فائدہ: ہم سے نہیں، کا مطلب ہے ہمارے طریقے اور سنت پر نہیں ہے۔ اس میں بھی خوش آوازی اور سوز و رقت سے قرآن پڑھنے کی ترغیب ہے، کیونکہ اس سے قرآن کے حسن اور تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔

قرآن سننا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ”(اے ابن مسعود!) مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔“

تو میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میں آپ کو پڑھ کر سناؤں حالانکہ آپ پر تو وہ اتر رہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”میں اپنے علاوہ کسی اور سے سننا پسند کرتا ہوں۔“

چنانچہ میں نے آپ کے سامنے سورۃ نساء کی تلاوت کی، یہاں تک کہ میں اس آیت تک پہنچ گیا: **كَلَيْفَ اِذَا جِئْنَا**

”چنانچہ اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان سب پر اے پیغمبر اچھے گواہ بنائیں گے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اب تم بس کرو۔“ جب میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (بخاری و مسلم)

آپ کے خط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ کی عافیت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعا میں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ دنیا اور آخرت کی ہر نعمت سے نوازے، آمین۔ پہلا خط تبسم بشیر شاہ سوارڈنگ کا ہے لکھتی ہیں

آپ نے میری بہن بے چاری کی امیدوں پر شب و روز اپنی ذال دیا۔ آپ صرف دیرینہ قارئین کے ہی خط شامل کرتے ہیں؟ شعاع کا سرورق اس دفعہ پسند نہیں آیا۔ ”ثریا کی گڑیا“ سب سے پہلے پڑھا۔ تعریف کی ضرورت تو نہیں کیونکہ سب کو پتہ ہے کہ سائرہ لا جواب لکھتی ہیں ناولٹ بھی پیارا لکھا۔ (ویسے یہ ایمل رضا کہاں غائب ہیں؟) اس کے بعد اپنی فیورٹ

کہانی (خواب شیشے کا) عفت آپنی لا جواب لکھ رہی ہیں۔ ”شہرِ زاد“ بھی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ”شب تاب“ مکمل ہونے پر تبصرہ جبکہ (حال دل) پسند نہیں آیا۔ افسانوں میں سب سے پہلے ریحانہ آفتاب لو پڑھا کیونکہ یہ ہماری فیورٹ ہیں اور (گلدھ) افسانہ بھی فیورٹ ٹھہرا۔ بہار آئی اور دم بھی لا جواب تھے۔ اپنا نام نہ پا کر دکھ بھی ہوتا ہے اور دوستوں میں مذاق کا نشانہ بھی بننا پڑتا ہے کہ (تم نے تو خط بھیجا تھا نا)؟

پیاری تبسم! آپ کی بہن کا خط وہ بھی غصے اور ناراضی والا بہت تاخیر سے ملا تھا۔ اس لیے شائع نہ ہو سکا۔ مگر وہ ناراض نہ ہوں۔ ان شاء اللہ ان کی فہم مائشیں پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

ایک ضروری بات نوٹ کر لیں۔ آئندہ جب خط لکھیں تو اپنی دوستوں کو ہرگز نہ بتائیں۔ جب خط شائع ہو جائے تو تب بتائیں۔ ایمل رضا کا ناولٹ اس ماہ شامل ہے۔

کوثر خالد نے جڑا نوالہ سے لکھا ہے عزیزو! میں نے نام بدل دیا ہے یعنی کہ ماضی کی کوثر خالد اب سودائے محمد سردار ہے۔ آئندہ مجھے سودائے محمد



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

سردار کے نام سے بلایا جائے۔

پیاری کوثر! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند اور خوش و خرم رکھے۔ جس نام سے بھی لکھیں ہماری محفل کی رونق ہیں اور ہم ہی نہیں ہمارے قارئین بھی آپ کو عزیز رکھتے ہیں۔

اریہ نور، حبہ نور اور سادیہ نور فیصل آباد سے شریک محفل ہیں انٹرنیٹ کے اس تیز ترین دور میں یوں خط لکھنا عجیب سا لگتا ہے پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اچھا بھی بہت لگتا ہے کہ کسی کے لیے وقت نکالنا، بہت سے کاموں کو نظر انداز کرنا..... بار بار مکالموں کو ذہن میں ترتیب دینا اور پھر لکھنا۔

پر میں اس بار کوئی محبت نامہ نہیں لکھ رہی ہوں ہاں..... یہ تو سیدھا شکایت نامہ ہے۔ آپ کو ذرا بھی رحم نہ آیا پکڑ کر سارے کا سارا خط ایڈٹ کر دیا میرا.....؟؟

شعاع کے ساتھ ساتھ بھی میرے پسندیدہ سلسلوں میں سے ایک ہے۔ آپنی میں نے بھی شعاع کے ساتھ ساتھ لکھا ہے اور تجھ سے ناتا جوڑا بھی..... میں شادی شدہ نہیں ہوں پر میری ایک اسٹوڈنٹ کی مدر اس سلسلے میں لکھنا چاہتی ہیں۔ پہلے بات ہو جائے سلسلے وارنا بڑی تو ”شہرِ زاد“ تو پسندیدہ ترین بنتا جا رہا ہے۔ ”خواب شیشے کا“ بہت ست جا رہا ہے گویا جہاں سے شروع ہوا تھا وہیں پر ہے۔ ”سہری دھوپ“ تو بہت ہی فضول ہو گیا ہے، وہی روایتی سے سنتوں کے جھگڑے۔ جس ناول نے بہت ہی زیادہ متاثر کیا وہ ”شب تاب“ تھا۔ مہوش افتخار نے دل موہ لیا..... ”ثریا کی گڑیا“ بس ہیک ہی تھا۔



ہم نے والے چھوٹے بچوں پر یہ فارمولا آزمایا کچھ حد تک
یاب رہی۔

افراء! واہ بھی، آپ نے اپنے شاگردوں پر قرۃ
العین، الا فارمولا آزمایا اور کامیاب بھی رہیں۔ روایتی
انداز سے ہٹا کر پڑھانے کا یہ طریقہ ہمیں بھی اچھا لگا
تھا۔ زندگی میں کچھ نیا سیکھنے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اور
یاب وہی ثابت ہوتے ہیں جو وقت سے سیکھتے ہیں
اور آگے بڑھنے کا عمل جاری رکھتے ہیں۔

مہر و ہش بلوچ، پری و ہش بلوچ اور دل و ہش
بلوچ نے ضلع کو بلوچستان سے لکھا ہے
شعاع کے پہنچنے ہی پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور شہر
لہار دی طرف دوڑ لگائی۔ واہ صائمہ جی! آپ بہت اچھا
لکھتی ہیں۔ ہائے اللہ ہمارا بھی جی چاہتا ہے اڑ کر مری
جا میں، برف باری انجوائے کریں۔ ویسے مزے کی
بات کہ بلوچوں میں ہمارے قبیلے کا نام بھی مری ہے۔
ہمیں ہم زاد کا کردار بہت پسند ہے۔

سنہری دھوپ زبردست جا رہا ہے دعا نے احسن
تہ شادی کر لی ہمیں شاک لگا۔

”خواب شیشے کا“ کا بھی بڑی خوبصورتی سے
رواں دواں ہے۔ سمیرا حمید سے گزارش ہے عالیان،
امرد اور کارل کے ساتھ حاضر ہو جائیں، اگر ان کے
ساتھ نہیں آسکتیں تو پلیز عالیان جیسے کسی ہیرو کے ساتھ
آئیں۔

پچھرا ستر جیسے سمیرا حمید، سائرہ رضا، نمرہ احمد سے
انٹرایٹ ملنے کا شوق ہے ان شاء اللہ جنت میں پوری
ہوگی۔

ہم ایک خط بھی بھیج رہے ہیں جس میں بلوچوں
کے زہم و رواج اور بلوچی نام و رواج کیے ہیں جس سے

بلوچوں پر کہانی لکھنے کے لیے تھوڑی بہت مدد مل سکتی ہے
بانی کام مصنفہ خود جانتی ہیں اور آپ نے پچھلے سال کسی
قاری بہن کے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ شاید کنیر نیوی
بلوچوں پر کہانی لکھ سکیں۔ اور ہم آپ کو معروف ادبی تنظیم
”آئینہ“ کے بانی ملک فدا الرحمن کی کتاب ”بلوچستان،
میں اور حقیقت“ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ اس کتاب

آواز کے آر جے رمضان رفتی بھی اور آر جے دانش علی
قصوری کا انٹرویو اور بندھن شائع کر دیں۔

پیاری حمیرا! شعاع کی پسندیدگی کے لئے تمہارے
سے شکریہ۔ آپ کی فرمائشیں شاہین رشید تک پہنچا رہے
ہیں۔ آپ اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئیں۔ آئندہ خط
لکھیں تو اپنے شہر کا نام ضرور لکھیے گا۔

فتاحہ انصاری نے لکھا ہے
شعاع پڑھتے یہ پانچواں سال ہے۔ کہانیوں سے
انیت جنت کے پتے پڑھنے کے بعد ہوئی (کمال کا
ناول لکھا تھا نمرہ آپ نے)

اس کہانی سے بہت سے خوبصورت سبق سیکھے اور
ایک چیز جو سب سے خوب صورت اور قابل بیان ہے یہ
کہ میں نے حجاب کرنا شروع کیا۔ شکریہ نمرہ آپ نے

پیاری فتاحہ! ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے پڑچوں
میں جو تحریریں شائع کی جاتی ہیں ان میں ہم تفریح کے
ساتھ ساتھ اصلاح کا پہلو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ بہت
اچھی بات ہے کہ آپ نے کہانی کے مقصد کو سمجھا اور پردہ
کرنا شروع کر دیا۔

کہانی آپ ہمیں اسی پتے پر بھیجوائیں جس پر خط
بھیجا ہے۔ شعاع 37۔ اردو بازار کراچی

اقرار ممتاز نے سرگودھا سے شرکت کی ہے کتنی ہے
عشا نور، آمنہ الیاس، عائشہ جہاں زیب سے

ملاقات بیٹ رہی۔ سب سے پہلے اپنا فوٹو ناول شہر زاد
پڑھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے ہم زاد ہادی ہے۔ منال مجھے
ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔ در شہوار کی حرکتیں بھی پسند نہیں۔

سنہری دھوپ اس دفعہ کی قسط بیٹ تھی۔ حال دل
کھل چکا صائمہ اقبال کی اچھی کاوش تھی۔

شب تاب کیا فٹاسٹک اسٹوری تھی مدول خوش
ہو گیا۔ ناول ٹریا کی گڑیا سائرہ رضا جب بھی لکھتی ہیں
کچھ منفرد ہی لکھتی ہیں۔

افسانہ بہار آئی، مشعل کی حرکتیں بننے پر مجبور
کر گئیں۔ قرۃ العین رائے کی اس کہانی میں مشعل کا بچوں
سے پوچھ کر پڑھانے کا انداز میں نے بھی اپنایا۔ ٹیوشن

سائرہ رضا ویارنگ نہیں جماسکیں جیسا ہمیشہ جاتی ہیں۔
”دم..... نفلوں کا ثواب..... گدھ“ افسانے بہت
اچھے تھے..... نفلوں کا ثواب تو بہت ہی دل کو بھایا.....
رہی ”کتاب کہانی“ تو اس کی تو بات ہی کیا ہے ایک
بہترین لکھاری کی بہترین کاوش میری بہن کی ”صنم
سعید“ کے انٹرویو کی فرمائش ہے۔

پیاری سادو! آپ شوق سے شکوہ شکایت کریں۔
ہم برا نہیں مانتے۔ شکوے شکایتیں ان ہی سے ہوتی ہیں
جن سے تعلق ہوتا ہے۔

خط ایڈٹ کرنا ہماری مجبوری ہے۔ آپ طویل خط
لکھتی ہیں تو ہم اسے پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اسے
سراہتے ہیں لیکن شائع نہیں کر سکتے کہ صفحات محدود
ہوتے ہیں اور دوسری قارئین کے خط بھی شامل کرنا
ہوتے ہیں۔

آئندہ کہانی لکھیں تو اپنا فون نمبر ضرور لکھیں۔ ہم
آپ کو میسج کے ذریعے کہانی کے بارے میں بتا دیں گے
کہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ اس طرح آپ زحمت
سے بچ جائیں گی۔

آپ کی کہانی ناقابل اشاعت ہے لیکن آپ میں
صلاحیت ہے کچھ اور لکھیں۔

حمیرا لطیف حور نے لکھا ہے
ٹائٹل پر سرسری سی نظر ڈالی پھر شہر زاد تو ای امکان

ہے کہ بادی ہی ہم زاد ہے۔ خواب شیشے کا بیٹ تھا۔ پتا
نہیں سمیرا اب مہر ماہ کو طلاق دیتا ہے یا نہیں۔ سنہری
دھوپ..... اہم تو جل جل کر مر جائے گی۔ شاید خیر.....!
کمل ناڈرا اچھے تھے۔ ٹریا کی گڑیا ٹھیک تھا۔ افسانے تو

سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ مسکرائیں اچھی
تھیں۔ کھٹا مٹی پہ کیوں فوزیہ شربت کا ذوق ہمیشہ سے
ہی بہت اچھا لگتا ہے۔ باتوں سے خوشبو آئے ہمیشہ کی
طرح بہت اچھا تھا۔ خطوط میں فوزیہ آپ کی غائب تھیں (وہ
کیوں.....؟) آئندہ سرسری سادیکھا۔ اور تاریخ کے
جھروکوں پر پہنچے (میرا موسٹ فیورٹ سلسلہ) رمیہ گل
آپ کا نام اچھا لگا۔ عشا نور سے ملاقات اچھی رہی۔
دستک بھی گڈ۔ نمرہ احمد اور ایف ایم 90 قصور آپ کی

میں بہت کچھ بلوچستان کے بارے میں پڑھنے کو ملے گا۔
ساتھ میں ہمارے ناموں کے معانی:

پری و ہش مطلب ”خوبصورت پری، مہر و ہش
”خوش اخلاق اور دل و ہش کا مطلب ”خوش دل“

خوب صورت، خوش اخلاق اور خوش دل پریوں!
معصوم سی خواہشوں کا معصوم سا خط اللہ کرے کوئی مصنفہ
پڑھ ہی لے۔ ہمارا خیال ہے اپنی پسندیدہ رائٹر سے دنیا
میں ہی ملنے کی کوشش کر لیں، جنت میں تو جنت کے
نظاروں سے فرصت کہاں ملے گی؟

اگر کوئی مصنفہ کہانی لکھنا چاہیں تو ہم آپ کا خط ان
تک پہنچا دیں گے۔ ملک فدا الرحمن کی کتاب کہاں سے
مل سکتی ہے؟

زرین فاطمہ نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں
میں نے 2017 کی مارچ کو آپ کو دو افسانے
بھیجوائے تھے۔ ”احساس“ اور ”اے وقت پلٹ آ“
تاحال اس کا کچھ پتا نہیں۔ پلیز کچھ تو نئے رائٹر کی حوصلہ
افزائی کریں۔ تاکہ خوشی خوشی اور بھی لکھ سکیں۔

پیاری فاطمہ! ہم تو ہمیشہ نئے مصنفین کی حوصلہ
افزائی کرتے ہیں۔ اور جس تحریر کی نوک ملک سنواری جا
سکتی ہے اسے ضرور جگہ دیتے ہیں۔ مگر بعض نئے لکھنے
والوں کو مزید محنت اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان
دو افسانوں کے لیے تو معذرت خواہ ہیں مگر محنت اور
مطالعہ جاری رکھیں۔ کوشش اور مسلسل کوشش ہی کامیابی
سے ہم کنار کرتی ہے۔

نامعلوم نے نامعلوم شہر سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں
ٹائل گرل بھی پوری بھی دے دیا کریں۔ ہمیشہ
صرف منہ ہی ہوتا ہے۔ سیرا! آپ اپنے اصلی نام سے
لکھتی ہو۔ مجھے سیرا حمید کے ناول یارم کی لاسٹ ایپی سوڈ
والا ڈائجسٹ چاہیے مارچ 2015 کا۔ ”خواب شیشے کا“

مجھے تو لگتا ہے موجد اور نمبر ایک ہی ہیں۔ موجد کی ڈیٹہ
ہو گئی ہوگی۔ اور نمبر کوثرہ اور فاران نے پالا ہوگا۔
”سنہری دھوپ“ امیزنگ ہے۔ شہر زاد کو شروع
میں جتنے مضبوط اعصاب کا دکھایا گیا تھا اتنی وہ ہے نہیں۔
”شب تاب کو اسٹوری آف دی ملٹھ کہوں تو غلط
نہیں ہوگا۔ ”بہار آئی“ مزے کا افسانہ تھا۔

باقی سارا رسالہ ایویس تھا۔
اور جو رسالوں میں خواتین ڈائجسٹ کے ناولز کی
لسٹ ہوتی ہے۔ اس میں جو قیمت اور ڈاک خرچ لکھا
ہوتا ہے اصل میں بھی اتنا ہی ہوتا ہے۔

پیاری دوست! اپنا نام اور پتا کیوں نہیں لکھا؟ اب
کیسے بتائیں کہ یارم کی آخری قسط والا ڈائجسٹ ملے گا یا
نہیں۔ آئندہ خط لکھیں تو اپنا نام اور فون نمبر لکھیں ہم
بتا دیں گے۔ ڈائجسٹ میں جو ڈاک خرچ اور قیمت لکھی
ہے وہی ہوتی ہے اور باقی رسالہ ایویس تھا؟ ایسی باتیں
نہ کریں کہ ہمارا دل بند ہو جائے۔ سیرا حمید اصلی نام سے
ہی لکھتی ہیں۔

افرا سعید راجڑ نے ڈی جی خان سے لکھا ہے
کاش میں کراچی میں ہوتی تو ضرور آپ کے
ادارے میں نوکری کرتی چاہے صفائی کا کام ہی کیوں نہ
ہو۔ اس بار شعاع 8 فردری کو ملا۔ سب سے پہلے
”خواب شیشے کا“ کا پڑھا۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے
ایک لمحے کو بھی بوریت محسوس نہیں ہوتی۔ ”شہر زاد“

از دا بیسٹ ناول ہم زاد تو ہادی ہی ہے۔ برہان صرف
انابہ کے ساتھ ہی اچھا لگتا ہے، منال کو نکالیں۔ سنہری
دھوپ کو پلیز جلدی ختم کر دیں ایسا نہ ہو ہم بور ہو کر پڑھنا
چھوڑ دیں۔ اس کے علاوہ نفسیاتی الجھنیں بھی میرا
موسٹ فیورٹ سلسلہ ہے۔ جب مشورہ دیتے ہیں بہت
اعلیٰ دیتے ہیں۔ میں اسکول میں ٹیچنگ کرتی ہوں وہاں

پرفہتہ والے دن ”بزم ادب“ ہوتا ہے تو ہم ان ہی
ڈائجسٹوں سے اچھی اچھی چیزیں اتار کے بچوں کو یاد
کرواتے ہیں۔ پرنسپل صاحب نے اس بزم ادب میں
تمام اسٹاف کے لیے تالیاں بجوائیں کہ وہ بچوں کو اچھی
تیاری کرواتی ہیں۔

پیاری اقراء! آپ کراچی نہیں آسکتیں تو کیا ہوا؟

ہم کبھی ڈی جی خان آئیں گے تو آپ سے ملنے ضرور
آئیں گے۔ آپ کے دل میں ہمارے لیے اتنی محبت
ہے یہ جان کر خود پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔

گڑیا راجپوت نے گاؤں کلر کھار چکوال سے لکھا ہے
شعاع ایک بہت ہی اچھا اور بہترین رسالہ ہے،
افسانے، مکمل ناول اور ناول تو خاص طور پر بہت
زبردست ہوتے ہیں خاص کر صائمہ اکرم کا شہر زاد بہت
ہی اچھا چل رہا ہے۔ اور مفت سحر طاہر جی آپ کو تو سلام
ہے بہت بہترین ناول ہے۔

پیاری لڑیا! اتنی دور سے ہمیں خط لکھا اور اتنا مختصر
تبرہ۔ آئندہ تھیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔
عابدہ انصاری ولہلہ ضلع فیصل آباد سے شریک محفل
ہیں لکھا ہے

میں یہ نہیں لکھوں گی کہ میں نے شعاع کب سے
پڑھنا شروع کیا ہے۔ آپ کو پتا چل جائے گا کہ کتنے
اولڈ ہیں۔ سب سے پہلے موسٹ فیورٹ عفت جی کا
”خواب شیشے“ کا پڑھا۔ پلیز عفت جی خواب شیشے کا
ہمیں نام کی طرح شیشے کا خواب سب مت دکھائیے گا
کہ جب آنکھ کھلے تو اس کی کرجیاں آنکھوں میں پیوست
ہو کر رہ جائیں۔ صائمہ جی کا شہر زاد مدتوں یاد رہ جانے
والی تحریر، ٹاپ آف دی لسٹ سنہری دھوپ کہانی اب
سینس ایل موڈ پر آگئی ہے۔

پیاری عابدہ! اولڈ از گولڈ لیکن سچ تو یہ ہے کہ آپ
ہمارے لیے سونے سے بھی قیمتی ہیں۔ محبتوں کا کوئی مول
نہیں ہوتا۔ ہماری نظر میں ہر انسان قابل احترام ہے۔
اور ہمارے قارئین خواہ وہ ہم سے مخاطب ہوں یا نہ ہوں
ہمارے دل میں رہتے ہیں۔ ہمارا ان کے ساتھ محبت کا
رشتہ ہے اور وہ ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

نوٹ: ہانیہ عمران، آمنہ رئیس گجرات سے
شریک محفل ہیں

ایک اپ ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ سے جی
نہ ہر دور ت ماڈل پیاری لگ رہی تھی کاش کہ یہ ہنر مجھے
آتا ہوتا۔

پہلی شعاع، شعاع کا پہلا درس، جو کہا سچ کہا۔
امی نے بھونا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ بغیر حقیقت
ہاں بات آگے بڑھادی جائے۔ حمد باری تعالیٰ
اور شریف پیارے نبی کی پیاری باتیں۔ ہمیشہ کی
ملن دل کو سکون پہنچاتی ہیں۔ صنم سعید کا بھی انٹرویو
ایں بھی۔

اب چلتے ہیں شعاع کی ہارٹ بے بی مطلب
اور ہار کی طرف، صائمہ جی نے تو در شہوار کی ساری
پیاری سواہ کردی۔ ہادی نے اک نظر کرم بھی نہ ڈالی۔
در شہوار کو کسی اور آرے لگا دیں۔ وہ کیا منیر نیازی کہتے
ہیں ناں چین پڑتا کیوں نہیں کیا دنیا میں ایک وہی شخص۔

ہم زاد کا لکھا چھپی کا رومانس بور کرنے لگا ہے۔
ہادی صاحب کی لکھی کو بھی منظر عام پر لائیں۔ دوسرا سلسلے
دار ناول ”خواب شیشے کا“ دی بیسٹ تحریر۔ موجد تو آغا جی
نے کواں گھنٹوں میں بیٹھ گیا۔

مال دل کھل چکا رشتوں کی اتنی ڈوریاں بھی مجھ
نے تو نہیں سمجھیں سر چکر گیا۔

مازہ جی کی ثریا کی گڑیا۔ بہت اچھا فیصلہ تھا۔ ثریا
لی کر ہاں ہی لکھی تھی پھر کیوں کسی ایسے شوہر کی محتاجی کرنی
ہو نہ لے کھاتا۔ افسانے سب ہی اچھے تھے گدھ اور
ہمارا آلی قابل تعریف لگا۔

قائدہ رابعہ اک عرصہ سے شعاع سے ناتا توڑے
ہوئے ہیں کیا وجہ ہے۔ نادیہ امین بھی پتا نہیں کہاں
مصروف ہیں۔ دل ان کی تحریر کا شدت سے منتظر ہے۔
تاریخ کے جھروکوں سے اکثر جو کبھی میں پڑھوں
رات خواب بھی ویسا دیکھتی ہوں کہ اس دور میں ہوں۔

”شعاع کے ساتھ“ کافی مہینوں کے بعد یہ سلسلہ
لگا۔ اچھا لگا۔ پڑھتے ہوئے بنت سحر یاد آ گئیں۔ گاؤں کی
منظر کشی اچھی کرتی ہیں۔ خوبصورت پنے تمام ٹوکے بازار
کی مہنگی کریموں سے اچھے اور سستے بھی ہوتے ہیں۔
اب تو ہر چینل ایسے پروگرام دکھا رہا ہے ”خط آپ کے“
میں پہلے تو آپ سے گلہ ہے کہ خط شامل نہیں کیا دو ماہ سے
میرا وجہ؟ دوسرا اس محفل کے ستارے کے جگمگا رہے تھے۔
خاص کر کوثر خالد کو بہت بہت مبارک ایک تو کتاب کی
خوشی دوسرا شمع کے رشتے کی۔

پیاری فوزیہ! یہ شعر میز نیازی کا نہیں جون ایلیا کا
ہے درست شعر یہ ہے۔

مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں گیا
اور صائمہ نہیں، در شہوار کو اس کی گھٹیا محبت خوار
کر داری ہے۔ محبت کا مطلب مسلط ہونا نہیں ہے۔
محبت تو اپنائیت، خلوص، ایثار اور دل داری کا نام ہے۔
اور دو ماہ سے آپ کے خط بہت تاخیر سے مل رہے ہیں
اس وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔ ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔

میر پور خاص سے حرا گل نے لکھا ہے
ردی کی نوکری کھا گئی خط کیسے کیسے
بہر حال انہیں شائع نہ ہونا تھا نہ ہوئے۔ میں

مبارک باد

شادی نے تین سال بعد شازیہ جمال طارق کے آگن میں خوشیاں اتریں اور وہ ماں کے رتبے سے سرفراز ہوئیں۔

ایک پیارے سے بیٹے ابراہیم نے ان کی زندگی کو رونق اور خوشی بخشی ہے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے شازیہ کو دلی مبارک اور نیک تمنا میں۔ اللہ تعالیٰ ابراہیم طارق کو صحت، زندگی،

اور خوش فاقی عطا فرمائے۔ (آمین)



لیے آجائیں۔ میرے دوستوں نے مجھے آڈیشن کا مشورہ دیا اور میں نے آڈیشن دے دیا۔ چونکہ یہ فیلڈ میری منتظر تھی۔ لہذا کامیاب ہو گیا اور بس پھر ہوتا ہی چلا گیا۔ پھر نی وی اور اسٹیج دونوں کے لیے راستے ہموار ہوتے چلے گئے۔“

”دادا، والد اور پھوپھا کا فن آپ کے اندر نہیں آیا کیا، ایسی چیزیں تو ورثے میں ملتی ہیں؟“

”جی..... میرے اندر بھی ہے یہ فن، مگر بہت کم۔ شاید توجہ نہیں دی میں نے۔ میں اسکیچنگ کرتا ہوں اور جودل میں ہوتا ہے اسے باہر لے آتا ہوں۔ قارئین کی معلومات کے لیے بتاؤں کہ میرے دادا اسکول آف آرٹ میں پڑھایا کرتے تھے۔ میرے والد ایک

ٹیکنیکل اسکول میں ڈرائنگ سکھاتے تھے اور میرے پھوپھا نیشنل کالج آف آرٹ کے پہلے مسلمان پرنسپل تھے۔ اپنے دادا کے بارے میں بتاؤں کہ وہ اپنے ناخن سے کانڈ پر جو تحریریں لکھتے تھے وہ ”امپوز“ ہو جایا کرتی تھیں۔ یہ ٹیلنٹ تو ہمارے خاندان میں کسی کے پاس نہیں تھا میں البتہ اسکیچنگ بھی کر لیتا ہوں اور ہارمونیم

”کامیابی کا راز؟“

”کوئی راز نہیں، اللہ کا کرم ہے۔ میں خوش رہتا ہوں، اپنے آپ کو مطمئن رکھتا ہوں۔ جھوٹ نہیں ہوتا، کسی کا حق نہیں مارتا، ہمیشہ پوزیٹور ہیں، کسی کا بُرا نہ چاہیں، بس اللہ آپ پر اپنا کرم رکھے گا۔“

”آپ نے بتایا کہ سولہ سترہ سال کی عمر سے آپ اس فیلڈ میں ہیں، تو کیا بچپن سے شوق و جنون تھا، آپ کو اس فیلڈ میں آنے کا؟“

”ارے نہیں..... میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں شوہز میں آؤں گا۔ خدا اپنے بند سے کار راقی نہ متعین کرتا ہے اور میرا رزق بھی اسی لیلہ سے وابستہ کیا۔ میں نے تو بس اسی فیلڈ میں آنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔“

”تو آپ کا کیا Alm تھا۔ والدین کی کیا خواہش تھی آپ کے لیے؟“

”میں نے تو بچپن میں جو خواب دیکھے تھے۔ وہ تو پورے ہوئے ہی نہیں..... مثلاً مجھے تو فوج میں جانے کا شوق تھا، لیکن جب میں ساتویں جماعت میں تھا تو میری آنکھیں کمزور ہو گئیں۔ لہذا فوج میں جانے کا خواب پورا نہ ہوا۔ پھر شوق ہوا کہ میڈیسن میں چلا جاؤں، ڈاکٹر بننے کا خیال آیا۔ بہت محنت بھی لی۔ مگر میٹرک میں نمبر کم آئے۔ لہذا میڈیکل میں داخلہ نہیں ملا۔ بس جو بننا چاہتا تھا۔ وہ بن نہیں آیا اور جو نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ بن گیا، یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔“

”تو پھر کیسے آئے اس فیلڈ میں؟“

”اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں فارغ اوقات میں عین اختر، اطہر شاہ خان، عمر شریف اور دیگر مزاحیہ ن کاروں کی پیروڈی کیا کرتا تھا تو میرے دوست بہت انجوائے کرتے تھے۔ ایک دن کالج کے نوٹس راپ ایک نوٹس لگا کہ ہمیں ڈراموں کے لیے لڑکوں کی ضرورت ہے۔ جنہیں دلچسپی ہو، وہ آڈیشنز کے

”بہت شکریہ..... یہ سب آپ کی اور ناظرین کی محبت ہے۔“

”آپ کی انفرادیت ہے کہ آپ مزاحیہ اور سنجیدہ ہر طرح کے کردار بہت مہارت سے کر لیتے ہیں..... آپ پر کسی کردار کی چھاپ نہیں، آپ کیا کہیں گے اپنے بارے میں؟“

”یہ اللہ کا کرم ہے کہ میں جو کردار کرتا ہوں ناظرین پسند کرتے ہیں، اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور یہ بھی اللہ کا کرم ہے کہ مجھ پر کسی کردار کی چھاپ نہیں۔ حالانکہ ”بلبلے“ میں ایک زمانے سے کر رہا ہوں۔“

”آپ نے کہا کہ ناظرین میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ کیا اتنے برس گزرنے کے بعد بھی آپ کو حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے؟“

”بالکل ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے کہ کافی زمانہ



وِراسٹائل فنکار

محمد اہلم سے ملاقات

شاہین رشید

ہو گیا اس فیلڈ میں۔ مگر ناظرین کا فیڈ بیک مجھے نیا حوصلہ دیتا ہے اور ناظرین کی داد اور تعریف میرے لیے کسی ایوارڈ اور اعزاز سے کم نہیں۔“

”آپ مانتے ہیں کہ اداکاری کی صلاحیت خدا داد ہوتی ہے۔“

”میں تو مانتا ہوں، کیوں کہ میں اس فیلڈ میں کسی کی سفارش سے نہیں آیا، بلکہ اپنے بل بوتے پر آیا ہوں۔ اللہ نے مجھے اداکاری کی خدا داد صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس نے مجھے عزت شہرت اور پیسے سے بھی نوازا ہے۔ میں اس فیلڈ میں تقریباً چالیس سال سے ہوں اور جب سولہ یا سترہ سال کا تھا تو اس فیلڈ میں آیا تھا۔“

میر فنکار وراسٹائل فنکار کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا سوائے چند کے اور ان چند میں محمود اسلم سرفہرست ہیں دھیمے لہجے میں بات کرنے والے فنکار محمود اسلم سب کے پسندیدہ آرٹسٹ ہیں۔ انٹرویو کرنے کی خواہش پوری تو ہوئی مگر تھوڑی ادھوری..... چلیں کوئی بات نہیں، کبھی مختصر انٹرویو بھی مکمل انٹرویو کا مزہ دیتے ہیں۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”الحمد للہ..... اللہ کا کرم ہے۔“

”خانی“ میں دیکھ رہے ہیں ہم سب، ”بلبلے“ میں ایک زمانے سے دیکھ رہے ہیں۔ کمال کی اداکاری کرتے ہیں آپ۔“

بھی بجا لیتا ہوں۔“

”اے معروف ڈراموں کے بارے میں بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ بہترین رول کون سا تھا؟“

”ایک سیریل کیا تھا ”دن“ کے نام سے۔ اس میں، میں نے ”سردار دلاور“ کا رول کیا تھا۔ اسے ایوب خاور نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ یہ میرا یادگار رول ہے۔ پھر ایک سیریل کیا تھا۔ ”جنجال پورہ“ یہ سیریل تو بہت زیادہ مقبول ہوا تھا اور اس میں جیسا کہ آپ کو بھی یاد ہوگا میں نے ایک خوبصورت سرکارول کیا تھا۔“

”سناتا تھا کہ آپ کی ٹیلی میں اس بات کو پسند نہیں کیا گیا تھا کہ آپ اس طرح کا رول کریں؟“

”ہاں..... کسی نے تعریف کی، کسی نے اعتراض کیا، ملا جلا رد عمل تھا۔ مگر فن کار کو تو ہر طرح کے رول کرنے پڑتے ہیں اور کرنے بھی چاہئیں۔ یہ ہی ایک فن کار کا ہنر ہے اور جہاں تک ڈراموں کی بات ہے تو کافی ڈرامے کر چکا ہوں۔ فہرست یہی ہے۔ مگر پھر بھی جو بہت مقبول ہوئے ان میں ”دن“ اور ”جنجال پورہ“ تو ہے اس کے علاوہ ”خدا میرا بھی“ ”ڈبل سواری“ ”اڑان“ ”لیڈیز پارک“ ”لیکن“ ”لنڈا بازار“ ”صدقے تمہارے“ ”عشق کی انتہا“ اور آج کل ”خانی“ بہت پسند کیا جا رہا ہے۔“

”خانی“ کے بارے میں بتائیں۔ آپ ایک سیاست دان کا رول کر رہے ہیں۔ ایک بارعب باپ..... کیا رول سانس مل رہا ہے۔؟“

”رول سانس بہت اچھا مل رہا ہے۔ ”خانی“ کی کہانی۔ آج کل کے ڈراموں سے بہت مختلف ہے۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے ”خانی“ میں کام کر کے۔“

”سیاست یہ بات ہو رہی ہے تو آپ کو ملک کی سیاست سے کوئی دلچسپی ہے؟“

”جس ملک کا حصہ ہیں ہم اور جو ملک ہمارا ہے، اس کی سیاست سے کافی لگاؤ ہے، لیکن مجھے سب لیڈروں نے بہت مایوس کیا ہے۔ سب خواب دکھانے والے لوگ ہیں۔ کہنے کو تعلیمی حد تک رجسٹریشن

ہے۔ مگر لگتے نہیں ہیں۔ اسمبلیوں میں ڈاکٹرز، انجینئرز، قانون دان، پی ایچ ڈی اور اسکالرز کو ہونا چاہیے جو کہ نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارے ملک کو جتنی ترقی کرنا چاہیے تھی، اتنی اس نے کی نہیں ہے۔“

”دیگر فن کاروں کی طرح دل چاہتا ہے کہ پڑوسی ملک سے آخر آئے؟“

”آئے بھی تو قبول نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ پہلے ہمیں اپنی چیزوں کو درست سمت میں لانا ہے۔ اب خدا خدا کر کے ہماری فلم انڈسٹری میں بہتری آئی ہے اور اچھی فلمیں بننے لگی ہیں اور جب ہمارے اپنے ملک میں اچھی فلمیں بننے لگیں گی تو ہمیں باہر جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ ہمارے فن کاروں کے ساتھ پڑوسی ملک میں کچھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔“

”ماشاء اللہ سے آپ چالیس برس سے اس انڈسٹری سے وابستہ ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ آپ کچھ نہیں گے اس بارے میں؟“

”آج اور کل میں بہت فرق آ گیا ہے۔ گزرے وقت میں صرف اور صرف کام پر توجہ ہوتی تھی۔ ریہرسل بہت ہوتی تھی، جب تک ڈائریکٹر مطمئن نہیں ہو جاتا تھا، کام شروع نہیں ہوتا تھا۔ پیسے کتنے ملیں گے، اس کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ کام پہ فوکس ہوتا تھا۔ اب سب کچھ اس کے برعکس ہے۔ اب کام پہ کم اور پیسوں پہ زیادہ فوکس ہوتا ہے۔ جو نیوز کے بھی بہت خخرے ہوتے ہیں۔ اب کوڈ زیادہ محنت بھی نہیں کرتا اب ڈراما غلط لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔“

”آپ کی پرفارمنس میں ورائٹی بہت ہو رہی ہے۔ مشاہدہ کرتے ہیں یا مطالعہ کرتے ہیں؟“

”بس یہ خدا داد صلاحیت ہے۔ اللہ کا مجھ خاص کرم ہے۔ میں بہت زیادہ مشاہدہ کرتا ہوں اپنے کردار کی ریہرسل ضرور کرتا ہوں اور اپنے رول مطالعہ کر کے سیکھتا بہت ہوں۔ مطلب جو رول ملتا۔

اس پر پھر روتو جیتا ہوں اور بہت محنت کرتا ہوں۔“

”مزاجا کیسے ہیں؟“

”میں مزاج کا بہت سادہ ہوں، نرم ہوں..... طبع آتا ہے، مگر کبھی کبھار..... اور بہت شدید آتا ہے۔ اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا اپنے لم ہی ہوتا ہے۔“

”اچھا..... لگتا تو نہیں کہ آپ کو غصہ آتا ہوگا؟“

”انسان ہوں..... ہر انسان کی طبیعت میں غصہ ہوتا ہے اور یہ سب کچھ بچرل ہے۔ بس مجھ سے جھوٹ اور غلط بیانی برداشت نہیں ہوتی۔“

”یہ احساس تو بہت ہوتا ہوگا کہ میں ایک ورائٹل اور پرفارمنس کار ہوں؟“

”ارے نہیں..... ایسا کبھی نہیں سمجھا اپنے آپ کو۔ طبیعت میں غرور بالکل نہیں۔ گھر سے بن۔ سنور کر یا ٹپ ٹاپ سے نہیں لگتا۔ سادہ لباس، سادی چپل، بلکہ گھر میں رف ٹف ہوتا ہوں تو اس حالت میں گھر سے باہر چلا جاتا ہوں۔ اللہ کے دیے پر شکر کرتا ہوں، غرور نہیں۔“

”ایک پرسنل سوال..... آپ نے دو شادیاں کی ہیں، اور کیوں؟“

”کیوں کی بات نہ کریں۔ ہاں میں نے دو شادیاں کی ہیں اور پہلی شادی چوبیس سال کی عمر میں ہوئی۔ لو میرج تھی۔ امبرین نام ہے اور امبرین میری فین تھی۔ میری ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے، ایک بیگم لاہور کی ہے اور ایک کا تعلق کراچی سے ہے۔“

”ہوں..... مسئلے مسائل تو ہوتے ہوں گے؟“

”وہ تو ہر گھر میں ہوتے ہیں اور ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ گاڑی کے دو پہیوں کو بیلنس کے ساتھ چلنا چاہیے۔ اپنی غلطی کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ سوری کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنا چاہیے اور میاں، بیوی کو ایک دوسرے کی ضرورت کا خیال رکھنا چاہیے۔“

”گھر کے کاموں میں بیگمات کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟“

”بالکل بٹاتا ہوں۔ کبھی کبھار کپڑے بھی

استری کر دیتا ہوں۔ ناشتا بھی بنا دیتا ہوں۔ بیگم کی طبیعت ناساز ہو تو گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتا دیتا ہوں اور دونوں بیگمات کی خواہشات و فرمائشوں کا بھی احترام کرتا ہوں۔“

”آپ کی کوئی دیرینہ خواہش؟“

”میں ایک عدد مرسیڈیز گاڑی لینا چاہتا ہوں۔ دیکھیں کب یہ خواہش پوری ہوتی ہے۔“

”زندگی سے کوئی شکوہ؟“

”نہیں، بالکل نہیں، بہت اچھی زندگی گزاری ہے اور گزار رہا ہوں۔ اللہ نے بہت کرم کیا ہوا ہے۔ بہت رحمتیں ہیں اس کی۔ میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔“

”لوگ کہتے ہیں اور دیکھا بھی ہے کہ اچھا خاصا بندہ شادی کے بعد بدل جاتا ہے۔ آپ بدلے؟“

”میرا نہیں خیال کہ میں بدلا ہوں۔ یہ بات تو خیر دوسرے ہی بتا سکتے ہیں۔ مگر اگر کوئی مجھ سے کہے کہ آپ بدل تو نہیں گئے تو میں تو یہ ہی کہوں گا کہ میں نہیں بدلا۔ پہلے کی طرح دوستوں سے ملتا ہوں۔ ان کے ساتھ گپ شپ لگاتا ہوں اور لائف کو انجوائے کرتا ہوں۔“

”اللہ نے بہت نوازا آپ کو، کبھی دل ڈرتا ہے کہ اللہ یہ نعمتیں واپس نہ لے لے؟“

”سب کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ وہ اگر واپس لے لیتا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ زندگی میں بہت نقصان اٹھائے۔ گھر میں ڈیکٹی ہوئی۔ راہ چلتے لوٹے گئے۔ پھر اللہ نے دوبارہ دے دیا۔ بس یہ اس کا کرم ہے۔ لیتا ہے تو دیتا بھی ہے اور دیتا ہے تو لے کر آزماتا بھی کرتا ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے محمود اسلم سے شکریہ کے ساتھ اجازت چاہی۔

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

2018

آزادی

قدم قدم سوئیں لڑکھوت کا خوف سا 1971 کے پس پھر میں لکھی

کئی ایک جنگی قیدی کی داستان

دقائی تجویز اور اکرام سہگل کے سلسلے کی ایک اور کڑی

سراب

جرم کا راستہ اختیار کرنے والے بھول جاتے ہیں کسان سے

اس راستے میں کوئی بھول بھی ہو سکتی ہے

ایم اے راحت کی ایک بہترین تخلیق

گودش دور

خوش حالی اور طاقت کا گھنٹا انسان کو مغرور اور غلام بناتا ہے

جاوید راہی کی سوشل کاوش

آرزوئے بھلا

محبت میں انسان فرشتہ بھی بن سکتا ہے اور سرے سے بے رنگ نظام بھی

مہبین شہباز کا خوب صورت اعزاز

تلاش رنگ رانی

محبت کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے ایک شخص کا سفر نامہ

سہید محمد اشرف کی ایک رومانوی تحریر

اپریل 2018 کا شمار آج ہی کر رہے ہیں

میری کوشش بھی یہی ہوتی ہے کہ عام لائف سے ہٹ کر کچھ کروں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرے کردار ذرا مختلف و منفرد ہوتے ہیں۔

”آج کل تمہاری مستقل رہائش امریکہ میں ہے۔ پاکستان آتی ہو تو کہاں ٹھہرتی ہو اور اپنے ٹکٹ پر آتی ہو؟“

”نہیں..... مجھے باقاعدہ بلایا جاتا ہے میں آتی ہوں۔ مجھے کام کی آفر ہوتی ہے، کردار کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ تو میں یہاں پاکستان آتی ہوں اور اپنی نانی کے گھر قیام کرتی ہوں۔ اور مکمل ہو جاتا ہے جب میرا کام تو واپس چلی جاتی ہوں۔“

”امریکہ سے آکر پاکستان کی کون سی بات تھوڑی بری لگتی ہے اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ تم نے

دستکہ دستکہ

شاپین دستکہ

یمنی زیدی

”کیا حال ہے یمنی؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”ذرا سی جاتی ہے صلہ۔“ میں بہت اچھی پرفارمنس ہے تمہاری تمہیں کیا ریسپانس مل رہا ہے؟

”الحمد للہ بہت اچھا ریسپانس مل رہا ہے۔“

”مشکل ہوئی؟“

”نہیں..... کوئی خاص نہیں..... حالانکہ رول کافی مشکل تھا۔ مگر مجھے مشکل رول ہی اچھے لگتے ہیں۔ اس لیے مجھے اس سیریل میں کام کر کے بہت مزہ آیا۔“

”عام رول جیسا رول ہے یا کچھ مختلف لگا؟“

”اب تک جتنے بھی کردار کئے، ان سب سے بہت مختلف رول ہے۔ اس لیے مجھے کر کے اچھا لگا۔“

یہاں پاکستان میں کزارا ہے؟“

”پاکستان تو اپنا دل جگر سب کچھ ہے، پاکستان تو کبھی برا لگ ہی نہیں سکتا۔ بس یہاں کا نظام حکومت غلط ہے اور غلط کوئی اور نہیں، ہم خود ہیں جو یہاں کے قوانین کی پابندی نہیں کرتے۔ ہماری ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نہ وقت کی قدر کرتے ہیں نہ ہی وقت کی پابندی کرنے والوں کی۔ جو وقت کی پابندی کرتا ہے اسے عجیب عجیب سی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔“

”امریکہ میں کوئی جاب کرتی ہو یا مزے کرتی ہو؟“

”مزے بھی کرتی ہوں اور جاب بھی کرتی ہوں۔ امریکن ریڈیو چینل کے ایک شو ”سلام غمتے“ کی آر جے ہوں۔ اور بہت اچھا لگتا ہے اس پروگرام



”بہت آگے تک جانا ہے۔ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے جو فلم ”جاناں“ کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی..... میں نے اپنا گریجویشن مکمل کرنا ہے۔ مجھے فیشن شو کی بھی آفرز آرہی ہیں۔ ان شاء اللہ ریمپ پر بھی آؤں گی..... ریمپ پر ”برائیدل“ واک کی آفرز بھی ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ میں ریمپ پر ہر طرح کی ماڈلنگ کروں اور آپ کو دلچسپ بات بتاؤں کہ مجھے سوشل میڈیا پر شادی کی آفرز بھی آچکی ہیں۔ لیکن میں نے کوئی ریسپانس نہیں دیا۔ کیونکہ فی الحال میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”چلو..... جب اللہ کو منظور ہوگا ہو جائے گی۔ فی الحال تو شو بیز کی فیلڈ کو انجوائے کرو۔“



سورق کی شخصیت

ماڈل صائمہ انصار
میک اپ --- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی --- موسیٰ رضا

”ارانا سیریل“ پھر وہی محبت“ میں آپ کی ہمارے بہترین تھی۔ اسی کو دیکھ کر آپ سے رابطہ کیا۔“

”اچھا شکریہ.....“
”فیلڈ میں آنا محض اتفاق ہے یا شوق؟“
”بالکل اتفاق ہے..... اگرچہ مجھے اس فیلڈ سے دلچسپی تو بہت تھی مگر اس فیلڈ میں جانا کیسے ہے، مجھے نہیں معلوم تھا۔ بس میں تو ایسے ہی ویڈیوز بنا کر فیس بک پر وائرل کر دیا کرتی تھی۔ اور یہ ویڈیوز کسی فلم پروڈیوسر نے بھی دیکھ لیں اور مجھ سے رابطہ کیا..... اور مجھے اپنی فلم ”جاناں“ کے لیے بک کر لیا۔“

”اچھا کلا“
”جی میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے لیے راستے خود ہموار کر دے گا اور میں اتنی آسانی سے فیلڈ کا حصہ بن جاؤں گی۔“
”فلم کا کیا ریسپانس ملا..... سینئرز نے تعاون کیا؟“

”جی..... سینئرز نے بہت تعاون کیا۔ اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ فلم کا تجربہ اچھا رہا۔ فلم بھی کامیاب رہی۔ تو میں پہلے فلم اشار بنی اور پھر ٹی وی اشار بنی۔“
”فلم میں ہیروئن کی بہن کا رول کیا۔ اگر آئندہ بھی ایسے رول ملے تو؟“

”ارے نہیں..... وہ تو ابتدا تھی۔ اداکاری کا تجربہ بھی نہیں تھا..... مگر اب اگر آفر آئی تو یقیناً سیکنڈ ہیروئن کا رول نہیں لوں گی۔ بلکہ لیڈ رول لوں گی۔ اور میرا رول دیگر پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کو پسند آیا تب ہی تو مجھے مزید کرداروں کی آفر ہوئی۔“

”پھر وہی محبت“ میں آپ کا کردار بہت عمدہ تھا۔ اب اس فیلڈ میں کہاں تک جانے کا ارادہ ہے؟“

”کسی کا انتظار ہے یا آئیڈیل کی تلاش ہے؟“
”ایسا کچھ نہیں ہے۔ جب قسمت کچھ کام کروانا چاہتی ہے تو انسان کا دل و دماغ سب کچھ بدل جاتا ہے..... اور یہ بات اچھی لگتی ہے۔“
”سیٹ پر ایزی ہو کے جانی ہو یا ٹینشن ہوتی ہے؟“

”میں تو جب بھی سیٹ پر جاتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے آج میرا پہلا دن ہے۔ اور مجھے یہی لگتا ہے کہ پتا نہیں میں صحیح طرح پر فارم بھی کر پاؤں گی یا نہیں۔“

”ابھی تک خود اعتمادی نہیں آئی؟“
”ایسا نہیں ہے۔ خود اعتمادی تو ہے، مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے کہ کچھ غلط نہ ہو جائے۔“
”ابھی یہ حال ہے تو جب پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تھا تو کیا حال تھا؟“

”ارے، آپ حیران ہوں گی کہ اس وقت تو بالکل بھی نہیں گھبراتی تھی اور بہت اچھی طرح کام کیا تھا۔ اصل میں کیمرے سے نہیں گھبراتی بلکہ اس بات سے گھبراتی ہوں کہ کچھ غلط نہ ہو جائے۔“

”سب لوگ پڑوسی ملک کی فلموں میں کام کر رہے ہیں اور تم؟“
”آپ یقین کریں کہ مجھے اپنے ملک کی فلم انڈسٹری سے بھی اور پڑوسی ملک سے بھی آفرز آچکی ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ مجھے ایسی فلم میں کام کرنا چاہیے جو شعیب منصور جیسی ”بول“ جیسی فلمیں بنا میں ورنہ میں بولڈ کردار والی فلم میں کام نہیں کروں گی۔ مجھے چھوٹی اسکرین میں ہی رہ کر کم کم اچھا کام کرنا ہے۔“



”کیا حال ہے جی؟“
”ٹھیک..... آپ سنائیں۔“

”نہیں..... نہیں..... میں کوئی پلاننگ کے تحت نہیں آئی۔ جب کبھی پلاننگ کر کے کام کرنے کی کوشش کی۔ ناکام ہی ہوئی۔“
”پھر اچانک اس فیلڈ میں آئیں؟“

”جی..... اچانک ہی سمجھیں..... میٹرک کی طالبہ تھی تو عرفان وحید صاحب نے ایک ڈرامے میں ایک چھوٹا سا رول آفر کیا..... میں نے قبول کر لیا..... پر فارم بھی کر دیا..... اس کے بعد امین اقبال (ڈائریکٹر) نے آفر دے دی..... اور سلسلہ چل پڑا اور چل رہا ہے۔“

”اچھا لگا..... یا خواہش تھی؟“
”خواہش تھی جی وی اسکرین پر آنے کی۔ ڈرامے میں آنے کی نہیں۔ کیونکہ میں نے ”نیوز“ کے لیے اور ”نیوز سکر“ کے لیے آڈیشن دیے۔ کبھی اداکاری کے لیے نہیں دیا۔ اور اداکاری کی نہ صرف آفر آگئی بلکہ آڈیشن بھی نہیں ہوا۔ یوں اتفاق ہوتا ہے، لائف میں انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔“

”پلاننگ نہیں کرتیں، فیوچر کے بارے میں نہیں سوچیں تو پڑھائی کی پلاننگ کیسے کی؟“
”پڑھائی تو کرنی تھی۔ پلاننگ کے تحت نہیں کی۔ بلکہ شوق کے تحت کی ہے۔ اور مجھے چونکہ انیٹریر ڈیزائنر بننا تھا سو میں نے انیٹریر ڈیزائننگ میں ماسٹرز کر لیا۔“

”کام آئی؟“
”جواب نہیں کی..... لیکن کام تو آتی ہی رہتی ہے۔ اور جواب کی فی الحال ضرورت نہیں کہ اداکاری سے فرصت نہیں..... اور ریڈیو سے بھی فرصت نہیں۔“

”بیمنی! اب تم بڑی ہو گئی ہو..... ہے نا.....؟“
”جی کیا کروں رشتے تو آتے ہیں پر ابھی نصیب کھلا نہیں کہ میرا بھی فی الحال ارادہ نہیں ہے شادی کا۔“



ج: شادی سے پہلے گھر کے کام کاج سلائی کڑھائی اور گھر داری کے مشاغل تھے اسکول میں پڑھنے کا تو ہماری فیملی میں رواج ہی نہیں تھا سب لڑکیاں یہی کچھ کرتی تھیں۔

س: اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج: ہمارے قبیلے میں لڑکیوں سے پوچھنے کا رواج ہی نہیں تھا جہاں ماں باپ نے چاہا بیاہ دیا اس لیے سونی صد بزرگوں کا فیصلہ تھا میں تو ان کے نام سے بھی واقف نہیں تھی۔ شکل و صورت دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ مزے کی بات یہ کہ میرے والد نے بھی لڑکے کو نہیں دیکھا تھا پھپھو نے رشتہ کروایا تھا لڑکے کی عادات اور شکل و صورت کی تسلی کروائی تھی۔

س: ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا اور کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

جب تجھ سے نانا جوڑا ہے فیض بخش

ج: ذہن میں تھا کہ جیون ساتھی بے شک حسین شہزاد نہ ہو۔ لیکن قبول صورت ضرور ہو شریف اور نیک انسان ہو تعلیم کا خانہ تو اس کا بھی خالی تھا۔ نکاح کے وقت یہ دلچسپ صورت حال سامنے آئی مولانا نے پوچھا فیض بی بی تمہیں فیض بخش قبول ہے؟

اس اتفاق پر سب ہنس پڑے میں خود حیران رہ گئی۔ س: ممکن کتنا عرصہ رہی شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات ہوئی؟

ج: ہم دیہات میں رہتے تھے ہمارے گھر فون نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مگنی چھ ماہ رہی لیکن کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا اور نہ ہی اس وقت یہ رواج ہوتا تھا

اس سلسلے میں آپ نے اکثر شہر کی اور پڑوسی لکھی لڑکیوں کا احوال پڑھا ہے۔ آج ایک دیہات کی ان پڑھ خاتون کو پڑھیے۔ کشیدہ کاری والے کپڑے پہننے ایک خاتون ہمارے ہاں آتی ہے اس سے بطور غفل میں نے سوال کیے۔ اس نے یہ دلچسپ جواب دیے یہ ایک ان پڑھ سی دیہاتی لیکن عقل مند عورت کے جواب ہیں جو لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتی۔ اسے رسالے میں چھپنے وغیرہ کا بھی پتا نہیں۔ لیکن جواب دل چسپ ہیں۔

س: شادی کب ہوئی؟
ج: شادی 1982ء میں ہوئی۔
س: شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دل چسپیاں تھیں؟

صورت ہو دور نہ ایک مرتبہ کسی شادی کے موقع پر اپنی چھوٹی سالی کو دیکھ کر تو پریشان ہو گیا تھا کہ بیگم صاحبہ بہن جیسی نہ ہوں میری چھوٹی بہن چھوٹے قد کی عام سی صورت والی ہے۔

س: شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج: کوئی خاص تبدیلی تو نہ آئی لیکن لائین اور دیے سے واقفیت ہو گئی بغیر بجلی بکٹھے کے رہنا آ گیا ہاتھ والے بکٹھے کی عادت بنانی پڑی پہلے پہل آگ جلائی مصیبت لگتی تھی لیکن پھر عادی ہو گئے رہنا تو اسی گھر میں تھا چاہے فوس کے رہو یا رو کر وقت گزارو۔

س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟

ج: آپ حیران ہوں گے شادی کے تیسرے دن ہی سالن پکانے کا حکم ملا چونکہ رشتہ کروانے والی پھپھو نے میری خانہ داری اور سلیقے کی بہت تعریف کر رکھی تھی۔ کہا بہت تعریف سنی ہے پکاؤ دیکھیں کیا پکائی ہو۔

س: میکے اور سسرال کے کھانے کے ذائقے اور انداز مختلف محسوس ہوئے؟

بلکہ محبتوں سے غفلت پردہ کیا جاتا تھا۔ چونکہ والد صاحب نے انہیں نہیں دیکھا تو میری سہیلیاں مجھے ہمہ گیر تھیں۔ کبھی لنگڑا کر چلتیں۔ کبھی ایک آنکھ بند کر لیں اور کہیں کسی نے دیکھا تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لنگڑا ہوا کاٹا ہو نہیں خاموشی سے ان کے مذاق بکلی رہتی۔

س: شادی سے پہلے سسرال کے بارے میں کیا خیالات تھے؟

ج: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں اچھا سا تخمینہ میں آیا تھا کہ سسرانہائی شریف انسان ہیں ساس صاحبہ البتہ تیز مزاج ہیں۔ یہ سوچ لیا تھا کہ سسرال بھالوں کی بیچ نہیں ہوئی شوہر اچھا ہوگا تو گزارہ ہوا ہوا ہوا۔

س: شادی سے پہلے آپ کو تعلیم چھوڑنی پڑی یا لڑی اور قربانی دینا پڑی؟

ج: میں ان پڑھ بلکہ چنی ان پڑھ تھی تعلیم کی تو کوئی قربانی بھی ہی نہیں صرف یہ ہوا شہر سے دیہات میں شادی ہو گئی جہاں بجلی، گیس وغیرہ کی کوئی سہولت نہیں تھی۔ ذرائع آمد و رفت بھی ناپید تھے ریلوے اسٹیشن امارت گاؤں سے دو میل دور تھا ٹرین سے اتر کر ریل پیدل آنا پڑتا تھا یہ قربانیاں تھیں لائین اور دیا ہلایا۔ آگ پر روٹیاں اور سالن پکایا۔ دھویں نے لایا۔

س: شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسوں کے دوران لین دین کے معاملے میں کوئی بد مزگی ہوئی؟

ج: شادی بخیر و خوبی انجام پائی میرے والد نے ایک کنال زمین حق مہر میں لکھوائی میرے سر نے بخوشی لکھ دی۔ ہمارے سرائیکیوں میں اکثر وہ شادی کی شادیاں ہوتی ہیں میرا کوئی وہ نہیں تھا لہذا زمین خوشی سے لکھ دی۔

س: شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج: شوہر صاحب بولے تھے شکر ہے تم قبول

گل کھسار
فروز بنامی
قیمت - 400 روپے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
فون نمبر: 32735021
37، اردو بازار، کراچی

ساتھ گزارہ کیا ان کی سخت کڑوی کسلی باتیں برداشت کیں، کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا، ساس بھی پھر مٹھاس بنتی چلی گئی۔

س: بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی کا بہت بڑا امتحان ہے خصوصاً پہلا بچہ؟

ج: میرا پہلا بچہ تو ہمارے ہاں کی رسم کے مطابق میکے میں ہوا پہلا بیٹا بہت خوشگوار تجربہ تھا۔ سسرال والے ساس، سسر، خاوند سب سن کر دوڑے۔ چلے آئے خوب جھوم بھنگڑے ڈالے، مٹھائیاں تقسیم کیں لیکن میرے لیے میرا دوسرا بچہ مسئلہ بنا، کچھ پیچیدگی ہو گئی، میں تین دن درد سے تڑپتی رہی، دادا نے جواب دے دیا لیکن ظالم ساس اڑی رہی کہنے لگو ہمارے بچے تو انہی دانیوں کے ہاتھوں ہوتے ہیں، مہارانی انوکھی ہے آخراں اس ضد میں میرا بچہ پیٹ کے اندر مر گیا پھر مجھے اسپتال لایا گیا۔

س: آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے انفاذ کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند کرتی ہیں؟

ج: ویسے جوائنٹ فیملی سسٹم اچھا ہے اس فائدہ بھی بہت ہیں لیکن سسرال کے گھر مختلف گھرانوں آ لڑکیاں دیورائیاں جھانیاں بن جاتی ہیں۔ ہر ایک مزاج مختلف ہوتا ہے پھر آپس میں ٹھن جاتی ہے تر علیحدہ ہونا ٹھیک ہے۔

س: آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنا۔ کی کوشش کی کس حد تک کامیاب ہوئیں؟

ج: سسرال کے ماحول کو ختمی الامکان بہتر بنا۔ کی کوشش کی۔ بڑے جیٹھ ظالم قسم کے انسان تھے۔ بچہ کو مارتے بیٹتے، گالیاں دیتے انہیں عزت اور اس سے سمجھایا کچھ سدھ گئے۔ گالی گلوچ اور واہیات گفٹ سسرالیوں کا وطیرہ تھا۔ انہیں بھی راہ راست پر لانے کوشش کی کافی حد تک مثبت اثر ہوا اللہ کا لاکھ لاکھ ہے اس گندے ماحول میں رہ کر میرے میاں سب۔ ہٹ کر سویرا اور سلجھے تھے۔ جس مولانا سے قرآن کریم تعلیم حاصل کی ان کی صحبت کا اثر ہے۔

☆

ج: میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق تو تھا لیکن میری ساس صاحبہ کھانا مزے دار پکاتی تھیں۔ میری جھانی میری ساس کی نگاہ میں کھانا پکانے میں قیل بھی لیکن میں ان کی ٹکر کی بھی میرے کھانے کی تعریف ہوتی تھی۔

س: میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس ہوا؟

ج: ہمارے میکے کا ماحول انتہائی سلجھا ہوا تھا۔ ہم بہت سی بہنیں تھیں بھائی ایک تھا۔ اس لیے بیٹیوں والے گھر میں جس طرح شرافت اور تہذیب ہوتی ہے وہ بھی سسرال کا ماحول بہت کھلا ڈالا تھا بعض دفعہ بہت شرم آتی تھی۔ پردے داری کی باتیں بھی کھلے عام کر دی جاتیں شرم سے سر جھک جاتا دوائے مجبوری۔

س: سسرال میں کن باتوں پر تعریف اور کن باتوں پر تنقید کا سامنا کرنا پڑتا تھا؟

ج: کھانا پکانے، صفائی ستھرائی کی تعریف ہوتی تھی لیکن ساس صاحبہ صابن صابن کرنے روزانہ لباس دھونے وغیرہ پر اعتراض کرتی تھیں دیکھا جائے تو صاف ستھرا رہنے کے لیے صابن تو خرچ ہوتا ہی ہے۔

س: سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا سسرال میں گھریلو معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی؟

ج: جھانی ست اور کامل بھی سلیقے طریقے سے کوسوں دور تھیں۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مجھے سمجھ اور عقل عطا کی ہے اس لیے گھریلو معاملات میں مجھ سے مشورے ضرور کیے جاتے تھے کیونکہ میرے مشورے صائب ہوتے تھے۔

س: سسرال والوں سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج: سسرال تو سسرال ہوتا ہے ساس ماں نہیں بن سکتی لیکن میں نے اپنے جس تدبیر سے ان کے

www.bbokspk.site

صائمہ اکرم چوہدری



شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک بچی بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک انجین پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بیچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں مختتم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔ مختتم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے دہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں اتابیہ اور طوبی ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے



ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو ان کے دونوں بچے نمبرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمبرہ کو لگائی بھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبی اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے اور ہاتھ پائی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت اذیت ہوتی ہے۔

ان کا کلاس برہان سے ہوا چکا ہے، لیکن برہان کا سر دروہیا سے افسردہ کرتا ہے۔

ندرت بیگم نے شہزادہ شہریلی کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے ہان پھرا لے لے پھر میں تھیں۔ معروف بہرہ کریم سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزادہ نے اعلیٰ تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں ملتی تھی۔ ان کے آنے دن کے اسکیڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے ٹیوٹنٹی کی دھمکی دے کر شہزادہ کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزادہ کی آمد نے ندرت بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزادہ کی آنے پر ایک ہفتے کی فون کال نے اسے اسٹرب کر دیا۔ طوبی اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہو گئے، جہاں ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

ندرت بیگم علی کا بیٹا دہاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیہ نے گھر میں شدید توڑ پھولی اور ندرت بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزادہ سے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبی محمد ہادی کے بنگلے میں جاتے ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے



یہ جان کر کہ منامیل، ہادی کی بہن ہے در شہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ منامیل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے اتنا ہی مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار و درانی، شہر زاد کے پاس سمجھتے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سیفی کے فون سے مستعمل ہو کر ٹینا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے، اس بار پر ہادی اور شہر زاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کا نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبی کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبی کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا، ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے، وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

ہم زاد، شہر زاد کو اپنی فیملی کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارسل کی کوششوں سے روحیل کا دوست صارم خان، رومیہ کے حق میں گواہی دیتا ہے جس سے کیس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ منال کو یونیورسٹی میں برہان اور انا بیہ کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوتا ہے۔

”نہ کسے ممکن ہے بھلا؟“ اس نے دوبارہ کارڈ اٹھایا اور اپنی آنکھوں کو زبردستی مسل کر دیکھا۔

”برہان اور انابیہ“ اس کی آنکھوں کے آگے دھند کی چادر سی تن گئی۔ وہ دل پر جبر کر کے اس کارڈ پر لکھے اس کے باقی فیملی ممبرز کے نام دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے کئی آنسو ایک ساتھ بہہ نکلے۔

اتنے سالوں کی محبت کا ایک ایک لمحہ اس کا منہ چڑا رہا تھا، برہان کے کہے ہوئے ادھورے جملے، خوب صورت گفتگوں اور ان گنت یادوں کا ایک جہان تھا جو باری باری فلم کی صورت میں اس کے دماغ کی اسکرین پر چل رہا تھا اور اسے اذیت کے سمندر میں دھکیل رہا تھا۔

منائل نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ شادی کارڈ اپنے بیک میں ڈالا اور سائیڈ میز پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں اٹھایا اور ایک ہی ٹھونٹ میں پی گئی۔

اس کے وجود کے اندر ایک ان دیکھا لاؤجل اٹھا جس نے اسے باہر کے موسموں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

”انتہا ادھوکا..... اتنی بڑی غلط بیانی.....“ اس کا دل اس تلخ حقیقت کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔

ہیڈ آف دی ایوارڈ منٹ کے اسٹنٹ کو اپنی خرابی طبیعت کا ہتھکڑی کر جب وہ ڈیپارٹمنٹ سے نکلی تو اس کا سر حقیقتاً ہلکا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پورے کیسپس کو آگ لگا دے یا ایک دفعہ تو پوری زمین کو پلٹ کر رکھ دے۔

”س۔ س۔ س۔ ہادی کا سامنا کروں گی؟“ اس سوچ نے اس کے قدم سست کیے۔

”یہ ہانگوں کی طرح وہ مجھے سمجھا رہا تھا اور میں نے ہی اس کی بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی تھی۔“ اس نے جلدوری سے ہارہ کی ہانٹ سے اپنی آنکھوں کو گراوا، وہ یہاں پر کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ایک سانپ پر کھڑی ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

پانچ منٹ کے بعد وہ جب پارکنگ کی طرف جا رہی تھی تو خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ جیسے ہی وہ پارکنگ میں پہنچی، اس کی نظر اپنی اسٹوڈنٹس انا پیہ اور کرن پر پڑی۔ وہ دونوں چھوٹی سی منڈیر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

کرن کے ہاتھ میں پکڑا وہ سلور گرے کلر کا انٹیمیشن کارڈ منائل کو ایک دفعہ پھر اذیت میں مبتلا کر گیا۔ ان کے قریب پہنچتے ہی منائل کے قدم کچھ سست ہوئے۔

”السلام علیکم میم! کیسی ہیں آپ؟“ کرن نے بڑے بھرپور انداز سے اسے سلام کیا۔

”لائن۔“ منائل نے آنسوؤں کے گولے کو پورا زور لگا کر اندر کی طرف دھکیلا۔

”میم! ایک سر پرانز ہے، آپ کی اسٹوڈنٹ انابیه کی رخصتی ہے سر برہان کے ساتھ۔“ کرن کی بات پر منال ایک دم چوگی۔

”مہارک ہو انابیه!“ نظریں چرا کر وہ بمشکل بولی۔

”ٹھیکس میم!“ انابیه کے لہجے میں خوشی کی کھنک تھی۔

”کب ہوا تھا آپ کا نکاح؟“ اس نے دانستہ اپنا لہجہ لا پرواہ بنا کر اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔

”جب برہان ڈاکٹریٹ کے لیے انگلینڈ جا رہے تھے۔“

انابیه کے اس جملے پر منال کو لگا جیسے کسی نے مٹھی بھر سرخ مرچیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ اعتماد اور بھروسے کی بھاری بھر کم دیوار اس کے نازک وجود پر آن گری جو اس نے برہان کی محبت کے ارد گرد قائم کر رکھی تھی۔

”میم! آپ تو آئیں گی ناں؟“ کرن کا لب نہیں چل رہا تھا کہ وہ منال کا بازو پکڑ کر ابھی سے اسے شادی ہال میں پہنچا دے۔

”کو شش کروں گی۔“ منال بمشکل مسکرائی اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی اور اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ کو

انا بیہ نے واضح انداز میں محسوس کیا۔

منائل نے بمشکل گاڑی کو ریورس کر کے تیزی سے کیسپس سے نکالا، آنکھوں کے گرد تنی آنسوؤں کی چادر کی وجہ سے اسے سامنے کا راستہ دیکھنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ بار بار بازو کی پشت سے اپنی آنکھیں رگڑ رہی تھی، اور جب ضبط کرنا بس سے باہر ہو گیا تو اس نے گاڑی ایک سائیڈ پر کھڑی کی اور اسٹیرنگ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ڈیش بورڈ میں رکھے سیل فون پر آنے والی برہان کی کال نے اس کی اذیت میں مزید اضافہ کیا، اس نے غصے سے فون اٹھایا اور غصے سے اس کی کال کاٹ کر اپنا فون ہی — بند کر دیا۔

☆☆☆

موسم کافی حد تک بدل چکا تھا۔

درختوں پر کھلنے والے شکوفے، بہار کی آمد کا کھل کر اعلان کر رہے تھے لیکن شہر زاد کے سامنے بیٹھی ہوئی اس بچی کے چہرے پر خزاں کا راج تھا۔

سندس کی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور چہرے پر بے بسی، غربت اور لا چاری کے رنگ اتنے نمایاں تھے کہ شہر زاد کو مجبوراً اس کے پورے وجود سے نگاہ ہٹانی پڑی۔ اس کے دل پر گویا گھونسا ہی تو آن لگا تھا۔

”کیا نام بتایا تم نے؟“ شہر زاد نے دوبارہ تصدیق کرنے کے انداز میں پوچھا۔

”وہاج بخشم!“ سندس کے چہرے پر نفرت کا ایک جہان آباد ہوا۔

”تم لوگوں کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے؟“

”صندل کا لکھا ہوا آخری خط.....“ سندس نے ہاتھ میں پکڑا صفحہ احتیاط سے شہر زاد کی طرف بڑھایا، جو اس

نے جلدی سے تھام لیا۔

شہر زاد کی نظریں جوں جوں اس صفحے پر پھسل رہی تھیں، ویسے ویسے اس کے چہرے پر سنجیدگی کا تاثر بڑھتا جا رہا تھا۔ سندس آج وعدے کے مطابق شہر زاد کے کمرے میں موجود تھی اور تھوڑی بہت تفصیل تو شہر زاد پہلے ہی جان چکی تھی لیکن سیاق و سباق سے بیان کیا جانے والا یہ واقعہ میر فیملی کی پوری سیاست کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ رشیدہ مائی جوڑے میں کافی کامگ لیے شہر زاد کے کمرے میں آئی تھی، اپنی

چھوٹی بیٹی کو وہاں دیکھ کر خوف زدہ ہوئی۔

”رشیدہ! آپ نے اپنی بیٹی کے قاتلوں کو اتنی آسانی سے معاف کر دیا؟“

شہر زاد کے لہجے میں کچھ تھا، رشیدہ مائی کے ہاتھ میں ٹرے ہلکی سی لرزی اور اس نے گھبرا کر ٹرے میز پر رکھی

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”شیری بی بی، ہمارے اندر اتنا دم نہیں ہے کہ ان سے لڑ سکیں۔ اللہ ان سب کو غارت کرے۔“

”اس لیے تم نے سوچا کہ گھر بیٹھ کر بددعا میں دے کر اپنی بیٹی کا بدلہ لے لو گی۔“

”اللہ بہترین بدلہ لینے والا ہے بی بی! ہم بہت کمزور لوگ ہیں، اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔“ رشیدہ کی آنکھوں

سے صاف خوف چھلک رہا تھا۔

”اور قیامت والے دن اپنی بیٹی کو کیا جواب دو گی، کیسے سامنا کرو گی اس کا؟“ شہر زاد کے سنجیدہ انداز پر

رشیدہ کی آنکھوں سے آنسو چھلکے۔

”وہ جانتی ہے کہ اس کے والدین میں اتنی طاقت نہیں کہ ظالموں کا گریبان پکڑ سکیں۔“

”جانتی ہو رشیدہ، تم جیسے مظلوموں کا یہی رویہ، ظالموں کو مزید ظلم کرنے کے لیے اکساتا ہے، کیا تم یہ چاہتی ہو کہ

’ی اور لی بیٹی کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو تمہاری صندل کے ساتھ ہوا؟“ شہر زاد نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

”اللہ نہ لے جی، کوئی ماں اس قیامت سے گزرے، مجھے تو صندل کی سسکیاں آج بھی سکون سے سونے

نہیں آتیں، میری راتوں کی نیند حرام ہو چکی ہے۔“ رشیدہ مائی نے اس دفعہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

”ظلم کی نیند سونا چاہتی ہو تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔“

”آپ اماں اہا کو پھوڑیں، میں آپ کا ساتھ دوں گی، اس خبیث کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج کر ہی دم

لوں گی۔“ رشیدہ نے پہلے اس کی بیٹی سندس بے تابی سے گویا ہوئی تو شہر زاد نے جا بجا نکتے نگاہوں سے اس لڑکی کا

چہرہ لٹوھا، جس کے چہرے پر بدلہ لینے کی دھن سوار تھی۔

”ہو سکتا ہے ہمیں صندل کی ڈیڈ باڈی کا پوسٹ مارٹم کروانا پڑے، ہو سکتا ہے ہمیں اس کے لیے اس حد تک

عامانہ ہو جائیں کہ ہم وگمان میں بھی نہ ہو، لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں ہر مرحلے پر تم لوگوں کا ساتھ دوں

گی۔“ شہر زاد نے انہیں مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی۔

”میرے پاس سرکاری ہسپتال کی ڈاکٹرنی کی رپورٹ ہے، جو میں نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔“ رشیدہ نے

نظریں پرا کر کہا تو شہر زاد چونکی، جبکہ سندس نے شکایت آمیز نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھا، جو اتنا بڑا راز اپنے دل

میں چھپائے بیٹھی تھی۔

”کہاں ہے وہ رپورٹ؟“ وہ بے تابی سے گویا ہوئی۔

”میرے ٹرنک میں، میں آپ کو لا کر دیتی ہوں۔“

رشیدہ مائی دس منٹ کے بعد ایک خاکی لفافے کے ساتھ آئی تو اس میں موجود رپورٹس دیکھ کر شہر زاد

ایمے ت کا دم کا لگا، الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کے ساتھ موجود دو تین ٹیسٹوں کی رپورٹس میر فیملی کے تابوت

میں انٹری فیلین ٹھونکنے کے لیے کافی تھیں۔

ان دنوں سے فیمیلی بات چیت کرنے کے بعد شہر زاد، رومیصہ کے بیڈروم کی طرف آگئی، ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹا

۱۱ ارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہوئے ہیں

فوری صورت مرق

فوری صورت چھپائی

مضبوط جلد

آفیشل جیب

۱۲ فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل قیمت: 300/- روپے

۱۳ زرد موسم راحت جمیل قیمت: 1000/- روپے

۱۴ حساب دل رہنے دو نبیلہ عزیز قیمت: 400/- روپے

منکوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

پر مسکرا دی، دونوں بہنوں کے درمیان ایسا تعلق بہت سالوں بعد قائم ہوا تھا اور رومیہ اس کے لیے بہت زیادہ تری تھی۔

☆☆☆

در شہوار نے ماں کی طرف ایسے دیکھا، جیسے وہ پاگل ہو گئی ہوں۔
 ”کیا کہا آپ نے؟“ اسے لگا جیسے اس کی سماعتوں کو دھوکا ہوا ہو، اس نے بے یقینی سے اپنے سامنے بیٹھی تاجدار بیگم کو دیکھا، جو آج بطور خاص اس کے کمرے میں موجود تھیں۔
 ”کیوں، کانوں میں تیل ڈال رکھا ہے تم نے؟“ وہ ہلکا سا چڑ کر مزید گویا ہوئیں۔
 ”دودھ بتا چکی ہوں، تمہارے حاجی کا فیصلہ ہے کہ انا بیہ کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی ارسل کے ساتھ رخصتی دلی۔“

”حاجی تو واقعی ہی سٹھیا گئے ہیں ان سے کہیں کہ یہ ان کا اللہ اللہ کرنے کا ٹائم ہے، اوٹ پٹانگ فیصلے کرنے کا نہیں۔“ در شہوار نے بدتمیزی کی انتہا کر دی۔ تاجدار بیگم نے بوکھلا کر اس کے کمرے کا دروازہ بند کیا کہ کہیں بیٹی کی باغیانہ آواز باہر کسی کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔
 ”دماغ تو لگتا ہے تمہارا خراب ہو گیا ہے، اچھی طرح جانتی ہو، ہمارے ہاں صرف خاندان میں شادیوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔“ انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”ان فیصلوں کا اطلاق کیا صرف خاندان کی عورتوں پر ہی ہوتا ہے۔ خاقان چچا کی خفیہ شادیوں کی کتنی بھول گئیں آپ؟“ اس کی خود سری سے پہلی دفعہ تاجدار بیگم کو خوف آیا اور انہیں اپنے بیٹے برہان کا فیصلہ بالکل درست محسوس ہوا۔

”ان خفیہ شادیوں کا انجام بھول گئی ہو تم؟ کون جانتا ہے ان عورتوں کو، آج بھی خاقان کے حوالے سے صرف شارقہ اور ندرت کا نام ہی لیا جاتا ہے۔“ تاجدار بیگم نے اس خاندان کی سب سے لاڈلی اور ضدی لڑکی کو ہنچلا کر دیکھا۔

”مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں لیکن مجھے حاجی کا یہ فیصلہ بھی منظور نہیں۔ میں ابھی اور اسی وقت انہیں خود انکار کر کے آتی ہوں۔“ در شہوار فیصلہ کن انداز میں اٹھی اور تاجدار بیگم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا، انہوں نے گھما کر ایک زناتے دار پتھر در شہوار کے منہ پر دے مارا۔
 ”اب منہ سے ایک لفظ بھی نکالا تو زبان کاٹ کر رکھ دوں گی۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر مشتعل انداز سے اسے دھمکایا، در شہوار نے بے یقین نگاہوں سے اپنی ماں کا یہ روپ پہلی دفعہ دیکھا۔

”تم کس بھول میں ہو؟ اس گھر میں اگر تمہیں پلکوں پر بٹھایا جاتا ہے تو یہ مت سمجھنا کہ تم میں کوئی سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں، اس کے پیچھے تمہارے ماں باپ کی اتنے سالوں کی محنت اور ریاضت ہے، ورنہ تین بیٹوں کی ماں کو کس طرح تمہارے باپ نے پورے خاندان کے سامنے آسمان سے اٹھا کر زمین پر دے مارا تھا، یہ اقتدار اتنا پرانا نہیں۔“ تاجدار بیگم کا لہجہ سرد اور کاٹ دار تھا۔

در شہوار کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ابھی تو اس نے محبت کی پہلی اڑان بھری تھی اور اس کے پر کاٹ دینے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

تاجدار بیگم اسے ٹھیک ٹھاک سنا کر کمرے سے نکلیں تو وہ بھی تیر کی طرح برہان کے کمرے میں پہنچی، اب

کردہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی، رومی نے بڑی بھرتی سے بل فون اپنے کالوں سے ہٹا کر کال منقطع کی۔ وہ شاید نہیں یقیناً کسی سے بات کر رہی تھی، اس کے چہرے پر پہلنے والی اس بوکھلاہٹ کو شہزاد نے بطور خاص نوٹ لیا۔

”آؤ شیریں! ام کیسی ہیں اب؟“ رومیہ نے اپنے تاثرات کو بڑی جھڑی سے مار لیا۔
 ”پہلے سے کافی بہتر ہیں وہ اور مجھے لگتا ہے دو چار دن میں اپنا سیلون بھی جوائن کر لیں گی۔“
 ”دیش کریت! کافی منگواؤں تمہارے لیے۔“ رومیہ کے اس رویے پر وہ چوکی۔

”کم آن رومی! تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں تمہارے پاس مہمان آئی ہوں۔“ شہزاد نے کھوتی لگا ہوں سے اس کے ہاتھ میں پکڑا بل فون دیکھا، جس کی آواز ساکنٹ تھی لیکن اس پر ہلک کر لے والا لبرہ نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں رومیہ نے گھبرا کر بل فون کی طرف دیکھا اور جلدی سے فون ہی باور آف کر دیا۔
 وہ جانتی تھی کہ دوسری طرف موجود ارسل، اس کے اچانک کال بند کر دینے پر ٹھیک ٹھاک پریشان ہو چکا ہوگا، تبھی وہ بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور شہزاد نے دانستہ اس بات کو نظر انداز کیا۔ سیف الرحمن کی باتوں نے اس کا زوئیہ نگاہ بدل دیا تھا۔

”رومی! صارم خان تمہیں کہاں سے ملا؟“ اس کی طرف سے آنے والا یہ سوال خاصا غیر متوقع تھا، اس لیے وہ ہلکا سا بوکھلائی۔

”اس نے خود مجھ سے رابطہ کیا تھا۔“ رومیہ کی اطلاع پر اس نے استعجابیہ نگاہوں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔
 ”کیسے؟“

”کچھ دن پہلے اپنے گھر آیا تھا وہ۔“ اس نے نظریں جھپٹ کر جھوٹ بولا۔
 ”اچھا! تم نے مجھ سے تو اس کا ذکر نہیں کیا لیکن خیر، وہ یہ لیور تمہیں کیوں دینا چاہتا ہے؟“ شہزاد نے اسے جا چمتی نگاہوں سے دیکھا۔

”صارم کا کہنا ہے کہ میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، اس لیے وہ ہر حال میں سچائی کا ساتھ دے گا۔“
 ”دیکھو رومیہ! کوئی ایسی بات تو نہیں جو بعد میں ہمارے لیے مسئلہ کھڑا کر دے، بہتر ہوگا کہ تم اس اسٹیج پر مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش مت کرو۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا شیریں! ڈونٹ وری۔“ رومیہ نے سائیڈ میز پر رکھا چائے کا کپ اٹھایا اور گھونٹ بھرا اور اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کے تاثرات میں بڑا تغیر رونما ہوا اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر واش روم کی طرف بھاگی۔

”کیا ہوا رومی!“ شہزاد اس کے پیچھے لپکی۔
 ”کچھ دن سے معذہ بہت زیادہ گڑ بڑ کر رہا ہے، لگتا ہے تیز ابیت ہو رہی ہے مجھے۔“ وہ ٹڈھال انداز سے واش روم سے نکلی تو شہزاد نے تشویش بھری نگاہوں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔
 ”ڈونٹ بی سلی بار، تم ڈاکٹر انکل کو فون کرو یا پہلی فرصت میں ان کے کلینک کا وزٹ کرو، اپنی صحت کے معاملے میں ایسی لا پرواہی بالکل اچھی نہیں۔“

”کل جاؤں گی ڈاکٹر کے پاس۔“ رومیہ نے اسے صاف ٹالا۔
 ”اور یہ چائے کا کپ ایک سائیڈ پر رکھو، خبردار اپنا معذہ مزید چلا لے کی ضرورت نہیں۔“
 شہزاد نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ زبردستی ہٹا کر ایک ساکس پر رکھا تو وہ اس نے بہت بھرے انداز

اس کا آخری سہارا اس کا یہ ہی بھائی تھا۔ جس کی وہ آج کل لمبے لمبی قمی اور اسے بلیں تھا۔ وہ اس کا ساتھ ضرور دیں گے۔

دوسری طرف برہان، جب سے کیسے سے گمراہ ہے، منال کا لبر اکل لبر لے ان کی انگلیاں تھک گئی تھیں۔ منال کا سیل نمبر مسلسل آف جا رہا تھا اور جسے وہ گزر رہا تھا، برہان نے دل میں مختلف وہم سر اٹھا رہے تھے۔

”آخر کیا ہوا منال کو جو وہ مجھ سے ملے البتہ گھر چل گئی؟“ وہ اپنی کلاس لے رہا ہے اس کے آفس پہنچے تو بیون نے اطلاع دی کہ میڈم خراب طبیعت کی وجہ سے اپنی ساری کلاسز کیلکس کر لے گئے ہاٹل ہیں۔

اس اطلاع نے انہیں حیران کم اور پریشان زیادہ کیا، کیونکہ آٹری ولہ منال نے جب ان کی کلاس روم میں جھانکا تھا تو اس وقت اس کا چہرہ خاصا تر و تازہ اور فریش تھا، انہیں بہت زیادہ سونے کے بعد بھی ایسی کوئی بیماری یا کمزوری اس کے چہرے پر محسوس نہیں ہوئی۔

وہ اپنی سوچوں میں الجھ رہے تھے اور انہیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ درشہوار ان کے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر آ چکی تھی۔ برہان نے ایک لائق سی نگاہ اس پر ڈالی اور اس کے چہرے پر موجود سراسیمگی سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ تاجدار بیگم اس پر ارسل کے نام کا ہم پھوڑ چکی ہیں۔

”بھائی! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ ان کے سامنے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹختے ہوئے ہلکا سا جھجک کر گویا ہوئی۔

”اگر ارسل والا معاملہ ہے تو آئی ایم سوری، میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا، کیونکہ میرے خیال میں یہ ایک بہترین فیصلہ ہے۔“ انہوں نے اس کے بولنے سے پہلے ہی اسے ہری جھنڈی دکھائی۔ ویسے ہی انہیں درشہوار پر بے تحاشا غصہ تھا، جو ان کی آنکھوں میں دھول جھونکتی آئی تھی۔

درشہوار نے بوکھلا کر اپنے خاندان کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے شخص کو دیکھا، ان کے چہرے پر بھی وہی سختی، رعونت اور تکبر نظر آیا جو اس گھر کے زیادہ تر مردوں کے چہروں سے چھلکتا تھا۔ اپنے بھائی کا چہرہ اسے پہلی دفعہ اجنبی سا محسوس ہوا۔

”یہ میری زندگی ہے بھائی! اور مجھے اس بات کا اختیار ہونا چاہیے کہ میں اپنی پسند سے کوئی فیصلہ کر سکوں۔“ درشہوار نے اپنا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

”آج تک تم اپنے لیے ڈھنگ کے کپڑوں اور جوتوں کا انتخاب تو کر نہیں پائیں اور زندگی کا فیصلہ خود کرو گی۔ درشہوار کچھ تو عقل سے کام لو۔“ برہان کے استہزائیہ انداز پر وہ صدمے بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”ارسل میں کیا برائی ہے؟ وہ اس خاندان کا ویل ایجوکیٹڈ اور سینس ایبل لڑکا ہے اور اس کا ساتھ کسی بھی لڑکی کے لیے فخر بن سکتا ہے۔“ وہ رکھائی سے بولے۔

”بھائی! میں..... میں نے ارسل کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

”ہم اپنے خاندان کی لڑکیوں کو اس بات کی قطعاً اہازت نہیں دیتے کہ وہ کسی شرمیلی تعلق سے پہلے کسی بھی لڑکے کو اس نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں، ہم بھی اپنی حدود میں رہنا چاہتے ہیں۔“ برہان نے ایک دفعہ پھر اس کو

طبیعت صاف کی۔

”بھائی! آپ کسی بات پر غما ہیں مجھ سے۔“ درشہوار کے منہ سے نکلے والے اس سوال پر، برہان ہلکا سا جھنجھلائے۔

”میں کیوں غما ہوں گا تم سے اور جاؤ، مجھے اسٹوڈنٹس کی کچھ سائنس چیک کرنی ہیں۔“ انہوں نے بے رخی کی انتہا کر دی۔

درشہوار نے چند لمحے اپنے بھائی کے چہرے پر موجود بے رخی اور بے زاری کو چاہنے کی کوشش کی اور پھر اتنا لڑا ہر اکل آئی۔ سامنے سے ارسل گنگنا تا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے پورشن کی طرف جا رہا تھا، اسے دیکھ کر درشہوار کو کرنت سا لگا۔

”ایک منٹ ارسل! میری بات سنو پلیز۔“ وہ بھاگ کر سیڑھیاں چڑھی اور حیران پریشان ارسل کا ہاز و پاز لرا سے دوبارہ نیچے لان کی طرف لے آئی۔ وہ گھر میں آنے والے اس طوفان سے بالکل بے خبر تھا۔

☆☆☆

مونیکا، لاہور میں ذوالکفل کے ساتھ ایک نئی زندگی کی شروعات کر چکی تھی۔

وہ اس کے لیے اللہ کا بہترین تحفہ تھا۔ شادی کے بعد اس کے شوہر نے سب سے پہلے اس کے شناختی کارڈ پر نام تبدیل کر کے اس کا پاسپورٹ بنوایا تھا۔ ذوالکفل کا تعلق معاشی طور پر ایک مضبوط خاندان سے تھا۔

وہ لبرٹی میں اپنے ایک ذاتی فلیٹ میں رہتا تھا اور اس کے پاس اپنے استعمال کے لیے ایک بہترین گاڑی تھی، وہ مونیکا کو باتوں باتوں میں کئی دفعہ بتا چکا تھا کہ اس کے والدین لینڈ لارڈ ہیں لیکن مونیکا نے کبھی ان باتوں میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔

ان دونوں کے فائل ایگزام چل رہے تھے اور گھر سے آنے والی کالز سے اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ میکاٹل پاکستان آچکا ہے اور گھر میں اس کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور دوسری طرف جوزف نے اپنے مکان کے سلسلے میں پریشر ڈالنے والے لوگوں سے اپنی بیٹی کی شادی تک مہلت مانگ لی تھی۔ اس لیے وہاں بھی کافی سکون تھا۔

وہ یکن سمیٹ کر عشاء کی نماز پڑھ کر کمرے میں آئی تو ذوالکفل بیڈ پر لیٹا۔ کوئی کتاب پڑھنے میں مگن تھا، وہ اس کے برابر بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ سے بڑے پیار سے کتاب لے لی۔

”کیا بات ہے آج بہت لاڈ آ رہے ہیں؟“ وہ کتاب کا صفحہ پلٹتے ہوئے مسکرایا۔

”مجھے اپنے گھر والوں سے کب ملو امیں گے؟“ اس فرمائش پر وہ حیران ہوا۔

”خیریت؟ آج بیٹھے بیٹھے گھر والے کہاں سے یاد آ گئے۔“

”ہم اپنی اس شادی کو کب تک اپنے اپنے خاندانوں سے چھپا سکتے ہیں؟“ وہ کچھ فکر مند تھی۔

”جب تک ہم دونوں اپنے اللہ کے گھر سے حاضری دے کر واپس نہیں آ جاتے۔“ ذوالکفل کی اس بات پر وہ بے چینی سے اٹھ بیٹھی۔

”کیا ہم جارہے ہیں؟ اور کب.....؟“ ایک فطری خوشی نے اس کے سارے وجود کا احاطہ کیا۔

”ان شاء اللہ اسی ہفتے ویزا لگ کر آ جائے گا اور اس کے فوراً بعد ہم نکل جائیں گے۔“ اپنے شوہر کی اس بات پر اس کا دل تشکر کے گہرے احساس سے بھر گیا اور اسے بے اختیار ہی اپنے اللہ پر پیار آیا۔

اگلے دن وہ آخری پیپر دے کر گھر آئی تو مارتھا کی کال نے اسے تشویش میں مبتلا کیا، وہ اسے فوراً ملتان واپس آنے کا کہہ رہی تھیں۔

”میرے دو پیپر زابھی رہتے ہیں، میں اتنی جلدی نہیں آسکتی۔“ اس نے دل پر جبر کر کے جھوٹ بولا، تو دوسری طرف مارتھا کو مایوسی ہوئی۔

”تمہاری شادی کی ڈیٹ فکس کر دی گئی ہے۔“ اس اطلاع نے اسے پریشان کیا۔
”آپ کو اتنی جلدی کرنے کی کیا ضرورت تھی، مجھے سکون سے پیپر تو دینے دیں۔“ وہ ہلکا سا جھنجھلا گئی۔
”تمہارے پیپر زاس اتوار تک مکمل ہو جائیں گے اور تم فوراً واپس آ جانا۔ سچ میں پورے ایک ہفتے کا گیپ ہے۔“ مارتھا اپنا پورا حساب کتاب کر چکی تھی اور ویسے بھی یہ اس کے گھر کی پہلی شادی تھی اس لیے اس کے والدین کا پریشان ہونا بنتا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ مونیکا نے بے زاری سے کہہ کر فون بند کر دیا اور خود سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اسے اس وقت شدت سے احساس ہوا کہ اسے اپنے والدین کو اس شادی کا بتا دینا چاہیے کیونکہ اس کی شادی میں بہت کم دن رہ گئے تھے۔ اس کا سارا دن پریشانی میں گزرا۔

رات کو ذوالکفل بڑے پر جوش انداز میں گھر آیا اور اس نے اسے عمرے کا ویزا لگنے کی خوش خبری سنادی۔ جسے سن کر کئی سیکنڈ کے لیے اس کا منہ کھلا اور پھر بند ہونا بھول گیا۔ وہ اس کے اندرونی احساسات کا بہت اچھی طرح سے اندازہ کر سکتا تھا۔ مونیکا خاموش تھی لیکن اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے اور اس کا روال رواں اپنے رب کا شکر گزار تھا۔

ٹھیک پانچ دن بعد جب اسے اپنی شادی میں شرکت کرنے کے لیے ملتان جانا تھا، وہ اس وقت سعودیہ میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہی تھی اور مارتھا کے گھر میں ایک کھرام مچا ہوا تھا کیونکہ مونیکا کا ڈاک کے ذریعے بھیجا جانے والا خط اس کے گھر والوں کو مل چکا تھا جس میں اس نے اپنی شادی کا اعتراف کر کے نکاح نامے کی فوٹو کاپی اور ایک تصویر بھیجی تھی جس نے ان کے ہارے گھر پر ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ وہ شاید اس کی شادی کو قبول بھی کر لیتے لیکن ان کے نزدیک اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنا ایک ایسی غلطی تھی جسے وہ لوگ مرنے پر بھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

مری کے پہاڑوں پر جمی برف پر موسم بہار نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔
البتہ دھوپ گل کر نکلنے کی وجہ سے پہاڑیاں چمکنے لگی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے قدرت نے ہر طرف سفید رنگ کا چونا پھیر دیا ہو۔

ہادی اور سعد آفس سے ابھی ابھی گھر پہنچے تو مسز قریشی کی کال نے اسے بوکھلا دیا۔
”ہادی! تم فوراً گھر پہنچو، منائل کا شاید کسی دوست سے جھگڑا ہو گیا ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے آج رات وہی جا رہی ہے اور وہاں سے پرسوں فلائٹ ہے اس کی جدہ کی۔“

”لیکن ابھی تو اس کے ٹھیس کا کام باقی ہے، آپ نے پوچھا نہیں کہ کیا مسئلہ ہے۔“ وہ پریشان ہوا۔
”مجھے کچھ نہیں بتا رہی وہ، بہت زیادہ ڈپریشن کا شکار ہے، اللہ جانے کیا ہوا ہے۔ ہادی میرا تو دل سخت گھبرا رہا ہے اور تمہارے پاپا بھی سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں اسے۔“ مسز قریشی کا لہجہ پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ماما! پلیز ڈونٹ وری میں آ رہا ہوں۔“ اس نے سامنے رکھی کھانے کی ٹرے سے نظریں ہٹائیں اور اپنی گاڑی کی چابی اٹھائی۔ سعد نے پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے ناں؟“
”شاید معاملہ کچھ گڑبڑ ہے، ماما کی کال آئی ہے کہ منائل اپنا تک دبئی جا رہی ہے۔ اس لیے مجھے اسلام آباد جانا ہوگا۔“

”کوئی پریشانی کی بات ہے تو میں تمہارے ساتھ چلوں؟“ سعد بھی فوراً کھڑا ہوا۔
”تم کیا کرنے جاؤ گے؟“ وہ حیران ہوا۔

”ظاہر ہے رات کو تم واپس تو آؤ گے ناں، کل درکنگ ڈے ہے۔ اچھا ہے میں بھی اسلام آباد میں ایک دو کام بنالوں گا۔“

”چلو پھر کھانا بھی گھر جا کر ہی کھاتے ہیں۔“ ہادی اپنے ملازم کو ضروری ہدایات دے کر باہر نکلا۔
اس کی گاڑی جیسے ہی میر ہاؤس کے سامنے سے گزری، سامنے والے لان میں ارسل کے ساتھ بیٹھی درشہوار نے سر اٹھا کر بے تابی سے اس کی طرف دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہادی کو دیکھ کر اس کا دل بے اختیار دھڑکا۔ ہادی نے کوفت بھرے انداز میں گاڑی کی رفتار بڑھائی۔

وہ دونوں ایک گھنٹے بعد گھر پہنچے تو منائل کا بڑا بریف کیس اور ساتھ ایک ہینڈ کیمری ٹی وی لاؤنج میں رکھا ہوا تھا جبکہ مسز قریشی اور عبداللہ صاحب پریشانی کے عالم میں وہیں موجود تھے۔ ہادی کے دوست سعد کو دیکھ کر مسز قریشی نے خود پر ضبط کیا اور نہ وہ اسے دیکھتے ہی شروع ہو جاتیں۔

”کہاں ہے منو؟“ اس نے بھی لا پرواہی سے پوچھا۔
”اپنے روم میں۔“ جواب اس کے باپ کی طرف سے آیا۔

”سعد! تم ماما، پاپا کے پاس بیٹھو، میں ذرا اس سے مل کر آتا ہوں۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا منائل کے کمرے کے یاہر پہنچا، ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹا کر وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے منائل ڈرائیونگ کے سامنے کھڑی لپ اسٹک لگا رہی تھی، اسے دیکھ کر وہ دانستہ ہلکا سا رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”ہیلو ڈراما کوئن! یہ کیا چل رہا ہے گھر میں؟“
”پتا تھا مجھے، ممانی جان اب تمہیں ہی بلوائیں گی۔“ اس نے آئی شیڈ اٹھا کر اپنی آنکھوں کا میک اپ گہرا کرنے کی دانستہ کوشش کی۔

ہادی کو اس کے انداز میں غیر معمولی پن محسوس ہوا، وہ آہستہ سے اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ ڈرائیونگ ٹیبل کے شیشے میں منائل کا افسردہ چہرہ، متورم آنکھیں اور نڈھال وجود صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”آنکھوں کی سرخی اور اداسی کو دنیا کا کوئی میک اپ نہیں چھپا سکتا۔“ اس نے نرمی سے آئی شیڈ اس کے ہاتھ سے پکڑ کر دوبارہ ڈرائیونگ پر رکھا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ جا چلتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”کیا چھپا رہی ہو تم مجھ سے؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔“ منائل کا چہرہ زرد ہوا۔
”ادھر دیکھو میری طرف۔“ ہادی نے زبردستی کندھے سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

منائل کا خود پر لگایا ہوا ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا، وہ جذباتی انداز میں اس کا بازو پکڑ کر بچوں کی طرح سسکنے لگی۔ چند گھنٹوں میں وہ بالکل ٹوٹ چکی تھی، برہان نے اس کا سارا مان توڑ دیا تھا۔ وہ محبت جس کے بل بوتے پر وہ ساری دنیا کو فتح کرنے کے لیے نکلی تھی، وہی محبت ایک کونے میں کھڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

”منو! میری جان کیا ہوا ہے؟“ وہ ایک دم گھبرا گیا اور اسے اپنے ساتھ لگا کر نرمی سے تھکنے لگا۔ وہ کسی خوف زدہ بچی کی مانند اس کے چوڑے شانے سے چپلی ہوئی بے اختیار رو رہی تھی اور اس کے آنسو ہادی کی شرٹ کو بھگونے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں طرح طرح کے خدشات ابھار رہے تھے۔

”برہان نے کچھ کہا ہے تم سے؟“ اس نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا، اس بات پر اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہوا تو ہادی کو اپنے سارے اندیشے سچ ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”کیا کہا ہے اس نے تم سے؟“ اس کا دل بے ہنگم انداز میں دھڑکا۔ ”بتاؤ مجھے، ورنہ میں ابھی جا کر اس کا گریبان پکڑ لوں گا۔“

”اسے کچھ بھی مت کہنا، مجھے اس جیسے خود غرض اور جھوٹے انسان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ میرے لیے وہ صبح دس بج کر سولہ منٹ پر مر گیا تھا۔“

”اچھا تو اس کی تدفین کرنے جا رہی ہو دینی؟“ اس نے ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

”بس یہی سمجھ لو، تم سچ کہتے تھے وہ پورا خاندان ہی جھوٹوں کا ہے، لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں وہ لوگ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا۔“ وہ نرمی طرح سے ٹوٹ چکی تھی۔

”لیکن پتا بھی تو چلے کہ آخر اس کی اصلیت کیسے کھل کر تمہارے سامنے آئی؟“ وہ حیران ہوا۔

منائل نے اپنے ٹیک کی زپ کھول کر اندر سے ایک انویشن کارڈ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا وہ اسے کھولے بغیر بھی جان سکتا تھا کہ یہ کس کی شادی کا کارڈ ہے، اسے منائل کا دکھ اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہوا۔

”اتنے سالوں سے اس کا نکاح ہو چکا تھا اس کی کزن انا بیہ کے ساتھ اور اس نے یہ بات مجھ سے چھپائے رکھی۔“ وہ ایک دفعہ پھر رو دی۔

”تم نے اسے کچھ کہا نہیں؟ اس کا منہ نہیں توڑا جب اس نے یہ کارڈ تمہیں دیا۔“ ہادی کو ایک دم غصہ آیا۔

”اسے تو علم بھی نہیں کہ میں اس کی حقیقت جان چکی ہوں۔“ وہ آنکھوں میں پھیلا ہوا کا جل ثشو سے صاف کرنے لگی۔

”تمہیں در شہوار نے بتایا ہے کیا؟“

”نام مت لو اس لڑکی کا بھی میرے سامنے، وہ بھی اپنے بھائی کی طرح خود غرض اور دوغبر ہے۔ مجھ سے کئی دفعہ فون پر بات کی لیکن اس نے بھی اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا۔ یہ کارڈ تو شاید انا بیہ نے پوسٹ کیا ہے۔“

”انا بیہ..... یہ کون ہے.....؟“ وہ ہلکا سا چونکا۔

”برہان کی کزن، جو میری اسٹوڈنٹ بھی ہے اور اسی کے ساتھ نکاح ہوا ہے اس چپ انسان کا۔“ منائل شدید غصے اور صدمے کے عالم میں تھی۔

”ادھر بیٹھو اور اب تفصیل سے بتاؤ کہ کس نے تمہیں کیا بتایا ہے؟“

وہ خاموشی سے منائل کی داستان سنتا رہا، اس کے پاس بتانے کے لیے کچھ بہت زیادہ تفصیل نہیں تھی لیکن بات کے اس سفر میں اتنی بڑی بے ایمانی نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ مسلسل بیس منٹ ہلنے کے بعد چپ ہوئی تو خاصی بھڑاس نکال کے دل ہلکا کر چکی تھی۔

”منو! تم اس شخص کے لیے اپنا کیرئیر تباہ کرو گی جو اتنے سال تمہیں بے وقوف بناتا رہا۔“ ہادی نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنائیت سے پوچھا۔

”میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“ وہ بچکانہ انداز میں بسوری۔

”بے وقوف لڑکی! ایسے لوگوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونے میں ہی تو اصل لطف ہے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گی، اسی کیسپس میں رہ کر اس کا سامنا کرو گی۔ وہ خود تم سے نظریں چھپاتا پھرے گا کیونکہ دھوکا اس نے دیا ہے تم نے نہیں۔“

”یہ بہت مشکل ہے، میں نہیں کر پاؤں گی۔“ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”یہ کوئی مشکل نہیں ہے، تم اس کو روز آئینہ دکھاؤ گی، وہ روز مرے گا۔ تم سے چھپنے کے لیے اسے دنیا میں کوئی اوٹ نہیں ملے گی، اگر میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤ گی تو وہ تو مزے سے اپنی نئی زندگی میں گمن ہو جائے گا۔“ ہادی کی بات پر اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو ہادی! میں اسے ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی، لیکن ابھی مجھے جانے دو۔“ اس نے نظریں چرا میں تو وہ جھنجھلا گیا۔

”آخر کیوں؟ جو کام کل کرنا ہے وہ آج کیوں نہیں۔“

”اس کی شادی کا ہنگامہ جیسے ہی ختم ہوگا، میں واپس آ جاؤں گی۔ ابھی میں اتنی بہادر نہیں ہوئی ہوں، مجھے تھوڑا تاخیر دو پلیز۔“

ہادی نے کارڈ کھول کر شادی کی تاریخ دیکھی۔

”پھر وعدہ کرو مجھ سے، دس اپریل کو تم یہاں اپنے کمرے میں دوبارہ موجود ہو گی؟“

اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے وعدہ لیا تو منائل نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ویسے بھی کتھارس کے بعد وہ اب کافی مطمئن تھی اور اسی لیے جب وہ مسکراتی ہوئی باہر نکلی تو مسز قریشی کے ساتھ ساتھ عبداللہ صاحب نے بھی سکون کا سانس لیا۔ سامنے صوفے پر بیٹھے سعد نے چونک کر اس لڑکی کو دیکھا، اس کی آنکھیں رونے کے بعد خاصی گھبرائی تھیں، لیکن پورے وجود پر ایک محسوس کی جانے والی سوگواریت کا راج تھا۔

سعد کی نظریں بار بار منائل کیسے چہرے کا طواف کر رہی تھیں، یہ ان دونوں کی پہلی باضابطہ ملاقات تھی اور منائل نے اسے بالکل بھی مخاطب نہیں کیا تھا حالانکہ ہادی نے دونوں کا تعارف بھی کروایا تھا۔

”چلو بھی سعد! اس کو ایر پورٹ پھینک کر پھر ہم مری کے لیے نکلتے ہیں۔“ ہادی ہاتھ میں پکڑا چائے کا لپ میز پر رکھ کر کھڑا ہوا۔

”منو! جلدی واپس آنا ہے بیٹا، ورنہ ہمارا گھر ویران ہو جائے گا۔“ مسز قریشی نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

”ہادی کی شادی کریں ناں، کب تک خالی ہاتھ لٹکا تا پھرے گا۔“ اس نے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرنے

کی دانستہ کوشش کی۔
 ”اگلی بار تم دونوں کو ایک ساتھ ہی بنائیں گے۔“ عبداللہ صاحب نے محبت بھرے انداز میں کہا۔
 ”ایسی باتیں تو لازمی کریں آپ تاکہ وہ ڈر کر واپس آنے کا ارادہ ہی ملتوی کر دے۔“ ہادی نے اپنی گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا۔
 ”بے فکر ہو، تمہاری بہن ہوں، بزدل نہیں ہوں میں۔“ منائل نے خود کو سعد کی نظروں سے بچانے کے لیے اپنے بیک سے گلاسز نکال کر آنکھوں پر لگائے اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔
 وہ گھر سے نکلنے نکلنے سعد کا سارا سکون بھی ساتھ ہی چرا کر لے گئی تھی۔

☆☆☆

ارسل کو تو لگتا تھا کسی نے مسلسل چلنے کی بد عادی دی تھی۔
 پچھلے ایک گھنٹے سے وہ لگا تار اپنے ہی کمرے میں ٹہل رہا تھا، درشہوار نے جو صور اس کے کانوں میں پھونکا تھا، اس کی بازگشت سے ابھی بھی اسے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔
 ”ارسل! اب سوچ لو تم، کیا کرنا ہے۔“ درشہوار تازہ دم ہو کر دوبارہ اس کے کمرے میں موجود تھی۔
 ”یہ شادی تو میں بالکل نہیں کر سکتا۔“ اس نے رومیہ کی آنے والی کال کاٹتے ہوئے اسے اطلاع دی۔
 ”تو میں کون سامری جا رہی ہوں تم سے شادی کرنے کے لیے، اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کچھ کرو۔ برہان بھائی نے تو صاف ہری جھنڈی دکھادی ہے اور باقی کسی سے مجھے کوئی امید نہیں، اب صرف تم رہ گئے ہو۔“ وہ بری طرح چڑ کر گویا ہوئی۔
 ”لیکن مجھ سے تو ابھی تک کسی نے اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کی، نہ نانا ابا نے نہ ماموؤں میں سے کسی نے مجھ سے میری رائے مانگی۔ آخر میری رضامندی کے بغیر میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ یہ لوگ کیسے کر سکتے ہیں۔“ وہ بری طرح سے تباہ ہوا تھا۔

”اس لیے کہ وہ تمہیں اس قابل نہیں سمجھتے کہ تم سے کچھ پوچھیں، تم تو ان کے غلام ہو۔ ظاہر ہے انہوں نے تمہاری پرورش کی ہے، اب اس چیز کا خراج تو تمہیں دینا ہی پڑے گا۔“ درشہوار مسلسل اسے بھڑکار رہی تھی۔
 ”میں ان کے گاؤں کا کوئی کمی نہیں ہوں جو ان کی خیرات پر پلا ہوں۔ میرے والدین کروڑوں کو جائیداد چھوڑ کر مرے ہیں، ان کی ایک ایک چیز میں میرا اور میرے کا حصہ نکلتا ہے۔“ وہ آتش فشاں کی مانند پھٹا۔
 ”یہ باتیں مجھے نہیں، ان سب کو بتانے کی ضرورت ہے، جو بیٹھ کر دوسروں کی زندگیوں کے فیصلے کرتے ہیں۔“ درشہوار انتہائی بدظن ہو چکی تھی اور برہان سے مایوس ہو کر اب اس نے ارسل کی مدد لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
 اسی وقت ملازمہ ہلکا سا دروازہ بجا کر اندر داخل ہوئی، دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ارسل بلاوا آچکا تھا اور درشہوار اسے کمرے سے نکلنے تک بھڑکار رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ میر حاکم کی خواب گاہ تک پہنچا تو اس کا دماغ اس وقت کھول رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے دھچکا لگا، سامنے اس کے دونوں ماموں، میر خاقان، میر محتشم کے ساتھ حاکم علی خود بھی موجود تھے اور پاس ہی خوشی سے بے حال — ندرت بیگم موجود تھیں، جنہیں زندگی میں پانچ بار یہ اعزاز بخشا گیا تھا کہ وہ اس خاندان کے کسی فیصلے کا حصہ بن سکیں۔ اس لیے ان کی یہ خوشی ان کے برابر بیٹھی ہوئی ان کی جھٹائی تاجدار بیگم کو سخت ناگوار گزر رہی تھی۔

ارسل نے اندر داخل ہوتے ہی سب کو ہلکا سا گڑبڑا کر سلام کیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت گھر کے سب ہی بڑے یہاں موجود ہوں گے۔ وہ خاموشی سے سامنے رکھے کاؤچ پر میر خاقان سے قدرے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

میر حاکم علی اپنی چھتری پر زور دے کر کھڑے ہوئے، وہ اپنے سارے اہم فیصلے اسی طرح کھڑے ہو کر کیا کرتے تھے۔ یہ ان کا مخصوص انداز تھا جو اس گھر کے سب ہی مکین جانتے تھے۔
 ”دیکھو ندرت! تمہارا تعلق ہمارے خاندان سے براہ راست تو نہیں لیکن شجرہ نسب کہیں نہ کہیں آپس میں جا ملتا ہے اور ہم نے تمہیں خاقان کی دوسری بیوی کے حوالے سے کھلے دل سے قبول کیا۔“ میر حاکم کی اس غیر متعلقہ بات پر ارسل کے ساتھ ساتھ ندرت بھی چونکیں۔

”تمہیں اللہ نے اولاد نہیں دی تو ہم نے اپنا نواسہ اور نواسی دونوں تمہاری گود میں ڈال دیے اور مڑ کر تم سے نہیں پوچھا کہ تم نے ان کی تربیت کیسے کی؟ ان کو کیسے پالا، انہیں خاندانی روایات سکھائیں یا نہیں سکھائیں؟“ میر حاکم کی اس بات پر ندرت بیگم ہلکا سا ہنسی گئیں۔

”آج تک اس گھر میں ہونے والے فیصلوں میں کبھی کسی کی اولاد سے یہ نہیں پوچھا گیا کہ انہیں ہمارا یہ فیصلہ منظور ہے کہ نہیں کیونکہ ہمیں اپنی اولاد پر پورا مان اور بھروسہ ہوتا ہے۔“ ان کی اس بات پر ارسل کے دل و دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

”اباجی! ان شاء اللہ ارسل اور نیرہ بھی کبھی آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔“ وہ محتاط انداز میں گویا ہوئیں۔
 ندرت بیگم کی اس بات پر ارسل نے دل کرا اپنی ماں کا چہرہ دیکھا، جنہوں نے اسے جہنم نہیں دیا تھا لیکن ان دونوں بہن بھائی کو اس وقت گود میں لیا، جب انہیں ماں کی سخت ضرورت تھی، انہوں نے اپنی راتوں کی نیندیں ان دو بچوں کے لیے حرام کیں، اور خاندانی معاملات میں ان کے لیے ویسے ہی بولیں، جیسے کہ ایک ماں اپنے بچوں کے حق میں بولتی ہے۔

کمرے میں سنانے کا راج تھا۔ میر حاکم علی ٹہل رہے تھے اور اسی وقت ارسل کے سیل فون کی گھنٹی نے کمرے کے ماحول میں ارتعاش برپا کیا۔ اس نے بوکھلا کر رومیہ کی کال کائی۔ شاید دوسری طرف اس کا دل بھی کسی انہونی کے احساس کو جگا چکا تھا۔

”اب وہ وقت آچکا ہے کہ ہم اپنے ان بچوں کی زندگیوں کے بارے میں بھی کچھ فیصلے کر سکیں۔“ وہ دو ٹوک انداز میں گویا ہوئے۔

اس سے پہلے کہ ارسل، میر حاکم کے لہجے کی بیگنی پر غور کرتا، اس کے سیل فون کی مترنم گھنٹی ایک دفعہ پھر گونجی اور میر حاکم کے ضبط کی دھجیاں اڑا گئی۔ ایسی گستاخی کی اجازت تو انہوں نے بھی اپنے بیٹوں کو نہیں دی تھی، جو اپنے باپ کے پاس کسی خاص پنچایت کے دوران اپنے سیل فونز کی آوازیں بند کر کے بیٹھتے تھے۔

میر حاکم علی غصے سے آگے بڑھے، ارسل کے ہاتھ سے سیل فون چھینا اور کمرے کی کھڑکی کھول کر مشتعل انداز سے باہر اچھال دیا۔ کمرے میں موجود سب لوگوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ ارسل کی تو یہ حالت تھی جیسے کانٹو تو بدن سے لہو کا ایک قطرہ نہ نکلے۔

”تم نے اسے یہ تمیز سکھائی ہے، بڑوں کی محفل میں بیٹھنے کی۔“ انہوں نے ندرت بیگم کو جھاڑا تو ندرت کا منہ سرخ ہو گیا۔

”آئی ایم سوری۔“ ارسل کے سارے حوصلے پست ہو گئے۔

”آپ صرف اپنا فیصلہ سنائیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ خاقان علی نے کمرے کے ماحول کو تھوڑا ٹھنڈا کرنے کی دانستہ کوشش کی۔ ویسے بھی وہ اس وقت ارسل کے سر پرست کی حیثیت سے یہاں موجود تھے۔

”فیصلہ یہی ہے کہ اثابہ کی رخصتی کے ساتھ در شہوار کا ارسل سے نکاح ہوگا۔“ ان کے اس اعلان پر ارسل کا رنگ اڑا۔

”اور اس کے ساتھ ساتھ میرا یہ فیصلہ بھی ہے کہ نمبرہ اور شاہ میر کی مگنی کا بھی اعلان کر دیا جائے۔“ حاکم علی کے اگلے فیصلے پر تاجدار بیگم پر تو گویا خود کش حملہ ہوا، انہوں نے حواس باختہ نظروں سے اپنے سر کو دیکھا، جنہوں نے اس فیصلے کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی تھی، انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا کیونکہ وہ جانتی تھیں شاہ میر اس فیصلے پر طوفان کھڑا کر دے گا، قدرت نے ان کی اولاد کو آزمائش کی صورت میں ان کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

”کسی کو میرے فیصلے پر اعتراض تو نہیں؟“ میر حاکم علی نے رسماً پوچھا۔

ارسل نے احتجاجی نظروں سے ندرت بیگم کی طرف دیکھا، جن کی آنکھوں میں اس وقت التجا کا ایک جہان آباد تھا بس ہاتھ جوڑنے کی کسرباتی رہ گئی تھی۔ حاکم علی کے اس فیصلے نے جہاں ارسل کی جی بجھائی تھی، وہاں میر خاقان کا دل بھی خاصا خراب کیا جو اپنی بیٹی طوبی کے لیے شاہ میر کا سوچے بٹھے تھے اور چونکہ ان کے ہاں خاندان سے باہر شادیوں کا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے انہیں ابھی سے اپنی بیٹی کی غلط فیصلے کی بھینت چڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔

شہر زاد کا دروازہ زور زور سے بجا۔ وہ گہری نیند سے بیدار ہوئی اور اس نے وال کلاک میں وقت دیکھا صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اس نے ہڑ بڑا کر دروازہ کھولا تو سامنے ملازمہ نیند بھری آنکھوں کے ساتھ موجود تھی اور اس کے ہاتھ میں کارڈ لیس تھا۔

”بی بی جی! کسی صاحب کی بار بار کال آ رہی ہے وہ آپ سے بات کروانے کا کہہ رہے ہیں۔“

”مجھ سے.....“ اس نے پریشانی سے ریسیور پکڑا۔

”شہر زاد! اپنا سیل فون آن کرو، میں تمہیں کال کر رہا ہوں۔“ ہم زاد کے لہجے کی سنگینی پر اس کا دل دھڑا اس نے بے اختیار سائیڈ میز پر موجود اپنا سیل فون چارج سے اتارا، جسے اس نے رات سوتے وقت بے دھیما میں پاورڈ آف کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ اس نے کمرے کا دروازہ مقفل کر کے اپنے سیل فون کو آن کیا۔

”میں مانتی ہوں اس وقت امریکہ میں دن ہوگا لیکن انسان کم از کم دوسروں کی ٹانگٹوک کا ہی خیال کر ہے۔“ اس نے ہم زاد کی کال اٹینڈ کرتے ہی شکوہ کیا، لیکن دوسری طرف سے ملنے والی اطلاع نے اس کے چا

طبش روشن کر دیے۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ شہر زاد کی دھڑکن بے ربط ہوئی۔

”رومیہ کیس کے اہم گواہ، صارم خان کا مرڈر کر دیا گیا ہے۔“ اس نے اس کی سماعت پر ہم گرایا۔

”واٹ؟“ وہ ایک دم چیخی۔ ”کب..... کس وقت.....؟“

”ابھی ایک گھنٹہ پہلے اور بظاہر یہ ڈیکیتی کی واردات ہے لیکن میرے سورسز بتاتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں۔“

”اوہ مائی گاڈ..... کس نے کیا یہ سب.....؟“

”وہی جو رومیہ سہگل کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتے ہیں۔ سنو شہزاد! تم ارتضیٰ سے کہہ کر اپنے کمر کی سیکوریٹی بڑھا دیا مجھے بتاؤ، میں کچھ پرائیوٹ گارڈز کا انتظام کر دیتا ہوں۔“ وہ اتنی دُور بھی اس کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔

”کیا رومی کی جان کو بھی خطرہ ہے؟“ وہ فطری پریشانی میں مبتلا ہوئی۔

”نہیں۔“

”ہم زاد کی بات پر وہ چونکی۔“ تو پھر ایسی بات کیوں کر رہے ہیں آپ؟“

”شہر زاد! تمہاری جان کو خطرہ ہے اور تمہیں کچھ ہو، یہ میں ہونے نہیں دوں گا، میں کل واپس آ رہا ہوں۔“

”وہ فون بند کر چکا تھا اور شہر زاد کی آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی۔ اس نے کچھ سوچ کر ارتضیٰ حیدر کا نمبر ملایا، گہری نیند میں ڈوبی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔“

”ارتضیٰ! میں شہر زاد بات کر رہی ہوں۔“ اس کی فون کال نے دوسری طرف موجود ارتضیٰ کی بھی نیند غارت کی۔

”خیریت تو ہے ناں سب؟“

”صارم خان کا مرڈر ہو گیا ہے تھوڑی دیر پہلے۔“

”کیا؟“ فون کال کی دوسری جانب موجود ارتضیٰ کو بھی دھچکا لگا۔ ”ایک منٹ مجھے ٹی وی آن کرنے دیں۔“

کچھ ہی سیکنڈ کے بعد کمرے میں ٹی وی کی آواز گونجنے لگی، وہ تیزی سے چینلوں پر سرچ کر رہا تھا۔

”ٹی وی پر تو ایسا کچھ نہیں چل رہا، میں اس علاقے کے پولیس اسٹیشن میں فون کر کے رپورٹ لیتا ہوں۔“

”ارتضیٰ! میں اپنے سورسز کے مطابق کہہ رہی ہوں ناں کہ اس کا ایک ڈیکیتی کے واقعے میں مرڈر کر دیا گیا ہے، تو آپ کو یقین کر لینا چاہیے۔“ اس کا جتنا تا ہوا لہجہ ارتضیٰ کو خفت میں مبتلا کر گیا، تبھی اس نے ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

”بہت تیز سورسز ہیں آپ کے، میڈیا سے پہلے آپ کو اطلاع پہنچ گئی۔“

”میرا تو خیال ہے، اس علاقے کے تھانے میں بھی یہ خبر نہیں پہنچی ہوگی۔ آپ وہاں پہنچ کر اس کا کریڈٹ لے سکتے ہیں۔“ شہر زاد نے طنزیہ لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے فون بند کر دیا۔ دوسری طرف وہ خاصا شرمندہ ہو چکا تھا۔

اسے اپنے کمرے میں گہری گھٹن کا احساس ہوا، اور وہ اپنے کمرے میں موجود ٹی وی کی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

اس کا کمرہ گھر کے مین گیٹ کے عین سامنے تھا، جہاں سے لان اور باہر سڑک کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا، گیٹ پر موجود چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور سیکوریٹی گارڈز اسے کہیں نظر نہیں آئے، اس نے اپنے سیل فون سے چوکیدار کا نمبر ملایا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔

”اس کا کمرہ گھر کے مین گیٹ کے عین سامنے تھا، جہاں سے لان اور باہر سڑک کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا، گیٹ پر موجود چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور سیکوریٹی گارڈز اسے کہیں نظر نہیں آئے، اس نے اپنے سیل فون سے چوکیدار کا نمبر ملایا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔“

”اس کا کمرہ گھر کے مین گیٹ کے عین سامنے تھا، جہاں سے لان اور باہر سڑک کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا، گیٹ پر موجود چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور سیکوریٹی گارڈز اسے کہیں نظر نہیں آئے، اس نے اپنے سیل فون سے چوکیدار کا نمبر ملایا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔“

”اس کا کمرہ گھر کے مین گیٹ کے عین سامنے تھا، جہاں سے لان اور باہر سڑک کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا، گیٹ پر موجود چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور سیکوریٹی گارڈز اسے کہیں نظر نہیں آئے، اس نے اپنے سیل فون سے چوکیدار کا نمبر ملایا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔“

”اس کا کمرہ گھر کے مین گیٹ کے عین سامنے تھا، جہاں سے لان اور باہر سڑک کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا، گیٹ پر موجود چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور سیکوریٹی گارڈز اسے کہیں نظر نہیں آئے، اس نے اپنے سیل فون سے چوکیدار کا نمبر ملایا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔“

”اس کا کمرہ گھر کے مین گیٹ کے عین سامنے تھا، جہاں سے لان اور باہر سڑک کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا، گیٹ پر موجود چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور سیکوریٹی گارڈز اسے کہیں نظر نہیں آئے، اس نے اپنے سیل فون سے چوکیدار کا نمبر ملایا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔“

”اس کا کمرہ گھر کے مین گیٹ کے عین سامنے تھا، جہاں سے لان اور باہر سڑک کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا، گیٹ پر موجود چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور سیکوریٹی گارڈز اسے کہیں نظر نہیں آئے، اس نے اپنے سیل فون سے چوکیدار کا نمبر ملایا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔“

”اس کا کمرہ گھر کے مین گیٹ کے عین سامنے تھا، جہاں سے لان اور باہر سڑک کا منظر بھی صاف دکھائی دیتا تھا، گیٹ پر موجود چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور سیکوریٹی گارڈز اسے کہیں نظر نہیں آئے، اس نے اپنے سیل فون سے چوکیدار کا نمبر ملایا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا۔“

”فضل سیکورٹی گارڈز کدھر ہیں دونوں؟“ شہزاد کی آواز نے چوکیدار کو لرٹ کر دیا۔

”بی بی جی! باہر والے کیمین میں ہوں گے۔“

”چیک کر کے مجھے بتاؤ۔“ اس نے فون کال بند نہیں کی، لیکن وہ اس سیاہ رنگ کی کار کو دیکھ کر ضرور چونکی، جو اس کی گلی سے پانچ منٹ کے وقفے کے بعد دوبارہ گزری تھی۔ چوکیدار کے ساتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اندر آنے والے سیکورٹی گارڈز کو اس نے ٹیس پر کھڑے بھانپ لیا تھا کہ وہ انہیں گہری نیند سے بیدار کر کے لایا ہے۔

شہزاد تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر اپنے سنگ روم میں پہنچی اور دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلی، سیکورٹی گارڈز اسے دیکھ کر لرٹ ہو گئے۔ اگلے دس منٹ ان کی جھاڑ پٹی کر کے وہ اوپر پہنچی۔ اسے ہم زاد کی باتوں نے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اپنے حوالے سے وہ کبھی بھی زیادہ پریشان نہیں ہوتی تھی۔

لیکن صارم خان کی موت نے اسے پھر ایسے مقام پر لاکھڑا کیا تھا، جس میں رومیصہ کو آنے والے دنوں میں کافی مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا، دور سے آنے والی فجر کی پہلی اذان پر اس نے وضو کیا اور اپنے اللہ کے سامنے گڑگڑا کر دعا کی۔

صبح وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال پہنچی تو سامنے رومیصہ اور ٹینا بیگم کو انتہائی صدمے کی کیفیت میں پایا، ٹینا بیگم ہاتھ میں چائے کا گگ پکڑے بیٹھی تھیں اور انہیں شاید اس بات کا احساس ہی نہیں تھا بھی چائے پر گہری ملائی کی تہہ جم چکی تھی۔

”شیری! تمہیں صارم کا پتا چلا؟“ رومی نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

”ہاں، کیا بتا رہے ہیں لی وی پر؟“ وہ خود کو کافی کمپوز کر چکی تھی، ٹینا بیگم نے انتہائی حیرانی سے اس کا پرسکون چہرہ دیکھا۔

”لی وی پر تو اسے کوئی ڈکیتی کی واردات بتا رہے ہیں لیکن اس کا باپ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ اس کے بیٹے کو جان بوجھ کر قتل کیا گیا ہے۔“ ٹینا بیگم نے افسردگی سے اسے بتایا تو شہزاد نے چونک کر رومیصہ کی طرف دیکھا جو ہاتھ میں پکڑا ٹوسٹ کھانا بھول گئی تھی۔

”رومی!“ اس نے محبت سے اپنی بہن کو پکارا تو اس نے چونک کر دیکھا، اس کی نیلیوں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

”ڈونٹ وری! میری جان، کچھ نہیں ہوگا۔“ شہزاد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دلاسا دیا۔

”صارم تو بہت اچھا انسان تھا شیری! ان لوگوں نے اسے کیوں مار دیا۔“ وہ اس کے گلے لگ کر سسنے لگی۔

”بے فکر رہو، جو کسی پر ناحق ذرا سا بھی ظلم کرے گا اسے اسی دنیا میں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔“ وہ رومی بہت محبت سے سمجھا رہی تھی جب ہم زاد کی کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”جی!“ اس نے رومی کی موجودگی میں محتاط انداز اپنایا۔

”میجر توصیف تمہارے گھر کے باہر موجود ہیں، ان کو اندر بلوالو۔“

”لیکن کیوں؟“ وہ تھوڑی سی پریشان ہوئی۔

”وہ گھر کے تمام سیکورٹی انتظامات کا جائزہ لیں گے اور جن جن جگہوں پر کیمرے کی ضرورت ہوگی،

لگا دیں گے۔ ان کے ساتھ رضا ہے جو آج سے تمہارے ساتھ گاڑی، آفس، کورٹ بلکہ ہر جگہ موجود ہوگا۔“

”اب یہ رضا کس خوشی میں میرے ساتھ ہوگا؟“ وہ ہلکا سا جھنجھلا کر کھڑی ہوئی۔

”میری خوشی کے لیے۔“ اس کا دونوں انداز شہزاد کو ایک دم چپ کر دیا دوسری طرف وہ مزید پوچھ رہا تھا۔

”میری اتنی سی خوشی اگر قابل قبول نہیں ہے تو بتاؤ میں منع کر دیتا ہوں۔“ وہ ضرورت سے زیادہ حساس تھا۔

”آفس اوکے، میں آفس کے لیے نکل رہی ہوں، اجازت ہے۔“ اس کے طنز پر انداز پر وہ مسکرایا۔

”ایسے مت پوچھا کرو، مجھے خود پر مجازی خدا کا گمان ہونے لگتا ہے۔“ اس کی شرارت پر شہزاد ہلکا سا مسکرائی کیونکہ رات سے وہ پہلی دفعہ اسے تھوڑا پرسکون لگا تھا، ورنہ اس کے لہجے کی سنگینی، اسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ فون پر بات کرتے ہوئے باہر نکلی، سامنے میجر توصیف اس کے پورچ میں کھڑے سیکورٹی گارڈز سے گفت و شنید کر رہے تھے۔

”میں بعد میں بات کرتی ہوں۔“ اس نے فون بند کیا۔

”آپ میری شیری ہیں شاید، مجھے اسپیشل آرڈرز کے طور پر بھجوا گیا ہے یہاں۔“ اس نے فوراً آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔

”کس کورپورٹ کریں گے آپ؟“ شہزاد نے انجان بن کر پوچھا۔

”ہیڈ کوارٹر میں لینٹینٹ جنرل خالد صاحب کو۔“

”اوکے، آپ آئیں، میں می سے ملوا دوں آپ کو۔“

ٹینا بیگم اور رومی، یونیفارم میں موجود اس آفیسر کو دیکھ کر ہلکی سی پریشانی میں مبتلا ہوئیں، لیکن شہزاد نے انہیں اچھی طرح مطمئن کر ہی دیا۔ صارم والے واقعے کی وجہ سے وہ دونوں کافی اپ سیٹ تھیں۔

رضا سے اس نے آفس کے راستے میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے انٹرویو لے لیا تھا، وہ تیس بیس سال کا ایک دراز قد، چوڑے شانوں والا پراعتماد سانو جوان تھا، اور کسی پرائیوٹ سیکورٹی کمپنی سے وابستہ تھا اور اس انٹرویو سے وہ کافی حد تک مطمئن ہو گئی۔

جیسے ہی وہ آفس میں پہنچی، مسز قریشی کے آفس میں ہادی کے ساتھ ارتضیٰ حیدر کو دیکھ کر ہلکا سا چونکی، ارتضیٰ رات والی بات کی وجہ سے کچھ شرمندہ سا دکھائی دے رہا تھا، اس نے دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔

”ہادی آپ کب آئے؟“ اس نے ارتضیٰ کو نظر انداز کر کے اس سے پوچھا۔

”بس ایک پرانے کیس کے کچھ حوالہ جات چاہیے تھے، اس لیے صبح آنا پڑا۔“ وہ ایک فائل کے ڈاکو سنس کو غور سے دیکھتا ہوا اپروائی سے گویا ہوا۔ اسی وقت شہزاد کے سیل فون پر دوبارہ ہم زاد کا نمبر جکا۔

”ایکسپوزی۔۔۔۔۔“ اس نے معذرت خواہانہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور کال اینڈ کر کے آفس سے باہر نکل آئی۔

”میں نے تمہارے گھر کے دونوں سیکورٹی گارڈز کو فارغ کر دیا ہے اور ان کی جگہ پر میجر توصیف شام تک نے لوگوں کو بھیج دیں گے۔“

اس اطلاع پر وہ کچھ کوفت کا شکار ہوئی۔ ”آخر کیا ضرورت تھی ان کو نکالنے کی، می مائنڈ کریں گی۔۔۔“

”ایسے ڈفر لوگوں کو نکالنے پر ماسٹرنہیں کرنا چاہیے بلکہ شکریہ کہنا چاہیے، ابھی تھوڑا مصروف ہوں، شام کو تفصیل سے بات ہوگی۔“

وہ فون بند کر چکا تھا، شہر زاد بے زاری سے سر جھٹک کر اندر آئی تو ارٹھی حیدر، مسز قریشی کے ساتھ صادم خان کے قتل کے کیس پر ہی بات چیت کر رہا تھا اور ان دونوں کے چہروں پر تشویش کے سائے تھے۔

”ارٹھی! کچھ مزید پیش رفت ہوئی اس کیس میں؟“ وہ ارٹھی کے عین سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

”کیس تو واقعی مشکوک ہے، کیونکہ ڈاکو گھر سے کوئی خاص قیمتی چیز نہیں لے کر گئے اور فیملی کے بیانات کے مطابق اس وقت صادم اپنے کمرے میں سو رہا تھا، ایسی صورت میں کسی مزاحمت کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

”اس لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسے قتل کیوں کیا گیا ہے۔“ وہ اپنے سامنے کافی کار کھا کپ اٹھا کر سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”یقیناً اس کے پیچھے رومی والا کیس ہی ہے۔“ مسز عالیہ قریشی نے تبصرہ کیا، جبکہ ہادی ان کی گفتگو سے بے نیاز اپنے کام میں مگن تھا۔

”مجھے تو کتنہ وقار کے والد کا کارنامہ لگ رہا ہے۔“ شہر زاد نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”لیکن جسٹس محمود کی فیملی کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ یہ گواہی ان کے بیٹے کے خلاف جاری تھی کیونکہ صادم نے اگلی پیشی میں کھل کر رو حیل کی رومیسے کے ساتھ کی جانے والی بدتمیزی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔“ ارٹھی کی بات پر وہ چونکی اور اثبات میں سر ہلایا، ارٹھی کی بات میں دم تو تھا۔

”میرے خیال میں شیری، ہمیں ان کے ہاں افسوس کے لیے جانا چاہیے۔“ مسز عالیہ قریشی نے اچانک کہا۔

”جی، ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، میں بھی یہی سوچ رہی تھی لیکن بہتر ہوگا کہ ہم ایک دو دن ٹھہر جائیں۔“ اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

”ہاں تھوڑا ریش بھی کم ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ کچھ نئی چیزیں بھی سامنے آجائیں۔“ وہ فوراً متفق ہوئیں۔

”مام! میں نکلتا ہوں، میرا کام ہو گیا ہے۔“ ہادی نے جلدی جلدی اپنے سیل فون میں ڈاکومنٹس کی چند تصویریں بنا کر فائل بند کی۔

”ہادی! آپ سے مجھے بھی ایک ضروری کام تھا۔“ شہر زاد نے اچانک اسے مخاطب کیا۔

”خیریت؟“ وہ چونکا اور ارٹھی نے بطور خاص سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کا سادہ، شفاف چہرہ دیکھا، اس کی کوئی خاص تاثر نہ پا کر وہ مطمئن ہوا۔

”ایک دو دن میں ارٹھی کے ساتھ آپ کے آفس کا چکر لگاؤں گی، پھر وہاں بیٹھ کر ڈسکس کریں گے۔“ اس بات نے تو ارٹھی کو اور بھی مطمئن کر دیا۔

”شیور۔ اوکے مام! ٹیک کیئر۔“ وہ ان سے مل کر تیزی سے آفس سے نکل گیا۔

”ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے۔“ مسز عالیہ قریشی کے لہجے میں اپنے بیٹے کے لیے محبت ہی محبت تھی، وہ بھی مسکرا کر خاموشی سے چائے پینے لگی، ارٹھی بھی اٹھ کر اپنے آفس جا چکا تھا۔

☆☆☆

پورے میر ہاؤس میں گویا صف ماتم بچھ گئی تھی۔

ہر کوئی ایک دوسرے سے نظریں چرائے گھوم رہا تھا، حاکم صاحب کے فیصلوں نے بہت سے لوگوں کے ہونٹوں پر احتجاجی خاموشی کی مہر لگا دی تھی۔ ایسے عالم میں ایک صرف در شہوار تھی جو باغیانہ انداز میں پورے گھر میں پاؤں پٹختی ہوئی گھوم رہی تھی۔

شارقہ بیگم کا رو رو کر بُرا حال تھا اور انا بیہ ان کو سمجھانے کے چکر میں بے حال تھی، جبکہ نمبرہ کے گالوں پر لالیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ شاہ میر کو دل ہی دل میں پسند کرتی تھی لیکن اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ قدرت اسے اتنی آسانی سے اس کی گود میں ڈال دے گی، جبکہ طوبی ابھی تک شدید صدمے کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اس نے شاہ میر کی اپنے فون پر آنے والی پیچیسویں کال کو بھی اٹینڈ نہیں کیا تھا۔

شاہ میر دو دن پہلے ہی گھر شفٹ ہوا تھا اور اس وقت آتے جاتے تاجدار بیگم کو سرخ آنکھوں کے ساتھ گھور رہا تھا۔

”خدا کے لیے میرا بس در شہوار کے نکاح تک چپ کر جاؤ۔“ انہوں نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

”مر جاؤں گا لیکن طوبی کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا۔“ وہ اپنے مخصوص ہٹ دھرم انداز میں بولا۔

”میں خود تمہارا ساتھ دوں گی لیکن در شہوار کا نکاح ہونے دو۔“

”تو آپ کا کیا خیال ہے ارسل بعد میں در شہوار کو معاف کر دے گا۔ جب میں اس کی بہن سے شادی سے انکار کروں گا۔ اس لیے بہتر ہوگا گل الہی سے کہیں کہ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کریں۔“ شاہ میر نے انہیں نئی پریشانی میں مبتلا کیا۔

”تمہارے دامی، کبھی نہیں مانیں گے بیٹا۔“ وہ پریشانی سے گویا ہوئیں۔

”میں بھی ان ہی کا پوتا ہوں، یہ بات یاد رکھیے گا۔“ وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی کچھ کہہ گیا۔

شاہ میر غصے سے تاجدار بیگم کے کمرے سے نکلا تو سامنے سے ارسل آرہا تھا، اس نے ایک ناراض نگاہ اس پر ڈالی، ارسل سمجھ چکا تھا کہ وہ اس سے خفا ہے کیونکہ اس گھر میں اس کی اور طوبی کی محبت کو ارسل کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

”شاہ میر! پلیز میری بات سنو۔“ ارسل نے پریشانی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“ وہ اس وقت ساری دنیا ہی سے خفا تھا۔

”دیکھو اس سارے قہصے میں میرا کوئی قصور نہیں اور یقین مانو، جتنا دھچکا تمہیں لگا ہے اس سے زیادہ تکلیف مجھے ہوئی ہے۔“ اس نے جذباتی انداز سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں نمبرہ سے شادی نہیں کر سکتا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے بولا۔

”اور میں در شہوار سے۔“ ارسل نے نظریں چرا کر کہا تو شاہ میر کو ایک اور دھچکا لگا۔

”صرف اس لیے کہ میں تمہاری بہن کے لیے انکار کر رہا ہوں۔“ شاہ میر بدگمان ہوا۔

”نہیں، اس لیے کہ میری زندگی میں کوئی ”اور“ ہے۔“ اس نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے راز میں اسے شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہ میر نے یک دم حیران ہو کر اپنے بیسٹ فرینڈ کا چہرہ دیکھا، ارسل کے چہرے

لوگ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے ہمارا۔“
 ”کیا کرو گے تم؟ بولو، جواب دو؟“ وہ ترش انداز سے گویا ہوئی۔
 ”نکاح..... تمہارا اور میرا۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا، طوبی نے اس کی طرف ایسے دیکھا، جیسے اس کی
 خرابی دماغ کا یقین آ گیا ہو۔
 ”داجی ہماری بوٹی بوٹی کر کے کتوں کے آگے پھنکوا دیں گے۔“
 ”اپنی اولاد کے ساتھ یہ سب کرنا اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔“ اس نے اس کی بات کو استہزاء سے انداز میں
 اڑایا۔

”تم ایک دفعہ تیا ابا سے بات کر کے دیکھو نا شاہ میرا کیا پتا کوئی اور راستہ نکل آئے۔“ طوبی نے درمیانی راہ
 نکالنے کی کوشش کی۔

”خبردار..... منہ سے بھاپ بھی مت نکالنا، ان لوگوں کو بھٹک بھی پڑ گئی تو منگنی کے بجائے ڈائریکٹ شادی
 کر دیں گے میری اور میرہ کی۔ میں ان کو پہلے سے ہوشیار نہیں کرنا چاہتا۔“ شاہ میر نے تھوڑا ہوش سے کام لیا۔
 ”لیکن شاہ میر! میں کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی، جو کل کو ہمارے لیے طعنہ بنے، پلیز تم کچھ اور
 سوچو۔“ طوبی کی پریشانی پر وہ تپ اٹھا۔

”پھر ایسا کرو ہال کمرے میں ڈھولک اٹھا کر بیٹھ جاؤ اور ان اوٹ پٹانگ شادیوں پر خوشی کے گانے گاؤ،
 جھومو، ناچو، اس سے کوئی نہیں روکے گا تمہیں۔“ وہ ناراضی سے کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہال کمرے کی طرف
 بڑھا۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، سامنے نمیرہ کپڑوں کا بڑا سا راسٹرا اٹھائے مکتی ہوئی اندر آ رہی تھی، خوشی اس
 کے انگ تک سے عیاں تھی، شاہ میر کو دیکھ کر وہ بڑے دلکش انداز میں مسکرائی اور تخت پر بیٹھی ہوئی تاجدار بیگم کی
 طرف بڑھی، جو اس وقت اپنی دیورانی ندرت بیگم کے ساتھ پردوں کا کوئی جوڑ توڑ کرنے میں مگن تھیں۔

”ممائی جان یہ لیس، وہ سارے پردے جو آپ نے منگوائے تھے۔“ نمیرہ کی پرشوق نگاہیں شاہ میر پر اور
 قدم تاجدار بیگم کی طرف اٹھ رہے تھے، وہ راستے میں رکھی ہوئی میز سے ٹکرائی اور اس کے منہ سے سی کی آواز
 نکلی۔

”ارے میرو! دیکھنا، کیا ہوا اسے؟“ تاجدار بیگم بوکھلائیں۔

”جب اندھوں کی طرح چلے گی تو پیر ہی ٹوٹیں گے ناں۔“ وہ زہر آلود لہجے میں کہتا ہوا باہر کی طرف بڑھ
 گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر بھی زمین پر بیٹھی نمیرہ کی طرف نہیں دیکھا تھا، جیسے ہی وہ پورچ میں پہنچا، سامنے ارسل
 اپنی گاڑی اشارت کر رہا تھا، شاہ میر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تھوڑا مسئلہ ہو گیا ہے یار! مجھے فوراً اسلام آباد جانا ہے۔ کل تفصیل سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“ ارسل
 اپنی بات مکمل کر کے غلت بھرے انداز میں گاڑی نکال کر لے گیا اور شاہ میر لان میں رہی چیئر ز کی طرف بڑھ
 لیا، اسے وہاں بیٹھ کر اب کافی دیر کے لیے کڑھنا تھا۔

☆☆☆

”اس گھر میں ہمیشہ زیادتی ہوتی آئی ہے میری بچیوں کے ساتھ۔“
 شارقہ بیگم دوپٹہ منہ پر رکھے، پچھلے ایک گھنٹے سے خاقان صاحب کے سامنے رو رہی تھیں جو اس وقت سگار

پر موجود سچائی کو کسی اور گواہ کی ضرورت نہیں تھی۔
 ”تم میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔“ ارسل اس کا بازو پکڑ کر پال کمرے کے
 دروازے کی طرف بڑھا، اسی وقت دروازہ کھلا اور طوبی اندر داخل ہوئی، اس کی آنکھیں شدت گریہ کی وجہ سے
 سرخ تھیں۔ شاہ میر کے دل کو کچھ ہوا۔
 ”حالت دیکھی ہے تم نے اس کی؟ یہ سمجھ رہی ہے جیسے یہ سب میں نے خود کروایا ہے۔“ شاہ میر، ارسل کے
 سامنے شکایتی انداز میں بولا۔

”طوبی اتنی بے وقوف نہیں، وہ جانتی ہے اس گھر میں رہنے والے لوگوں کی ڈوریاں کسی اور کے ہاتھ میں
 ہیں، اس لیے ہماری ایک دوسرے سے ناراضی تو بنتی ہی نہیں۔“ ارسل نے طوبی کا دل صاف کرنے کی شعوری
 کوشش کی۔

”لیکن اس کے باوجود اس کا سارا غصہ میرے اوپر اترتا ہے، صبح سے پچیس کالز کر چکا ہوں لیکن اس نے تو
 شاید میری آواز نہ سننے کی قسم کھا رکھی ہے۔“ شاہ میر جو کہ خود اس فیصلے کی وجہ سے اچھا خاصا پریشان تھا، اوپر سے
 طوبی کے رویے نے اسے بڑی طرح سے ہرٹ کیا تھا۔

اسی وقت ارسل کے سیل فون پر رومیصہ کی کال آنے لگی، وہ دونوں ہی صارم خان کے اچانک قتل کی وجہ
 سے کافی ڈسٹرب تھے اور ارسل پر تو دہری قیامتیں ٹوٹی ہوئی تھیں، جن کو وہ چاہ کر بھی رومیصہ کے ساتھ ڈسلس
 نہیں کر سکتا تھا۔

”تم دونوں بات کرو، میں ایک ضروری کال اٹینڈ کر کے آتا ہوں۔“ وہ غلت بھرے انداز میں کال اٹینڈ کر
 کے باہر لان کی طرف نکل گیا۔

”تم ذرا آؤ میرے ساتھ۔“ شاہ میر زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر پچھلے لان کی طرف لے گیا، طوبی بالکل
 خاموش تھی، افسردگی، مایوسی اور پشیمانی اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

”بے وقوف لڑکی! تمہیں خود پر یقین نہیں ہے یا میرے اوپر؟“ اس نے تاسف بھری نظروں سے اپنے
 سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا، جو اس وقت اذیت کی انتہا پر تھی، اس نے شاہ میر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اس کی
 آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں طوبی! کیوں ٹینشن لے رہی ہو۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دلا سادینے کی
 کوشش کی۔

”داجی اپنے فیصلے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔“ آنسوؤں سے لبریز لہجے کے ساتھ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔
 ”تو بے فکر ہو، ہم بھی پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ میرے اوپر کوئی زور زبردستی کریں تو دوبارہ گھر
 چھوڑ کر چلا جاؤں گا میں۔“ شاہ میر کے انداز سے ہی ہٹیل پنا چھلک رہا تھا اور طوبی کا دل گویا کسی نے مٹی میں
 جکڑ لیا۔

”خود سے محبت کی اتنی بڑی سزا دو گے، ہمیشہ اپنے لیے ہی کیوں سوچتے ہو تم، میری ذات کی ایک لمحے میں
 نفی کرتے ہوئے تمہارا دل نہیں کاٹتا۔“ خود پر قابو پاتے ہوئے بھی وہ اپنی سسکی نہیں روک پائی۔
 ”تمہارا کیا خیال ہے ان خالم اور بے حس لوگوں کے بیچ میں چھوڑ کر جاؤں گا تمہیں؟“ وہ اس کی بے وقوفی
 پر جھنجھلایا۔ ”اس دفعہ ایسا نہیں ہوگا طوبی! ہم دونوں ایک ساتھ جائیں گے بلکہ اس دفعہ کچھ ایسا کریں گے کہ یہ

ارتضیٰ کی جیب اس وقت مری کے بل دار راستوں پر تیزی سے گامزن تھی۔
شہر زاد اس کے ساتھ ہادی کے آفس جاری تھی اور ارتضیٰ کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی اب پریشانی میں ڈھل
پہلی تھی کیونکہ وہ اسے کھل کر صندل والا قصہ سنا چکی تھی اور چونکہ اگلے ماہ ایکشن تھے اور اس سے پہلے شہر زاد اس
لیس کو میڈیا پر اچھا لے والی تھی۔
”دیکھیں شہر زاد! ویسے تو آپ خود بہت سمجھ دار خاتون ہیں، لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ اس کیس میں
خود کو انوالو مت کریں۔“

”کیوں ڈر لگ رہا ہے آپ کو؟“ اس نے اس کا مذاق اڑایا۔
”میں ڈرنے والا ہوتا تو بھی بھی پولیس ڈیپارٹمنٹ جوائن نہ کرتا، میں صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان
لوگوں کے نزدیک انسانی جان کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اور اس چیز کو وہ آسانی سے ہضم نہیں کریں گے۔“ اس نے
ڈھکے چھپے انداز میں اسے معاملے کی سنگینی سے آگاہ کیا۔
”میں موت سے ڈرنے والی نہیں ہوں ارتضیٰ!“ وہ اس کی بات کا مذاق اڑا کر بولی۔
”لیکن جو لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، ان کو ابھی ضرورت ہے آپ کی۔“ اس کے گہرے لہجے پر وہ
چونکی۔

”بے فکر رہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا اور آپ ٹینشن مت لیں، مجھے اپنی حفاظت کرنا آتی ہے۔“
”آپ نے نیم عالیہ سے یہ کیس ڈسکس کیا؟“ وہ محتاط انداز میں گویا ہوا۔
”آپ کو پتا ہے کہ میں کسی بھی کیس پر پہلے اپنی ورکنگ کر کے اور معاملات کو تمام پہلوؤں سے دیکھ کر ہی
ان کو انوالو کرتی ہوں۔“
”بہتر ہوگا، آپ صندل کا پوسٹ مارٹم کروانے سے پہلے ایک دفعہ ان سے مشورہ کر لیں کیونکہ اتنے
چھوٹے شہر میں یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہے گی اور اس کے بعد آپ کے لیے کافی مسائل پیدا ہو سکتے
ہیں۔“

اس سے پہلے کہ وہ ارتضیٰ کی بات کا کوئی جواب دیتی، سیل فون پر آنے والی ہم زاد کی کال نے اسے اپنی
طرف متوجہ کیا، وہ شاید پاکستان واپس آچکا تھا، اس نے جیسے ہی کال اٹینڈ کی، وہ دوسری طرف ناراضی سے گویا
ہوا۔

”تم نے اپنے سیکوریٹی گارڈ رضا کو آفس سے گھر کیوں بھجوا دیا اور خود کہاں ہو؟“
”مری کے راستے میں ہوں ارتضیٰ کے ساتھ، کچھ ضروری کام تھا مجھے۔“ اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔
”واٹ دا ہیل یار! میں نے تمہیں کہا تھا کہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھو، تمہیں میری بات ایک دفعہ کہنے
نے سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔“ ہم زاد کا یہ انداز شہر زاد کو ہلکا سا ناگوار گزارا۔
”انسان کی اپنی کوئی پرسنل لائف بھی ہوتی ہے اور میں اسے چوبیس گھنٹے سر پر سوار نہیں کر سکتی۔“ ٹرائے ٹو
انڈر اسٹینڈ مانی پوزیشن۔ ”شہر زاد کا انداز دھیما لیکن لہجہ خاصا تپا ہوا تھا اور ارتضیٰ کی موجودگی میں وہ کھل کر اس
نے ساتھ بحث بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”اچھا تو اب ارتضیٰ حیدر کے ساتھ تمہارے پرسنل میٹرز شروع ہو گئے ہیں، ہیں ناں؟“ دوسری طرف وہ سلگ کر

پرسنل میٹرز پر تھک رہے تھے۔ اچھی خاصی ٹینشن میں تو وہ بھی تھے لیکن ان کی مجبوری تھی کہ مرد ہونے کے ناتے وہ اس
پر دباؤ نہیں جاسکتے تھے۔
آج کافی دن کے بعد وہ شارقہ بیگم کے کمرے میں آئے تھے۔ ان کی دونوں بیویوں کے بیڈروم علیحدہ
علیحدہ تھے اور وہ اکثر ہی ندرت کے کمرے میں پائے جاتے لیکن آج ان کا اپنا دل دکھا ہوا تھا، اس لیے شارقہ
بیگم کی طرف چلے آئے جن کی رو رو کر آنکھیں سوچ چکی تھیں لیکن انہیں صبر پھر بھی نہیں آ رہا تھا اسی لیے وقفے
وقفے سے ان کی سسکیاں گونجنے لگتیں۔

خاتون علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں کس طرح سے تسلی دیں۔
”افسوس تو مجھے بھی بہت ہوا ہے اباجی کے اس فیصلے پر۔“ انہوں نے ہلکا سا جھجک کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔
”آپ کو اسی وقت احتجاج کرنا چاہیے تھا ان کے سامنے، ہمیشہ میری ہی اولاد کو پیچھے کیوں رکھا جاتا ہے۔“
”جابل عورت، ایک بیٹی کا باپ ہونے کی حیثیت سے میں ایسی بات کیسے کر سکتا تھا، جب مختشم بھائی اور
بھابھی بھی وہیں موجود تھے۔“ وہ ہلکا سا جھنجھلائے۔

”تا جدار بھابھی نے بھی تو زبردستی اپنی بیٹی تھوپی ہے ارسل کے سر پر۔“ وہ تپ کر بولیں۔
”تمہیں کس نے بتائی ہے یہ بات؟“ وہ حیران ہوئے۔
”تو آپ کا کیا خیال ہے کہ اس گھر میں کوئی بات زیادہ دیر تک چھپی رہ سکتی ہے، اسی ایک بات کو منوا کر ہی
تو تا جدار بھابھی نے اپنی خود ساختہ جلا وطنی چھوڑی ہے، ورنہ وہ تو ہر چیز پر لعنت بھیج کر اپنے کمرے میں خود کو قید
کر چکی تھیں۔“

”لیکن تا جدار بھابھی کو ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ وہ تھوڑا چونکے۔
”کیونکہ انہیں ڈر تھا کہیں ارسل کا رشتہ طوطی کے ساتھ نہ ہو جائے اور درجہ وار کے جوڑ کا تو اب پورے
خاندان میں کوئی لڑکا بچا ہی نہیں۔“ وہ غصے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں، ان کی بات میں دم تھا بھی میرا خاتون کچھ دیر کے
لیے بالکل چپ ہو گئے۔
”لڑکا تو اب کوئی طوطی کے لیے بھی نہیں رہا، اسی بات کی تو ٹینشن کھائے جا رہی ہے مجھے۔“ ان کی تیوری
کے بل گہرے ہوئے۔

”ایک بات کان کھول کر سن لیں خاتون صاحب، چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں اپنی بیٹی کا گلا گھونٹ دوں
گی لیکن کوئی بے جوڑ رشتہ ہونے نہیں دوں گی، جو اس خاندان کی ہمیشہ سے روایت رہی ہے۔“ وہ سلگ کر
بولیں۔

”بے وقوف جیسی باتیں مت کرو شارقہ! ہم اپنی خاندانی روایات سے ہٹ کر کچھ نہیں کر سکتے۔“
”یہ خاندانی روایات صرف لڑکیوں کے معاملے میں ہی کیوں آتی ہیں، مردوں کو جگہ جگہ منہ مارنے کی
اجازت کیوں دے رکھی ہے انہوں نے۔“ شارقہ بیگم نے طیش کے عالم میں ان کو آئینہ دکھایا، وہ جھٹکے سے اٹھے،
ان کی آنکھوں میں غصہ اتر ا۔

”بکواس بند کرو اپنی، ورنہ منہ توڑ دوں گا میں تمہارا۔“ وہ تمللا اٹھے اور شارقہ بیگم کو غصہ ناک نگاہوں
سے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ شارقہ کو یقین تھا کہ وہ اب اگلے دس پندرہ دن تک ان کے کمرے کے
قریب پہنچیں گے بھی نہیں۔

رہ گیا شہزاد نے کن اکھیوں سے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو دیکھا، جس کا سارا دھیان بظاہر سڑک کی طرف تھا۔
 ”میں گھر آ کر تفصیل سے بات کرتی ہوں، اس وقت تھوڑا بڑی ہوں۔“ اس نے بے زاری سے کال منقطع کی تو
 ارتضیٰ نے ایک جاچتی ہوئی ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور سرسری انداز میں پوچھا۔ ”گھر سے کال تھی کیا؟“
 ”جی، اپنے سیکوریٹری گارڈ کو گھر بھیج دیا ہے ناں، اسی بات پر جھاڑ پڑ رہی تھی۔“ اس نے گول مول انداز
 میں جواب دیا۔

”ایسے محبت کرنے والے لوگوں کی کثیر کیا کریں، کسی کے دل میں ہمارے لیے کچھ ہوتا ہے تو وہ پریشان ہوتا
 ہے، ورنہ کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہمارے لیے ٹینس ہو۔“ ارتضیٰ نے اسے سمجھانے کی غرض سے نرم لہجے میں کہا تو
 وہ پھلکے سے انداز میں مسکرا دی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دوسری طرف موجود شخص اس وقت گرم تو ہے پر پڑے کسی دانے کی
 طرح اچھل رہا ہوگا اور اس وقت تک اسے سکون نہیں آئے گا جب تک وہ اپنے اندر کی ساری بھڑاس نہیں نکال لے گا۔
 ☆☆☆

ارسل اور رومیہ کے درمیان خاموشی کا مختصر وقفہ آیا۔
 آج رومیہ، ارسل کے کہنے پر اس کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں موجود تھی اور دونوں کے ہی چہرے ستے
 ہوئے تھے، صارم خان کے اس اچانک قتل نے ان دونوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور چونکہ وہ ارسل کا بہت قریبی
 دوست تھا اس لیے اس کا تو صدمہ بھی گہرا تھا۔
 ”میری تو ہمت ہی نہیں ہوئی اٹکل آنٹی کا سامنا کرنے کی اور میں کیسے ان کو جا کر بتاؤں گا کہ اس نے یہ
 سب میرے کہنے پر کیا تھا۔“ وہ مضطرب انداز میں خالی گلاس اپنے دونوں ہاتھوں میں گھما رہا تھا۔
 ”بہت بُرا ہوا اس بے چارے کے ساتھ اور اب پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہوگا۔“ رومیہ کے لہجے سے
 خوف جھلکا۔

ارسل نے گہری نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا، جو اسے اب ساری دنیا سے زیادہ عزیز
 ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس ایک سائیڈ پر رکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کی بے جان انگلیوں کو تھام
 کر محبت کی توانائی بخشنے کی کوشش کی۔

”میں بہت زیادہ ڈر گئی ہوں، جو لوگ اسے مار سکتے ہیں، وہ مجھے کیوں چھوڑیں گے بھلا؟“
 ”ایسا کچھ نہیں ہوگا، تم ایسی فضول باتیں مت سوچو۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ، تمہارا لائف پارٹنر، تمہیں
 کسی بھی مقام پر اکیلا تھوڑی چھوڑوں گا۔“ اس نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کا بوسہ لیا تو رومیہ نے نم آنکھوں
 سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ اس وقت شدید کرب کے گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ صارم کی موت نے اسے ایک دفعہ پھر ایک ایسی
 اندھی گلی میں لا کھڑا کیا تھا جہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ دوسری جانب ارسل کا اپنا دماغ بھی
 داہجی کے فیصلے میں بُری طرح الجھا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود وہ بہت محبت کے ساتھ اسے تسلی دینے کی بھرپور
 کوشش کر رہا تھا۔ ویٹر نے ٹیبل پر کھانا سرور کر دیا تھا۔

”تم کھانا کھاؤ، ان شاء اللہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا، یہ بتاؤ تمہاری بہن کیا کہتی ہے؟“ ارسل
 نے سر جھٹک کر اپنے ذہن سے گھر کے مسئلے کو نکالا اور رومیہ کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”شیری تو بہت مطمئن ہے اور اس کا کہنا ہے کہ صارم اپنی گواہی دے چکا ہے اور اس کی موت پر عدالت

یقیناً اس طرف سوچنے پر مجبور ہوگی کہ ایک بے گناہ شخص کو مارنے کے پیچھے وہی لوگ تو نہیں جو مجھے ناحق پھنسانا
 چاہتے ہیں۔“ رومیہ نے تھوڑے سے فرائیڈ رائس پلیٹ میں نکالے۔
 ”تمہاری بہن بہت اسٹرائنگ لیڈی ہے، میں نے اسے ہمیشہ بہت محل کے ساتھ میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے
 دیکھا ہے۔“ ارسل نے ایک دو چکن ونگز رومیہ کی پلیٹ میں ڈالیں تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔
 ”بہت کمزور لگ رہی ہوں، کھانا دھیان سے نہیں کھاتی ہو کیا۔۔۔؟“ وہ بہت پیار سے اسے ٹوک رہا تھا۔
 ”آج کل تو کچھ بھی کھانے کو دل نہیں کر رہا، طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے۔“
 ”آج جب تک یہ سارا نہیں کھاؤ گی، میں تمہیں یہاں سے ہٹے بھی نہیں دوں گا۔“ اس نے مسکرا کر ایک
 لباب اس کی پلیٹ میں اور رکھا۔

رومیہ نے جیسے ہی دوسرا نوالہ منہ میں ڈالا اسے ایک دم ابکا کی آئی اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ریسٹورنٹ کے
 واش روم کی طرف بھاگی، ارسل نے انتہائی پریشانی سے اس کی طرف دیکھا اور لپک کر اس کے پیچھے گیا۔ وہ باہر
 نکلی تو کافی غڈ حال لگ رہی تھی، اس وقت ریسٹورنٹ میں رش نہ ہونے کے برابر تھا، وہ اسے تھام کر کرسی تک
 لایا۔ ”رومیہ کیا ہوا ہے؟ کوئی ٹیپر پچر وغیرہ تو نہیں ہے؟“
 ”ڈونٹ وری، میرا اسٹاک کا ایڈجسٹمنٹ چل رہا ہے کچھ دن سے، تم ٹینشن مت لو۔“ رومیہ نے ٹشو سے منہ
 صاف کرتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”تم چھوڑ دیکھانے کو اور میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو فوراً۔“ وہ فکر مند ہوا۔
 ”کچھ نہیں ہوتا، ابھی تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“
 ”رومی! فضول باتیں مت کرو، شکل دیکھی ہے تم نے اپنی، رنگ کیسا زرد ہو گیا ہے تمہارا۔ بس اٹھ جاؤ،
 یہاں پاس ہی ایک اچھا ہسپتال ہے وہاں چلتے ہیں۔“ وہ آج اسے بخشنے کو تیار نہیں تھا۔
 ”لیکن ارسل! تم کھانا تو کھاؤ، سب کچھ دلے کا ویسے رکھا ہے۔“ رومیہ نے کھانے کی ٹیبل کو دیکھا۔
 ”نہیں یار! میں نے تو صرف تمہارے لیے منگوایا تھا، میرا بالکل بھی موڈ نہیں۔“

اس نے ویٹر کو بلا کر بل منگوایا اور اگلے ہی چندرہ منٹ میں وہ ایک قریبی ڈاکٹر کے کلینک میں تھے جنہوں
 نے اسی کلینک میں بیٹھنے والی ایک گائیکا کو لوجسٹ کی طرف اسے ریفر کر دیا تھا۔ مانتا تو دونوں کا اسی وقت ٹھنکا تھا،
 لیکن رومی نے دل پر جبر کر کے اپنے ایک دو ٹیسٹ کروائی لیے۔
 ”کیوں ٹینشن لے رہی ہو تم؟“ اس نے نرمی سے اسے ٹوکا لیکن رومی کی چھٹی حس اب اسے کوئی اور ہی
 سگنل دے رہی تھی۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ارسل!“ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی جب ایک نرس ڈاکٹر کا بلاوا لے کر ان کے پاس
 آئی، ان کی لیب رپورٹ آچکی تھی۔
 ”یہ آپ کے ہسپنڈ ہیں؟“ ڈاکٹر نے مسکرا کر دونوں کو بیٹھنے کو کہا تو ارسل نے جھٹ سے ہاں میں سر ہلا دیا۔
 ”سب خیریت ہے ناں؟“ وہ بے تابی سے گویا ہوا۔

”مبارک ہو، آپ دونوں کے ہاں گڈ نیوز ہے۔“ ڈاکٹر کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ پر رومی کو لگا جیسے کلینک
 لی پست اس پر آن گری ہو، اس کا چہرہ خوف سے سپید پڑ گیا اور وہ ہکا بکا انداز سے ارسل کی طرف دیکھنے لگی۔
 (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



تعمیرِ ناز انجمنِ طوطا کا طوطا

اصغر بچن میں چپاٹیاں پکانے میں مصروف تھا جب بیگم ولد ار اندر آئیں۔
”ارے اصغر نابکار“ ان کی غیر متوقع آمد اور آواز و انداز سے اصغر کے ہاتھ سے تیلن چھوٹے چھوٹے بجا۔
”اُف اللہ، بیگم صاحبہ!“ اصغر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔
”ملٹری ڈکٹیٹر ہو گئیں آپ تو، قسم سے ڈرا کر رکھ دیا بلکہ سہا دیا۔“

”یہ کیا نئے نئے الفاظ اور تراکیب اختراع کرتا رہتا ہے، تیرے ان لفظوں کی تو ایک لغت علیحدہ مرتب ہو جائے۔ اس کا نام ہوگا لغتِ اصغر!“
بیگم صاحبہ اس کے ”سہا دیا“ سے واقعی سہم گئی تھیں۔ ان دونوں عاشقِ اردو اور محافظِ اردو میاں بیوی کی صحبت میں اگر اصغر، مرقعِ اردو کی زندہ مثال بننے کے بجائے ٹی وی کے کسی بھی پروگرام یا مارننگ شو کے ایئر کی طرح جو منہ میں آئے بولتا رہے تو میاں بیوی کے نام و مقام کو بڑھ نہ لگ جائے؟

”چھوڑیں ہمیں اور ہماری زبان کو، پورا پاکستان یوں ہی بول رہا ہے۔ آپ بلاوجہ ہلکان ہوئی جاتی ہیں۔“ اصغر بے نیازی سے بولتا ہوا دوبارہ روٹی پکانے میں لگن ہو گیا۔

”ہاں یہ تو ہے، بولنے والے تو ان اپ شاپ بولتے رہتے ہیں۔ ہم جیسے سننے والے ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔“ بیگم صاحبہ اس سے کم ہی اتفاق کرتی تھیں، اس وقت تو اصغر کی باپچیں کل گئیں۔
”اتنے خوش نصیب تو ”صاحب“ بھی نہیں

ہیں، ان کے لیے تو آپ ہر وقت اپوزیشن بنی رہتی ہیں۔ مجال ہے جو ان کی کسی بات سے اتفاق کر لیں۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے تو آپ فوراً تردید کرتی ہیں کہ نہیں سورج صاحب تو ایسٹ سے طلوع ہوتے ہیں یا پھر پچھم سے رونق افروز ہوتے ہیں۔“ اصغر ہنسنے لگا۔ ”بخدا اپنی خوش نصیبی پر رشک آ رہا ہے۔“

”زیادہ کھی کھی کھی نہ کر، تیرے صاحب کے بارے میں اب کیا کہوں، اللہ کسی کو بھی بیک وقت جنرل اور دانش ور نہ بنائے۔ افسر بنائے تو دانش ور نہ بنائے، دانش ور بنائے تو افسر نہ بنائے۔ بھی شوہروں والی کوئی بات ہی نہیں کرتے یا تو افسری بگھارتے رہتے ہیں پھر اس پر دانش وری کا تڑکا لگا دیتے ہیں۔ بے چاری بیوی جائے تو کہاں جائے۔“ اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے وہ دل گرفتہ ہو گئیں۔

”ایسا لگ رہا ہے بیگم صاحبہ! جیسے ہم آپ کی سہیلی ہیں، جس کے آگے شوہر کی برائیاں کر کے جلے دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی ہیں۔“ اصغر کی پھر ہنسی چھوٹ گئی۔

”زیادہ بکواس نہ کیا کر، اپنی فضول باتوں میں الجھا لیا مجھے، جو کہنے آئی تھی وہ تو ایک طرف رہ گیا۔“
”لو بھئی، یہ تو پھر فوجی حکومت ہو گئی، جس مقصد کا دعوے کر آتی ہیں وہ تو ایک طرف رہ جاتا ہے، دوسرے وہی تباہی معاملات میں ٹانگیں اڑا دیتی ہیں۔“

”تو کیوں فوجی حکومتوں کے پیچھے پڑ گیا ہے،

اب تو ہر آنے والا سربراہ پہلے یہ ہی یقین دہانی کراتا ہے کہ ہم بیرک میں ہی رہیں گے، ایوانِ صدر میں نہیں پھر ہاتھ میں چھڑی پکڑتے ہیں اپنے عہدے کی..... اور دیے ٹوٹنے ہماری سول حکومتوں کے چھن نہیں دیکھے کیا؟ یہ کون سا دودھ کی دھلی ہوئی ہیں؟“
”بیگم صاحبہ! میری روٹیاں پک گئیں، اس لیے آج کا یہ ٹاک شو ہمیں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اگلی ہفتے بازی کے لیے اجازت دیجیے، خدا حافظ۔“ اصغر نے آخری روٹی ہاٹ پائٹ میں رکھتے ہوئے اعلان کیا اور سنک کے ٹل سے ہاتھ دھونے لگا۔

”مردود..... اپنا مطلب اور مرضی ہو تو بک بک کرتا رہتا ہے، سننے کی باری آئے تو سنک لیتا نہ۔“ بیگم صاحبہ کا پارہ چڑھ گیا۔
”ٹی وی شو میں اکثر ایسکر یہ ہی کرتے ہیں،

آپ روزانہ دیکھتی تو ہیں اور ویسے بیگم صاحبہ!“ اصغر ہاتھ صاف کرتے ہوئے یک یک سنجیدہ ہو گیا۔
”جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ آپ نے آتے ہی ہمیں نابکار کے لقب سے پکارا اور اب اختتامِ مردود پر کر رہی ہیں۔ ہمیں شک ہو رہا ہے کہ آپ نے دھرنے والے مولانا صاحب کے دستِ خاص پر بیعت کر لی ہے۔“

”بے غیرت، دو القاب ہی تو دیے ہیں تجھے، کون سا دشنام طرازی پر پوری کتاب تصنیف کر دی ہے جو ایسے طعنے دے رہا ہے۔“ بیگم صاحبہ غصے میں لال پھلی ہونے لگیں۔

”اچھا، اچھا بیگم صاحبہ! آپ وہ بات بتائیں جس کے لیے آپ کی تشریف آوری ہوئی تاکہ ہم

پھر کھانا لگائیں۔“ اصغر نے جھٹ سیز فائر کر کے امن عامہ کی صورت حال بہتر کی۔

”اس موئے کرائے دار سے کرایہ تو لے کر آ، دو مہینے ہو گئے ہیں۔ مستند کرایہ دینے کا نام ہی نہیں لے رہا۔“

”آپ کو صاحب نے منع بھی کیا تھا کہ پولیس والے کو کرائے پر گھر نہ دیں مگر آپ تو بالکل ہی ٹرمپ بن جاتی ہیں بھی۔ پنچوں کا فیصلہ سر آنکھوں پر نہیں بلکہ کوڑے دان میں، پر نالہ تو وہیں گرے گا جہاں ہم چاہیں گے، چاہے وہ ہمارے کے گھر اندر ہی کیوں نہ کرے۔“

”بد ذات.....“ طفر کے تیر نہ چلا، طلال چوہدری اور دانیال عزیز کی طرح۔ کام کی بات کر۔“ بیگم صاحبہ بلبلاتی۔

”کام کی بات یہ ہے کہ پولیس والے کو کرایہ دار رکھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”میں نے تو اس لیے رکھ لیا کہ ان کے پاس پیسے بہت ہوتے ہیں، وقت پر کرایہ مل جائے گا۔“

”مل گیا پھر کرایہ؟“

”ٹو جا کر لے آ۔“

”نہیں بھئی، میں ان کا وٹنر موت نہیں مرنا

چاہتا، ابھی میں نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے سوائے چار پانچ چھوٹی موٹی جمہوری اور دو چار لمبی لشکری حکومتوں کے۔“

”کناریہ تو بس اردو غزل میں چننا ہے، گفتگو میں نہیں سمجھا۔“ بیگم صاحبہ نے لفظ لشکری استعمال کرنے پر اسے آڑے ہاتھوں اور ٹیڑھی نظروں میں لیا۔

”بیگم صاحبہ! بات پھر کہیں کی کہیں جارہی ہے۔“

”تو ابھی شام میں جا اور کرایہ لے کر آ۔ میرا حکم ہے یہ۔“

بیگم صاحبہ بیگماتی آرڈیننس نافذ کر کے چل دیں، اصغر بے بس عوام کی طرح منہ ٹکٹے لگا تھا۔

☆☆☆

کھانا لگا کر وہ خود کونے میں رکھے اونچے سے اسٹول پر بٹک گیا۔ ٹانگیں اور منہ دونوں لٹکے ہوئے تھے۔

”کیا ہوا اصغر میاں! کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟“ دلدار صاحب نے نوالہ توڑتے ہوئے اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

”بیگم صاحبہ نے شام میں خودکشی کا حکم دیا ہے، اب نوالہ کسے حلق سے نیچے اترے گا۔“ اصغر کا منہ اور لٹک گیا، لہجے میں رقت آ گئی۔

”کم بخت کی لفافی دیکھو، میرا کا بھائی نہ ہو تو.....“ بیگم صاحبہ نے نوالہ چباتے ہوئے اسے بھی جیسے اپنے دانتوں تلے چبایا۔

”خدا کے واسطے بیگم صاحبہ! ہمیں کسی ہیروئن کا بھائی نہ بنائیے، چاہے وہ میرا ہی کیوں نہ ہو۔“ اصغر نے سچ سچ ہاتھ جوڑ دیے۔

”اصغر میاں.....“ بڑے صاحب عدالت عظمیٰ بن گئے، اسے ایک گھوری دی بلکہ آنکھوں سے تہمت کی۔

”صاحب! بیگم صاحبہ نے حکم دیا ہے کہ کرایہ لے کر آؤ، شیر کی کچھار میں معصوم ہرن کو بھیج رہی ہیں۔“ اصغر ایسے مظلوم و مجبور بن رہا تھا جیسے اقتدار سے محروم حکمران۔

”چلے جاؤ اصغر میاں! کرایہ لا کر بیگم صاحبہ کو دے دو۔“

”ارے بھئی، سب پولیس والے ایک سے نہیں ہوتے، میرا خیال ہے کہ ہمارے کرایہ دار ایک شریف پولیس مین ہیں۔“ بڑے صاحب نے پانی گلاس میں انڈیلا۔

”شریف ہیں تو سوکھی تنخواہ میں پھر ردھی سوکھی ہی کھا سکتے ہیں، کرایہ کہاں سے دیں گے؟“ اصغر نے وہیں کے وہیں بات ختم کرنی چاہی مگر وہ کوئی کپتان خان تھوڑی تھا جو یوں آسانی سے چھوٹ جاتا۔

بیگم صاحبہ نے پانی کا گلاس میز پر پٹچا۔

”بہت شوخیاں دکھا رہا ہے مردود! شیخ رشید سمجھ رہا ہے خود کو، ابھی سیدھا کرنی ہوں تجھے۔ کان

بھول کر سن لے، کرایہ لے کر نہ آیا تو یہ کرایہ تیری تنخواہ سے پورا کروں گی۔“ وہ دھمکیاں دینے لگیں۔

”اس تنخواہ سے جو مجھے ملتی ہی نہیں؟“ اصغر نے بڑی معصومیت سے سوال کیا تھا مگر بیگم صاحبہ پھر اتنے سے اکھڑ گئیں۔

”کم بخت، تنخواہ نہیں ملتی تو کیا فی سبیل اللہ کام کرتا ہے۔ جیسے کینیڈا سے ”وہ“ آتے ہیں یہاں، فی سبیل اللہ سیاست کرنے اور فی سبیل اللہ دھرتا دینے۔“ بیگم صاحبہ کا غصہ اصغر سے شروع ہو کر کینیڈین نژاد پاکستانی سیاست دان تک جا پہنچا۔

”اصغر میاں! دیر سویر سے ہی سہی، مگر تنخواہ مل تو جاتی ہے نا۔“ بڑے صاحب نے اپنی بیگم اور اصغر خان کے درمیان مصالحتی کردار ادا کیا۔

”جیسے سیاسی کلینڈر میں نوے دن گیارہ سال بن جاتے ہیں ایسے ہی میری ماہانہ تنخواہ، سالانہ ملتی ہے مجھے۔ ایک مہینہ ایک سال کے برابر۔“ اصغر مسلسل پیر ہلا رہا تھا اور ترنت بول رہا تھا۔

”اچھا، اپنے پیر ہلانا تو بند کر، ہماری اماں کا قول ہے کہ اس سے نحوست پھیلتی ہے گھر میں۔“ اصغر کے سچ کو تسلیم کرنے کے بجائے وہ جھنجھلا کر اس پر برس پڑیں۔

”خدا جانے ہمارے ملک میں کون لوگ مسلسل ٹانگیں ہلا رہے ہیں جو نحوست ہے کہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہی۔“

”میاں اصغر! ہمارے ملک کی نحوست ٹانگیں ہلانے سے نہیں، ٹانگیں اڑانے سے ہے۔ اڑوس پڑوس اور سات سمندر پار کی ٹانگیں، لات مار کر باہر نکال دیں نا تو ساری نحوست ختم ہو جائے۔“

”صاحب! آپ کے اس اقوال زریں کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہاں کے چپے چپے اور محکمے محکمے میں ”معصومیت“ بکھری ہوئی ہے اور سارا قصور بس ماہر والوں کا ہے۔“

”یہ بات نہیں، میرا مطلب.....“

”آپ دونوں اپنا یہ ٹاک شو بعد میں کرنا، پہلے میری بات سنیں۔“

بیگم صاحبہ نے جھنجھلا کر شوہر نامدار کی بات کاٹی (شکر ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کی بات سن کر بات کاٹنے سے زیادہ زبان کاٹنے کو دل کرتا ہے)۔

”اچھا بھئی، پہلے ان کی بات سن لو اصغر میاں!“ صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ اور پانی کا گلاس ایک ساتھ بھرے۔ ہر بے چارے شوہر کی طرح انہیں بھی اپنی بیگم کے سامنے بولنے کا موقع ذرا کم ہی ملتا تھا۔

”آپ ہی سنیں، میں تو نوکر ہوں، شوہر تھوڑی ہوں۔“ آخری فقرہ اصغر نے دل ہی دل میں کہا، بیگم صاحبہ سے بعید نہ تھا کہ زبان کے تیر چلا چلا کر اسے زخمی کر دیتیں۔

”یہ کم بخت تو نخرے دکھا رہا ہے، آپ ایسا کریں کہ جا کر کرایہ لے آئیں اور پھر اس پولیس والے کو نکال دیں، بہت ہی تنگ کر رہا ہے۔“ بیگم صاحبہ کی توپوں کا رخ ”صاحب“ کی طرف ہو گیا جو اس حکم کو سن کر ہی سر اسیمہ ہو گئے۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ”پولیس والے“ کو تو وزیر اعلیٰ سندھ بھی نہیں نکال سکے، مجھے معمولی بیس گریڈ کی افسر کی کیا مجال۔ میں تو اس بھاری پتھر کو اٹھانا تو درکنار ہلا بھی نہیں سکتا۔“

صاحب کے ایسے انکار پر جیسے امریکہ نے پاکستان کی مزید امداد پر کیا ہے، بیگم صاحبہ فقط انہیں آنکھیں ہی دکھا سکیں (ہمارے ہاں تو کوئی یہ بھی نہیں کرتا)۔

”بس ٹھیک ہے، اصغر تم شام میں جاؤ گے اور کرایہ لے کر آؤ گے۔“ کمہار پر بس نہ چلا تو بیگم صاحبہ نے گدھے کے کان مروڑ دیے۔

☆☆☆

اصغر شام میں صاحب کے پاس آیا۔

”صاحب! گھر سے نکلنے سے پہلے آیت

۶۹

ماہنامہ شعلہ اپریل ۲۰۱۸

۶۸

ماہنامہ شعلہ اپریل ۲۰۱۸

۶۸

ماہنامہ شعلہ اپریل ۲۰۱۸

الکری تو پڑھ دیں۔“
”اصغر میاں! آیت الکری کسی کام پر جانے سے پہلے پڑھی جانی ہے، یہ بھی پہلے وقتوں کی بات ہے۔“ صاحب مسکرائے۔

”ہم بھی سفر پر ہی جا رہے ہیں اردو کے نہیں بلکہ انگریزی کے۔“ اصغر نے منہ بسورا۔

”چلے جاؤ اصغر میاں! اللہ مالک ہے۔“
”ہاں ہاں، آپ بھی یہ ہی کہیں گے، چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کرے گا۔“ اصغر میاں بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔

”اللہ کسی کو اکلوتی اولاد بلکہ اکلوتی بیٹی نہ بنائے اور بنائے تو جہنم میں مکان نہ دلوائے۔ مکان بیگم صاحبہ کا، کرایہ ان کا، کرایہ دار میرے متھے لگا دیا۔ جاؤ جی ”مشن امپاسیبل“ پر، ٹام کروڑ کو تو مشن امپاسیبل کے لیے کئی بلین ڈالر ملے تھے۔ یہاں تو لگ رہا ہے الٹا اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑے گا۔“ اصغر تمام راستے بڑبڑاتا رہا۔

مطلوبہ مقام (اصغر کے الفاظ میں جائے قتل) پر پہنچا تو گھنٹی۔ کے جواب میں اندر سے کسی خاتون نے آ کر دروازہ کھولا۔

”جی فرمائیے۔“ نرم، شائستہ، نسوانی آواز سن کر اصغر میاں کی جان میں جان آئی۔

”جی مجھے دلدار صاحب و بیگم دلدار نے بھیجا ہے، دو ماہ کا کرایہ لینے۔ میں ان کا خاص الخاص اور اکلوتا ملازم ہوں، میرا نام اصغر ہے۔“ اس نے آ نکھیں بند کر کے سارا آ موختہ بنا دیا۔

”ارے تم اصغر ہو، اصغری بوا کے پوتے؟“
خاتون کی بات پر اصغر کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

”جی..... آپ..... آپ کون ہیں؟“ اصغر میاں تذبذب میں پڑ گئے۔ ایک نظر میں تو خاتون کو پہچان نہیں سکا تھا اور غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرنا یقیناً بدتہذیبی ہوتی۔

”میں فرحین آپا ہوں، تمہاری پڑوسن۔ جب تم تیسری بار میٹرک میں فیل ہوئے تھے تو میری شادی ہوئی تھی۔ میں نے تو خیر اسی سال پہلی بار میں ہی میٹرک کلیئر کر لیا تھا، آؤ اندر آؤ، چائے پی کر جانا۔“ سارے انکشافات ایک ہی سانس میں کر کے وہ اندر چل پڑیں۔

اصغر ان کے نقش قدم پر یوں چل پڑا، جیسے لالی وڈ لباس کے معاملے میں بالی وڈ اور ہالی وڈ کے پیچھے پیچھے ہے بلکہ تقریباً ہم سفر ہی ہو گیا ہے۔

ایک سادہ سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے وہ فرحین آپا کی رام کہانی سن رہا تھا۔

پچھلے ماہ یہ اے ٹی ایم سے تنخواہ نکال کر گھر آ رہے تھے، دو لڑکوں نے گن پوائنٹ پر چھین لی۔“
”لو بھی چوروں کو مور بڑ گئے۔“ اصغر دل ہی دل میں استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔ فرحین آپا اس کے خیالات سے بے خبر اپنی بولے جا رہی تھیں۔

”یہ اس وقت وردی میں نہیں تھے، پستول بھی پاس نہیں تھا۔ خیر ملزمان کا تو حسب معمول کچھ پتا نہیں چلا، ہم نے ادھار قرض کر کے جیسے تیسے مہینہ گزارا۔ اب اس ماہ کی تنخواہ ابھی ملی نہیں، جیسے ہی ملے گی، کرایہ بھجوا دیں گے۔“

”ایک بات پوچھوں آپا؟“ اصغر نے ان کے حالات سن کر اور گھر کے مجموعی حال کو دیکھ کر چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ کے شوہر نامدار تنخواہ پر ہی اکتفا کرتے ہیں کیا؟ کبھی اوپر کی طرف دھیان نہیں دیا۔“ سوال گول مول لفظوں میں تھا مگر فرحین آپا کسی وزیر تعلیم کی طرح کوڑھ مغز تھوڑی تھیں، سنجیدگی سے بتانے لگیں۔

”میرے سر بھی پولیس میں تھے، ڈاکوؤں سے پولیس مقابلے (اصلی، جعلی نہیں) میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے کو نوکری مل گئی، یہ کہتے ہیں کہ کوئی غلط کام کر کے باپ کی شہادت کو بدنام نہیں کروں گا۔“ فرحین آپا نے بولتے بولتے

اتے دیکھا اور مسکرائیں۔

”ویسے ہمارا گزارا ہو جاتا ہے، ہم نے اپنی نوادہاٹ اور ضروریات کو محدود کر دیا ہے۔“

”میرا خیال تھا کہ آج چھٹی کا دن ہے، اتنے ”عظیم بھائی جان سے ہماری ملاقات ہو جانی۔“

”ارے پولیس والوں کی کیا چھٹی، کیا عید تہوار۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی دیوٹی لگی ہی رہتی ہے۔“

”نچ میں چھٹی مل جائے تو مل جائے۔ اب دیکھ لو، آج چھٹی کا دن ہے مگر کوئی وی آئی پی مودمنٹ ہے، ڈیوٹی لگ گئی۔ ہماری طرف سے معذرت کر لینا، تنخواہ ملتے ہی کرایہ پہنچا دیں گے۔“ فرحین آپا کے لہجے میں ایسی لجاجت تھی کہ اصغر کو شرم سی آنے لگی، چائے پی کر وہ فوراً اٹھ گیا۔

گھر جا کر بیگم صاحبہ اور صاحب کو رو داد سنائی۔ ”چلو دیکھ لیتے ہیں دو چار دن اور۔“ بیگم صاحبہ بے دلی سے گویا ہوئیں۔

”ایسا کرو اصغر میاں! ان سے کہنا کہ ایک ماہ کا کرایہ دے دیں اور باقی جب آسانی ہو تب دے دیں۔“ خلاف توقع بیگم صاحبہ نے صاحب کو جھٹلانے یا بحث کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی اور جاننے والے جانتے ہیں کہ خاموشی نیم رضا۔ اگر کپتان خان اور محترم زرداری صاحب کینیڈین سیاست دان کے بنائے ہوئے اسٹیج پر یکے بعد دیگرے تقاریر کر سکتے ہیں تو بیگم صاحبہ اپنے مجازی خدا سے اتفاق کیوں نہیں کر سکتیں آخر ان کا قصور ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ وہ ایک شوہر ہیں۔



لکھتے لکھتے صاحب تھک گئے تو کچھ دیر موسیقی سے دل بہلانے لگے۔ آنکھیں بند کیے اسی سرور میں گم تھے کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا یعنی اصغر میاں کی آمد ہو گئی۔

”صاحب۔“ وہ پھسکا ہمارا کرا لین پر بیٹھ گیا۔ ”اونہوں.....“ انہوں نے بد مزاج ہو کر آنکھیں

کھول دیں، پہلے موسیقی بند کی پھر اپنا منہ کھولا۔

”اس وقت آپ کی وجہ نزول جان سکتا ہوں؟“
”ہمارا کام ختم ہو گیا ہے، بیگم صاحبہ گھر پر نہیں ہیں، بور ہو رہے تھے بہت۔ اس لیے سوچا کہ آپ سے ہی دو چار باتیں کر لیں۔“

”میاں، ہمیں کیا دربار اکبری سے وابستہ ہیریل سمجھا ہوا ہے، جو آپ کی بوریت دور کریں گے؟“ صاحب کا لہجہ ذرا طنزیہ ہو گیا۔

چودھری ثار بن رہے تھے اور اصغر کو غالباً چودھری پرویز رشید سمجھ رہے تھے، مگر اصغر میاں اپنے بروں پر کہاں پانی پڑنے دیتے تھے فوراً موضوع کی طرف آ گئے۔

”ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو موسیقی سے زیادہ دلچسپی ہو گئی ہے؟“

”ہاں میاں! موقع ہی اب ملا ہے اور ویسے بھی کچھ عادت سی پڑ گئی ہے سننے کی۔ چاہے وہ سرکار ہو، موسیقی ہو یا بیگم۔“ انہوں نے تین مختلف ستانے والوں کو ایک کوزے میں بڑی مہارت سے بند کیا۔

”تینوں سے کچھ بھی سن لیتے ہیں آپ۔“
اصغر نے اپنی مخصوص کھی کھی کی۔ ”سرکار سے بے پر کی، بیگم سے واپسی تباہی اور موسیقی میں ظہور، سارنگی ستار، حتیٰ کہ طلبہ بھی سن سن کر سر دھنتے ہیں۔“

”تو گدھی کہہ کر کی تجھے رام سے کیا کام۔“
صاحب نے اصغر میاں کو ایسی حقارت بھری نظروں سے دیکھا جیسے ایکشن جیتنے کے بعد سیاست دان، عوام کو دیکھتا ہے۔

”تم کیا جانو میاں! طلبہ کا مقام، تمام سازوں میں الگ ہی ہے۔ سارے ساز اکیلے ہی بجتے ہیں اور.....“

”ہاں جیسے دنیا بھر کے مسلم ممالک، سب کی اپنی ڈھلی، اپنا راگ، ہر کوئی ماضی سے نا آشنا، حال سے بے خبر اور مستقبل سے لاپرواہ۔ اپنی اپنی پسند کے کونے میں منہ دیے، اپنی مرضی اور مطلب کا راگ

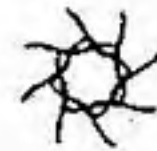
کے بارے میں؟“ اصغر مرعوب ہوا۔
”بذات خود نہیں، بقلم خود، ان کی کتاب میں
پڑھا تھا بھی۔ اب جاؤ، تمہاری بیگم صاحبہ کی آواز
آ رہی ہے، ان سے باتیں سنو۔“ صاحب نے اصغر
کو وہاں سے پہلے اٹھایا پھر بھگایا جیسے اردو غزل کے
بعض اشعار کی رو سے ظالم حسینا میں اپنے عاشقوں
کو بھری محفل سے اٹھاتیں اور پھر بھگاتی ہیں۔

☆☆☆

جس دن ایک ماہ کا کرایہ آیا اس کے اگلے روز
فرحین آپا کے شوہر پولیس ٹریننگ سینٹر میں ہونے
والے بم دھماکے میں شہید ہو گئے۔
وردی چاہے خاکی ہو یا گہری نیلی۔ اسے پہن
کر جو کوئی ملک و قوم کے لیے جان دیتا ہے، اس کی
یکساں تعظیم و تکریم سب پر واجب ہے۔ میڈیا کے
شاید اپنے قواعد و ضوابط ہیں، کسی رنگ کی وردی میں
ملبوس شہادت خاص اہمیت کی حامل اور کسی رنگ کی
وردی میں ملبوس شہید عام اہمیت کا حامل۔ رتبہ اور
جزا اللہ دینے والا ہے، دنیا والوں کو اپنا فرض ایمان
داری سے انجام دینا چاہیے۔

☆☆☆

صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد کارسرخ میں بسر
ہونے والی زندگی کا اعمال نامہ ایک کتاب کی
صورت میں مرتب کر رہے تھے۔ ایک تازہ باب کا
اختتام ان لفظوں پر کیا۔
”بھئی، کسی نے محاورہ ایجاد کیا تھا ”ناچ نہ
جانے آنگن ٹیڑھا“ وہ اگر آج کے زمانے میں ہوتا
تو کہتا کہ ناچنا تو سب کو آتا ہے اور سب خوب ناچ
بھی رہے ہیں مگر آنگن پھر بھی ٹیڑھا کا ٹیڑھا۔“



الاب رہا ہے۔“ اصغر میاں نے بڑی بے صبری سے
ان کی بات کاٹ کر اپنی دانش وری جھاڑی۔
”عمومی تنقید نگاروں کی طرح مکمل تصنیف
پڑھے بغیر تعریف یا تنقید کرنے مت بیٹھ جایا کرو۔ پہلے
میری پوری بات سنو، پھر کچھ کہنا۔“ صاحب نے ڈانٹ
کر سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے ختم کیا تھا۔
”ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ طلبہ باقی سازوں
کی طرح لنڈ ورائیں بچتا، اپنے جوڑی دار کے ساتھ
جوڑی اور رنگ جماتا ہے۔ تمہیں تو علم بھی نہیں ہوگا،
انسانوں، جانوروں اور پودوں کے بعد یہ واحد ساز
ہے جس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں۔“ صاحب نے
اپنی علمیت بگھاری اور اصغر میاں کا حیرت سے کھلا
منہ دیکھ کر لطف اندوز ہونے لگے مگر اصغر کے جوابی
جملے نے ان کا مزہ توڑ کر کرادیا۔
”اچھا، تب ہی میں کہوں کہ بعض چچی ایک چلی
پر تو ایسے پیار سے ٹھیکا بجاتے ہیں گویا کہ محبوبہ دل
نواز اور دوسرے کو اس بری طرح رگیدتے ہیں جیسے
کہ رقیب، یقیناً اس میں سے اول الذکر مادہ اور موخر
الذکر نر ہوتے ہوں گے۔

ویسے آپ کو کس نے بتایا کہ طلبہ میں نر اور مادہ
ہوتے ہیں؟“ سر ہلاتے ہلاتے اصغر میاں نے حسب
عادت سوال کر ڈالا، ٹاک شوکا۔ نکر نہ ہو تو.....

”یوسفی صاحب نے بتایا تھا۔“

”یہ اپنے کونے والے یوسفی صاحب؟ جن
کے آنگن میں نیم کا پیڑ لگا ہے۔ اسی کڑوے درخت
کی چھاؤں میں بیٹھ کر میٹھی زبان سے اپنے ماضی
کے قصے کہانیاں دہراتے رہتے ہیں۔“
”ہاں یہ سب یعنی نیم کا درخت، میٹھی زبان
اور ماضی کی کہانیاں یوسفی صاحب کے ہاں ہیں مگر یہ

ہمارے محلے والے نہیں۔ بہت مشہور لکھاری ہیں
مشتاق احمد یوسفی۔“ صاحب نے اصغر میاں کی
معلومات میں اضافہ کیا۔

”انہوں نے بذات خود بتایا تھا آپ کو طلبے



عقیدہ الوب

تیری لاکھ میں تیری چاہ میں

لیٹے وجود پر بڑی تھی۔ روشنی کے باوجود اس کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی، وہ ویسے ہی بازو آنکھوں پہ رکھ کے لیٹا ہوا تھا۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھی اور سائڈ ٹیبل پر رکھا ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔ وہ ابھی بھی ساکت تھا۔ مطلب وہ واقعی سو گیا تھا اور وہ جو کھانے کے لیے اسے بلانے آئی تھی، آہستہ سے چلتے ہوئے اس کے پیروں میں آ بیٹھی اور بہت احتیاط سے اس کے جوتے اتارنے لگی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے وہ شاید ستانے کے لیے لیٹا تھا، جوتوں سمیت، لیکن اب نیند کی وادیوں میں جا چکا تھا۔ جوتے اتار کے اس نے ایک طرف رکھے، نگلیہ درست کیا اور پھر کیل اڑھانے لگی تو ٹھنک گئی۔

گردن پر چمکتا براؤن تل..... وہ جب بھی اسے دیکھتی تھی ایسے ہی ٹھنکتی تھی۔ عجیب سے انداز میں وہ اسے اپنی طرف کھینچتا تھا، ایک ٹھنڈی سانس بھر کے اس نے کیبل اس پر اچھی طرح ڈالا اور بے بسی سے دوبارہ اس کے چہرے کو دیکھا جس پر بھی آنکھیں اس نے بازو رکھ کے چھپائی ہوئی تھیں۔ گویا نیند میں بھی کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ ان آنکھوں کو پڑھے، ٹھیک ہی تو کرتا تھا وہ، کوئی جو ان کو پڑھ لے تو بس پھر ساری عمر اسی کتاب کو پڑھنے میں لگا دے اور کہیں کا نہ رہے.....

”زیب!“ باہر سے آئی آواز پر وہ جو یک ٹک ہمیشہ کی طرح سب کچھ بھلائے اس کو دیکھ رہی تھی ہوش میں آئی اور ٹھنڈی سانس بھر کے لاسٹ بجھا کر

”میری زندگی کے مالک، میرے دل پہ ہاتھ رکھ دے۔“

کمرے میں داخل ہوتے ہی دھیمے سروں میں بچتا میوزک اس کے کانوں سے لگرایا۔

”تیرے آنے کی خوشی میں..... میرا دم نکل نہ جائے۔“

وہ حیران ہوئے بغیر سوچ بورڈ کی طرف بڑھی اور لاسٹ جلادی۔ روشنی ہوتے ہی اس کی نظر بیڈ پر

ناؤلٹ



دروازہ بند کرتی باہر آ گئی۔

”بھائی نہیں آئے؟“ عائشہ نے راستہ دسترخوان پر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ سو گئے ہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور برتن سیٹ کرنے لگی۔

”آئے ہائے، کھانا کھائے بغیر ہی سو گیا میرا بیٹا!“ اماں بھی سن کر تسبیح ہاتھ میں پکڑے باہر آ گئی تھیں۔

”مجال ہے جو اس گھر میں کبھی اس کے آنے سے پہلے بنا ہو کھانا، بچہ تھکا ہوا آتا ہے ویسے ہی سو جاتا ہے۔ بس کل سے میں خود ہی پکا لیا کروں گی روٹی، ابھی اتنی ہمت ہے مجھ میں..... لو بیٹاؤ بھلا، دن بھر کا بھوکا پیاسا.....“

وہ بڑبڑاتے ہوئے ”بچے“ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں جب کہ وہ دونوں مسکراہٹ دہانی باقی کے لوازمات دسترخوان پر سجانے لگیں۔ جانتی تھیں اماں ابھی واپس آ جائیں گی، وہ بھی صرف ان کے سامنے ہی بول سکتی تھیں، اپنے پیارے بیٹے کے غصے سے وہ بھی خائف ہی رہتی تھیں لیکن ماں تھیں اس لیے دیکھے بغیر سکون سے بیٹھ بھی نہیں سکتی تھیں۔

☆☆☆

صاف ستھرے کھلے محن میں نفاست سے سجے پودے، برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھی اماں اور محن سے چھن چھن کر آتی سردیوں کی نرم دھوپ..... اسے عجیب سا سکون اپنی روح کے اندر اترتا محسوس ہوا۔ وہ وہیں اماں کے پاس تخت پر آ کر بیٹھ گیا، اماں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھا۔

”میرا بیٹا.....!“ وہ کھل اٹھی تھیں، ساتھ ہی کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا۔

وہ مسکراتا ہوا موبائل نکال کے دیکھنے لگا، چار ہزار..... وائس ایپ میسجز دیکھ کر اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔

”حد ہو گئی، فارغ ہی ہیں لوگ بھی۔“ اس

نے جھنجھلا کر موبائل ویسے ہی سائڈ پر رکھ دیا اور نیم دراز۔ ہو کر دھوپ کے ساتھ ساتھ اماں کی اندر سے آتی آواز سننے لگا جو اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں اور اب اندر بھونچال آیا ہوا تھا۔

”ارے میں کہتی ہوں کسی کو کوئی خیال ہے بھی یا نہیں..... ناشتے کی راہ دیکھ رہا ہے وہ بیٹھا۔ ان کو ڈراموں سے فرصت نہیں۔“ اماں ان کے سر ہو گئی تھیں۔

”اللہ اللہ آئی..... بیٹھ جائیں ادھر۔“ زینب نے بوکھلا کر انہیں صوفے پر بٹھایا۔

”پراں ہٹ۔“ انہوں نے ہاتھ جھٹکا۔ ”مجھے کچن میں جانے دے، میں خود ہی بنالوں گی ناشتا۔“ وہ بچوں کی طرح روٹھ کے بیٹھ گئی تھیں۔

”اماں! بس بھی کریں، بھائی چھٹی والے دن ویسے ہی لیٹ ہی کرتے ہیں ناشتا۔ آج پتا نہیں کیسے جلدی اٹھ گئے۔“ عائشہ نے فیڈر حرم کے منہ میں ڈالتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔

”ریلیکس ہو جائیں آئی! میں بس جانی رہی تھی ناشتا بنانے۔“ زینب نے پھر سے انہیں رام کرنا چاہا۔

”ارے اچھی دہن ہو تم بھی..... نہ کہیں سے لگتی ہو نہ کچھ اور..... نہ چوڑی نہ بالی۔“ ان کی نظر اب زینب کے ہاتھوں پر۔ گئی تھی جو اس نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے ان کے کندھے پر رکھے تھے۔ ان کے ٹوکے پر اس نے گڑبڑا کے ہاتھ پیچھے کیے اور مدد طلب نظروں سے عائشہ کو دیکھا۔

”اماں..... میری پیاری اماں..... حرم بہن مشکل سے سوئی ہے پلیز! بس کریں۔“ اس نے اب لاڈ سے ماں کو کہہ کے ان کا دھیان ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ بھی اماں تھیں، ان کی ذہنی رو جس طرف ہو جاتی پھر وہاں سے ہٹنا مشکل ہو جاتا تھا۔

”کا ہے بس کروں، لے دس..... ایسی ہو ہے کوئی دہن، آج کل تو نہ بیاہی کا چہا، نہ بن بیاہ

”وہ پھر سے شروع ہو گئی تھیں۔ زینب بے بس لیاں لپیٹے کچن کی طرف دوڑی اور تیزی سے ناشتا بنانے لگ گئی۔ اماں کی بڑبڑاہٹ البتہ اب بھی ہماری تھی۔

☆☆☆

”بھابھی!“ منزہ کی آواز پر وہ حیران سی اس کی طرف مڑی اور موبائل بند کر دیا۔ منزہ اپنے بھائی کی طرح ہی کم گو تھی، اس لیے اس کے اس طرح مخاطب کرنے پر وہ حیران ہوئی تھی۔ ورنہ تو ان تین ماہ میں جب بھی بات کی اس نے خود ہی بات کی منزہ سے۔

”آؤ منزہ! اندر آ جاؤ۔“ وہ اپنی روایتی خوش اخلاقی سے بولی۔ منزہ کنفیوز سی چشمہ سیٹ کرتی اندر آ گئی۔

”وہ بھابھی.....“ اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے بات شروع کرنا چاہی۔

”کیا بات ہے منزہ! ریلیکس ہو کر بیٹاؤ۔“ وہ بیٹھ کر اس کے پاس صوفے پر ہی آ گئی۔

”بھابھی! ایک کام تھا آپ سے، کر دیں گی ناں؟“ وہ معصومیت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، زینب کو بے ساختہ اس پر پیار آیا۔

”میری جان!“ اس نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”کیوں نہیں کروں گی بھلا، بتاؤ تو کیا کرنا ہے؟“ اس نے تسلی دی۔ منزہ کے ہاتھ پر تھوڑا سا سکون کا احساس ابھرا تھا۔

”وعدہ کریں پلیز۔“ اس نے مزید تسلی مانگی۔

”وہ..... پکا وعدہ..... گاڈ پرامس۔“ وہ طمطمان ہوئے بولی۔

”بھابھی! وہ اصل میں..... یہ کام کوئی بھی نہیں کر سکتی ہیں۔“

”ارے.....“ وہ حیران ہوئی، ایسا کون سا

کام تھا بھلا۔

”بھابھی وہ ہماری کلاس ٹرپ پر جارہی ہے مری، ایک ہفتے کا ٹرپ.....“ وہ کہتے کہتے رکی۔ ”بھابھی! مجھے جانا ہے پلیز.....“ وہ روہا نسی ہو گئی تھی۔

”ارے.....“ اس نے بے اختیار اسے ساتھ لگالیا۔ ”ہاں تو جاؤ..... کس نے روکا ہے تمہیں۔“ وہ حیران ہوئی، جس طرح کے ماحول سے وہ آئی تھی، اس کے لیے یہ بہت عام بات تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ منزہ کے لیے یہ عام بات بہت بڑا مسئلہ ہے۔

”بھابھی..... وہ..... ابراہیم بھائی کی بہن بھی جارہی ہیں۔“ اس نے مزید کھڑا لگایا۔

”ہاں تو تم بھی جاؤ ناں، اس میں مجھ سے کیا کام ہے؟“ وہ اور حیران ہوئی، منزہ نے کنفیوز ہو کر اسے دیکھا۔

”بھابھی وہ..... عمر بھائی..... وہ کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ انہیں یہ سب بالکل پسند نہیں ہے۔“ اصل بات اب اس کی زبان پر آئی تھی، زینب ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔ ”لیکن بھابی! پلیز آپ ان سے اجازت لے دیں پلیز..... میں کہوں گی تو وہ غصہ ہوں گے۔“

منزہ کی بات پر اس نے بمشکل تھوک ٹھکا، وہ اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ منزہ کی بات پر صرف وہ غصہ ہوگا پر زینب کو تو شاید وہ بات کرنے کا موقع بھی نہ دے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کے منزہ کو دیکھا، اپنا بھرم بھی تو رکھنا تھا پھر وہ اتنے مان سے اس کے پاس آئی تھی، زینب الفاظ ہی ڈھونڈتی رہ گئی معذرت کے۔

”بھابھی.....“ منزہ نے اس کا کندھا ہلایا۔

”ہاں.....“ وہ چونکی۔

”بات کریں گی ناں؟“ منزہ کے لہجے کی آواز..... اس نے بے اختیار ہی نظریں پھیر لیں۔

”ہاں کروں گی، ضرور کروں گی اور وہ مان جائیں گے۔ کچھ نہیں کہیں گے، ڈونٹ وری۔“ اس نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی۔ منزہ کے چہرے پر دھنک اتر آئی تھی۔

”تھینک یو..... تھینک یو سوچ بھابھی!“ وہ کھلکھلا کر کہتی باہر چلی گئی جب کہ وہ وہیں بیٹھی اپنی متوقع عزت افزائی سوچ رہی تھی۔

عمر سعید اس کی زندگی میں آنے والا واحد مرد تھا اور مرد بھی ایسا مشکل کہ وہ حلقاً کہہ سکتی تھی ان تین ماہ میں وہ اسے ایک فیصد بھی نہیں جان پائی تھی۔ بظاہر وہ بہت خاموش طبع، کم گو اور نہایت ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ دیکھنے میں بہت ڈسینٹ، نارٹل اور پُرکشش لیکن اس کی خاموشی اتنی رعب والی تھی کہ مقابل کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس میں ذرا سا بھی خلل ڈالنے کی۔ اماں بتاتی تھیں کہ ابا کے بعد کم عمری میں اس پر گھر کی ذمہ داری آگئی تھی۔ خاندان والوں کی عیاریوں اور مکاریوں کا مقابلہ، ہر طرح کے حالات سے اپنے بہن بھائیوں کو دلیری سے بچانے کے اس مقام تک لانے میں اور ذمہ داریاں نبھانے میں اس کی اپنی شخصیت خود بخود ایک خول میں سمٹی چلی گئی تھی گو کہ زینب نے اس کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی اماں سمیت یہاں ہر بندہ ہی اس کے رعب میں تھا۔

اور وہ اعتراف کرتی تھی کہ اس کی خاموشی واقعی اگلے بندے کو چپ کروادیتی ہے۔ وہ خود بے حد پر اعتماد اور بہادر لڑکی تھی، ایک آزاد اور دوستا نا ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہی تھی، کزنز کے ساتھ ہلا گلا، پارٹیاں اور منہ پر سب کچھ بول دینے کی عادت..... وہ کبھی کسی سے نہیں ڈرتی تھی، نہ جھجکتی تھی بلکہ وہ حیران ہوتی تھی کہ لڑکیاں کیوں شرماتی ہیں، کیوں کنفیوز ہوتی ہیں۔

لیکن اتنی بولڈ نہیں کے باوجود بہر حال عمر سعید کے ابا کے دوست کے توسط سے آنے والے رشتے پر

اس نے کوئی اعتراض نہ کرتے ہوئے ہاں کی تھی گو کہ امی کو کچھ تحفظات تھے لیکن ابا نے لڑکا بہت ہی میچور اور ڈسینٹ ہے کہہ کر امی کو چپ کروادیا تھا اور وہ خوش تھی، بہت خوش۔ اس کی تصویر دیکھ کر ہی وہ عجیب سے انداز میں متاثر ہوئی تھی۔

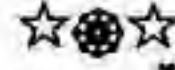
مگر شادی کے بعد پہلے ہی دن بے حد ٹھنڈے لہجے میں کہے گئے فقرے۔

”میری ماں، بہنیں اور بھائی اب آپ کے بھی اتنے ہی سنگے ہیں جتنے میرے۔ امید ہے آپ انہیں سب سے زیادہ اہمیت دیں گی۔“ صرف یہ الفاظ تھے جو اس نے کہہ کے اسے — چپ کرادیا تھا۔ اس کے بعد وہ تین ماہ کچھ بھی نہ بول سکی، تھوڑی بہت بات چیت ہوتی اور بس۔ وہ بھی بھی موقع نہیں دیتا تھا خود کو جاننے کا، حالانکہ اگر دیکھا جاتا تو وہ بہت خیال رکھنے والا شوہر تھا۔ اپنے فرائض سے کبھی بھی غافل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بنا کہے اس کی ہر ضرورت وقت سے پہلے پوری کرتا تھا۔ حقوق و فرائض کا پورا خیال رکھتا تھا۔ اسے خود امی ابا سے ملوانے کے لیے لے کے جاتا تھا اور امی ابا بلکہ سب ہی گھر والے بہت خوش تھے کہ ان کی سب سے لاڈلی اولاد سکون سے ہے۔

پھر زینب نے بھی اسے بلاوجہ غرہ کرتے نہیں دیکھا تھا، وہ کچھ بھی پہن لیتا تھا، کچھ بھی کھالیتا تھا اور کبھی بھی مین میکے نہیں نکالتا تھا، چاہے اماں جتنا بگ بولتی رہیں وہ خود کچھ نہیں کہتا تھا لیکن اس سب سے باوجود ایک دوسرے کے سب سے زیادہ قریہ ہونے کے باوجود وہ اسے نہیں جانتی تھی۔

یہاں اسے سب سے ہی پار ملا تھا۔ اماں عائشہ اس کی بڑی نند جو ایک بیٹی کی ماں تھی ا زینب کی طرح ہی چنے چنے ہانے والی لڑکی تھی، آ کل میکے رہنے آئی ہوئی تھی۔ علی بھائی تھے، اسلام آباد میں جاب کرتے تھے پھر منزہ بھی مگر بے ضرر.....

”میں ضرور بات کروں گی، کھا تو نہیں جائیں گے ناں۔“ اس نے پرانی زینب بن کر خود کو مضبوط کیا اور سدا کرتی کچن میں آگئی۔ دل ہی دل میں ورد اس شروع کر دیا کیونکہ بہر حال وہ جانتی تھی، ایک انداز میں نہ کی تو ہاں میں نہیں بدلے گا پھر۔



آنگن سے جاتی دھوپ اور اترتی شام، اس کا دل منزل سے زیادہ رفتار سے دھڑکنے لگ گیا۔ ”کیا ہو گیا ہے زینب! کیوں اتنی کنفیوز ہو تم، زیادہ سے زیادہ کیا کریں گے، منع کریں گے ناں۔“ اس نے دل ہی دل میں خود کو سمجھایا مگر پھر بھی دل میں اٹک گیا تھا۔

”اگر ناراض ہو گئے تو.....“ اس پر پہلی بار کھلا لہجہ اسے ناراض نہیں کر سکتی، اس کی خاموشی اور قدرے مغرور شخصیت میں وہ ایسا الجھی تھی کہ ہمیشہ اس الجھن میں رہنا چاہتی تھی۔ ان آنکھوں کو پڑھنے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی، قربت کے انتہائی لحاظ میں بھی وہ اس کی پہنچ سے بہت دور چلا جاتا تھا، پتا نہیں کب یہ اجنبیت ختم ہوگی۔

”زینب.....“ عائشہ کی آواز پر وہ ہوش میں آئی اور اسے دیکھا جو حیرانی سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ زینب نے گڑبڑا کر ہاتھ میں پکڑے چائے لے لے آپ کو دیکھا جو کب کا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس نے بے اختیار لب بھینچ لیے۔

عائشہ کی حیرانی بجا تھی، وہ جانتی تھی زینب ہانے کی دیوانی ہے۔ آج کیسے ٹھنڈی کر دی بھلا! لیکن زینب اسے سمجھا نہیں سکتی تھی کہ وہ اب چائے لی نہیں مگر سعید کی دیوانی ہے اور اس کو سوچتے وقت وہ لہو لہول جاتی تو چائے تو بہت دور کی بات تھی۔



ہانے کے کپڑے میں رکھتے ہوئے اس نے اپنے عزم کو تازہ کیا اور مضبوطی سے قدم اٹھانے کی طرف بڑھی۔ اندر سے آتی دھوپ

سروں کی آواز..... اس نے زندگی میں اتنا کلاسیکل میوزک یا غزلیں یا پرانے گانے کبھی نہیں سنے تھے۔ وہ ہلا گلا کرنے والی لڑکی تھی اور ایسے ہی گانے سنتی تھی لیکن عمر کلاسیکل موسیقی سنتا تھا، کبھی کبھی وہ حیران ہوتی تھی کہ بھلا یہ برف جیسا ٹھنڈا بندہ بھی احساسات رکھتا ہے جو ایسی موسیقی سنتا ہے۔ اگر جو کبھی یہ بھی ایسا محسوس کریں جیسا میں ان کے لیے کرتی ہوں تو.....؟ خوشی سے ہی مرجاؤں شاید..... پتا نہیں کس چیز سے متاثر ہوتے ہوں گے، کیا چیز ان کو اٹریکٹ کرتی ہے۔ خوب صورتی تو شاید اتنا نہیں کرتی ورنہ میں اتنی کئی گزری تو نہیں ہوں۔

وہ ایک مرتبہ پھر سوچوں میں مگن کمرے کے بیچ دو بیچ ٹرے لیے کھڑی بے دھیانی میں اسے دیکھتی اپنے خیالوں کی دنیا میں پھنسی ہوئی تھی۔ اگر جو یہ بندہ فرض سمجھنے کے بجائے سچ میں محبت بن کے مجھ پر برسے تو..... سفید شرٹ میں اس کے ماتھے پر آئے بال اور بے تاثر مغرور نقوش، لیپ ٹاپ پر جی گہری اندر تک اترتی آنکھیں..... اس کو کیا پتا ہوگا کہ اس کی بیوی اس پر اتنا مرنی ہے اور.....

”بیٹھ جائیں..... اگر آپ بیٹھ کر بھی مجھے دیکھتی رہیں گی تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔“ اس نے بنا آنکھ اٹھائے اپنے مخصوص ٹھنڈے لہجے میں اسے مخاطب کیا اور وہ جو دھوپ ہوش تھی، بری طرح سے گڑبڑا اٹھی۔ کپڑے میں مل سے گئے۔

اگلے ہی لمحے شرمندگی کی لہر نے اسے لپیٹ میں لے لیا۔

”کیا سوچ رہے ہوں گے..... تو بھی ناں زینب!“ اس نے خود کو ڈپٹ کے چائے اس کے پاس رکھی اور خود صوفے پر بیٹھ کر خود کو سنبھالتی کچھ دیر پہلے کی شرمندگی کا تاثر زائل کرنے لگ گئی۔

”ہاں تو کیا ہوا، پھر میرا حق ہے دیکھنے کا۔ شرمندگی کی کیا بات ہے، ڈھیٹ بن زینب شاباش!“ اس نے خود کو پھر پور تسلی دی اور سکون سے

چائے کا گھونٹ بھرا۔ مگر گھونٹ بھرتے ہی اسے منزہ سے کیا وعدہ یاد آ گیا اور ساتھ ہی چائے پینا اس کے لیے دوبھر ہو گیا۔

”عمر!“ اس نے اتنا آہستہ کہا کہ وہ خود ہی شاید اپنی آواز بمشکل سن پائی مگر اس کی توقع کے برعکس عمر نے سکون سے ”ہوں“ کہہ کر اسے حیرت کے سمندر میں غرق کر دیا تھا گو کہ اس نے سراٹھا کر اب بھی نہیں دیکھا تھا بلکہ لپٹاپ پر تیزی سے انگلیاں چلاتے ہوئے ہی ”ہوں“ کہا تھا مگر وہ حیران تھی کہ اس نے سن لیا تھا۔ کچھ دیر جب اس کی طرف سے پکارنے کے بعد کوئی جواب نہ آیا تو عمر نے بے اختیار ہی لپٹاپ سے نظریں ہٹائیں اور اسے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ بے ساختہ اٹھ آنے والی مسکراہٹ چھپانے کے لیے دوبارہ لپٹاپ پر جھک گیا کیونکہ وہ پورا منہ کھولے حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”منہ بند کر لیں، چمچر چلا جائے گا۔“ اس کی آواز پر اس نے جھٹکے سے منہ بند کیا تھا۔

”یا اللہ زینب!“ وہ ایک دفعہ پھر خود کو کوستی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

”کچھ کہتا ہے آپ کو؟“ لہجہ ہمیشہ کی طرح ٹھنڈا مگر آج کافی نرم تھا۔

اس کے دھڑ دھڑ کرتے دل کو تھوڑی سی حوصلہ افزائی ملی تھی، اس نرم لہجے پر۔

”جی۔“ اس نے آہستہ سے نظریں جھکائے جھکائے ہی جواب دیا۔

وہ فیصلہ کر چکی تھی بات کر کے ہی رہے گی، آخر پڑھا لکھا بندہ ہے، وہ کیوں اعتراض کرے گا بھلا ٹرپ پر جانے سے۔

”کسی۔“

عمر کے کہنے پر اس نے بے اختیار نظریں اٹھا کر اسے دیکھا جو سکون سے ٹھوڑی بازو پر جمائے بڑی تسلی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے سے زیادہ

وہ نہیں دیکھ پائی تھی اور فوراً ہی نظریں جھکا دیں۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے باہر ہی آ جائے گا، اتنی ٹھنڈ میں بھی اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ بڑی ہمت سے اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور خود کو تارل کرنے کی ناکام سی کوشش کی، ہاتھ بلا وجہ ہی ایک دوسرے میں اس نے سختی سے جکڑ لیے تھے۔

”یا اللہ۔۔۔۔۔“

”خیریت ہے؟“ وہ اب دوبارہ لپٹاپ پر جھک گیا تھا۔ شاید وہ اس کی گھبراہٹ محسوس کر چکا تھا البتہ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا، کچھ بھی جتانے، ظاہر کرنے میں ناکام۔ اسے دوبارہ کام کرتا دیکھ کر وہ پھر سے ہمت باندھنے لگی۔

”یونیورسٹی کی سب سے بولڈ ڈی بیٹر رہی ہو تم زینب۔۔۔۔۔ اپنی تندگی اتنی سی بات نہیں کر سکتیں۔۔۔۔۔“

تف ہے تم پر۔“ اس نے خود کو غیرت دلائی اور واقعی اسے غیرت آ بھی گئی۔

”وہ۔۔۔۔۔ منزہ کا ٹرپ مری جا رہا ہے اور وہ بھی جانا چاہتی ہے تو آپ اسے اجازت دے دیں۔“ اس نے جھٹکے سے ایک ہی سانس روکے کہہ دیا اور پھر زبان

ایسے دانتوں تلے دبالی سختی سے کہ خون رس آیا تھا مگر وہ ویسے ہی سانس دبا کے بیٹھی رہی۔ عمر کے کام کرتے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے تھے اس کی بات سن کر، پھر وہ دوبارہ ٹائپ کرنے لگ گیا تھا۔

”اتنا ایٹی ٹیوڈ۔۔۔۔۔“ ایک لمحے کے لیے تو زینب کو آگ ہی لگ گئی۔

”میں نے آپ سے کچھ کہا ہے۔“ سارا احترام، ڈر، رعب اور دیوانگی ایک طرف رکھ کر وہ بے اختیار پرانی زینب بنی۔

”میں سن چکا ہوں۔“ لہجہ اب صرف ٹھنڈا تھا نرمی ختم ہو چکی تھی۔ زینب وہاں بیٹھے بیٹھے برف ہونے لگی مگر ہمت وہ بھی نہیں ہار رہی تھی۔

”تو پھر۔۔۔۔۔ جاہے وہ؟“ اس نے گویا پھر سے

یہ لی پھار میں ہاتھ ڈالا۔

مرنے ہاتھ روک کر بھنویں اچکائیں اور انہیں نظروں سے اسے دیکھا، زینب کے ہاتھوں کی کثرت صوفی پر بے اختیار ہی مضبوط ہونے لگی۔

”کوئی بھی کہیں نہیں جا رہا۔“ قطعیت سے لہتا وہ اٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گیا۔

”مگر کیوں۔۔۔۔۔ وجہ؟“ اس کے اندر کی خود سر زینب نے سراٹھایا تھا۔

وہ جاتے جاتے پلٹا، اب کہ اس کے بے تاثر چہرے پر ہلکی سی حیرانی اور قدرے غصے کی ملی جلی حیرت تھی جیسے کہہ رہا ہو تمہاری اتنی جرأت۔۔۔۔۔ زینب نے بے اختیار ہی اپنے گل پڑھ لیے۔

”وجہ یہ کہ میں کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔ او کے؟“ اس کے قریب آ کے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے اتنے سکون اور ٹھنڈے لہجے میں کہا کہ زینب کسی خزاں رسیدہ بچے کی طرح لرزنے لگی۔

”او کے؟“ اس کے ہاتھ اب کندھوں میں اتنی سختی سے گڑ گئے کہ مارے تکلیف کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر باہر وہ بھی نہیں آئے تھے۔

”او کے؟“ کے لہجہ اتنا سخت تھا کہ اس کا سر بے اختیار ہی ہاں میں مل گیا اور ساتھ ہی آنسو بھی

کالوں پر آ گئے تھے۔ اس سے بھلا کب کسی نے اتنی سختی اور غصے سے بات کی تھی، وہ تو دو منٹ بھی نہ سہہ سکی۔

”اونہوں۔۔۔۔۔“ وہ آنسو دیکھ کر جزبز ہوا۔

”ساف کریں انہیں روتی دھوتی عورتیں مجھے بالکل اہل نہیں کرتیں۔“ وہ آرام سے کہتا شب خوابی کا لباس اٹھائے واش روم کی طرف بڑھ گیا اور وہ

پاکت سی بے آواز روتے روتے ادھر ہی ڈھے گئی تھی۔ اندر کچھ بہت زور سے ٹوٹا تھا۔۔۔۔۔ شاید دل یا

منزہ کا مان یا اس کا بھرم یا پھر شادی سے پہلے والی

زینب کا وجود تھا جو آج پوری طرح ٹوٹ گیا تھا۔

بے دم سی وہ بستر پر آ کے بیٹھی تھی، آنسو اب بھی زار و قطار باہر آرہے تھے، کچھ دیر بعد وہ اس کے برابر میں آ کے بیٹھا تھا اور کچھ لمحوں بعد اس نے

ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب کیا۔ وہ بنا مزاحمت کے اب سر اس کے کندھے پر رکھ کر اس کے ظلم پر ہی رورہی تھی، ہچکیاں لے لے کر جب کہ وہ خاموش اپنی شرٹ کو بھینکا دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح آٹا گوندھتے ہوئے وہ بالکل خاموش تھی، دماغ میں مسلسل ایک ہی بات گھوم رہی تھی کہ وہ کیسے منزہ کو نہ کرے گی۔

”ارے بہو نہیں اٹھی آج۔۔۔۔۔ عائشہ، منزہ۔۔۔۔۔ پتا تو کرو، طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی کہ نہیں؟“

اماں کی آواز پر وہ زور سے اچھلی، آج نماز پڑھتے ہی وہ سیدھی کچن میں آ گئی تھی۔ اماں کو سلام

تھی نہیں کر کے آئی تھی، اس نے تیزی سے ہاتھ دھو کے قدم اماں کے کمرے کی طرف بڑھائے۔

”السلام علیکم آنٹی!“ اس نے دوپٹا سر پر چھایا۔ دوپٹا سر پر لینے کی عادت بھی یہاں آ کے ہوئی تھی۔

”ارے۔۔۔۔۔ علیکم السلام! جیتی رہو۔ سدا سہاگن رہو۔“ انہوں نے اس پر پھونکتے ہوئے دعا نئیں دیں۔ وہ بمشکل مسکراتی ہوئی ان کے پاس

بیٹھ گئی اور منزہ کو دیکھنے لگی جو نماز پڑھ رہی تھی، ایک دفعہ پھر سے وہ ہی فکر لاحق ہونے لگی۔ وہ ایسی ہی

تھی، کسی کا دل توڑنا یا مان توڑنا اس کے لیے بے حد مشکل کام تھا، پی ٹی سی ایل پر آتی کال نے اس کا

دھیان ہٹایا۔

”اتنی صبح کس کا فون آ گیا، اللہ خیر کرے۔“ اماں پریشان سی بولی تھیں، اس نے ہاتھ بڑھا کے

فون اٹھالیا۔

”السلام علیکم!“ اس نے کہا۔
 ”وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔“ دوسری طرف علی تھا۔ ”کیسی ہیں بھابی؟“ اس کے پوچھنے پر وہ جھینپ سی گئی۔ اس کی پہلے کبھی ڈائریکٹ علی سے بات نہیں ہوئی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں علی بھائی؟“ اس نے کہا کہ اماں کو دیکھا جو علی کا نام سن کر سکون سے دوبارہ تسبیح پڑھنے لگ گئی تھیں۔
 ”میں بھی ٹھیک ہوں، ہمارے بھائی کیسے ہیں؟“ علی کا لہجہ اب شرارتی ہوا تھا، وہ یقیناً مزاج میں عانت پر گیا تھا، اسی لیے اتنا شگفتہ مزاج تھا۔
 ”وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔“ اس نے کہا کہ بے اختیار دروازے کی طرف دیکھا۔

وہ اٹھ کر آ گیا تھا، اس نے جلدی سے فون اماں کو پکڑا یا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی وہیں آ گیا تھا، اسے ناشتا دے کر وہ اماں کے لیے ناشتا تیار کرنے لگی جب ہی منزہ کی آواز سن کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یقیناً وہ کالج جانے سے پہلے کنفرم کرنا چاہتی ہوگی۔ اس نے چور نظروں سے اس بے نیاز کو دیکھا جو سکون سے ناشتا کرنے کے بعد سنک پر ہاتھ دھو رہا تھا پھر مڑا اور اس کی قریب آیا۔ وہ بے اختیار پیچھے ہوئی، اس نے ہاتھ بڑھا کے دو پٹا پکڑا، ہاتھ پوچھے اور منہ صاف کرتا مزے سے باہر نکل گیا۔

ادھر وہ گیا اور ادھر منزہ اندر آ گئی، اس کے چہرے پر خوشی کے سارے رنگ پھیلے ہوئے تھے، منب کو شدت سے شرمندگی کا احساس کچھ کے لگانے لگا۔

”آؤ منزہ! ناشتا کرو۔“ اس نے شرمندہ ہو کر کہا لیکن وہ ناشتا کرنے کے بجائے سیدھی اس کے قریب آئی اور اس سے لپٹ گئی، منب بوکھلا کر رہ گئی۔
 ”تھینک یو سوچ بھابی! تھینک یو سوچ۔“ مجھے

بالکل یقین نہیں آ رہا کہ بھائی مان گئے۔ اوہ مائی گاڈ! وہ پرجوش ہو کر بول رہی تھی، منب حیران پریشان اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”ہائے! اس کو میں کیسے بتاؤں کہ وہ نہیں مانے۔“
 ”ایسا ہے منزہ کہ تمہارے بھائی..... وہ..... اصل میں.....“ الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔
 ”ہاں ہاں بھابی! میرے بھائی جیسا اس پوری دنیا میں کوئی نہیں۔ مجھے پتا تھا آپ منائیں گی انہیں، پتا ہے بھائی نے اماں کو نہ صرف ٹرپ کے لیے پیسے دیے بلکہ کہا کہ اس کو شاپنگ بھی کروا دیجیے گا۔ میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی بازار..... ٹھیک ہے۔“ وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی جب کہ وہ ابھی تک اسی فخر پر پرانک گئی تھی ”بھائی نے اماں کو پیسے دے دیے“ خوشی کی ایک لہر نے بے اختیار اسے لپیٹ میں لیا۔

”تو کیا واقعی..... مان گئے۔“ وہ حیران تھی۔
 ”بھابی جائیں گی شاپنگ پر؟“ اس کے ہلانے پر اس نے فوری سر ہلایا، وہ خوش ہو کر پلٹ گئی جب کہ وہ اب بھی بے یقین سی کھڑی تھی۔
 ”تو عمر سعید صاحب..... آپ میں بھی بہر حال محسوس کرنے کی حس ہے۔“ وہ کھل کے مسکرائی، دل بے اختیار ہی خوش فہمیاں پالنے لگ گیا۔

☆ ☆ ☆
 ”چل منب اپنا کام کر، تین گھنٹے رلانے کے بعد اگر مان ہی گیا تو سودا برا نہیں۔“ وہ خود سے کہتی کھلکھلائی اور دوبارہ کام میں مگن ہو گئی لیکن خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

دہائیاں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔
 ”عانت! حرم کو لحاف سے باہر نہ نکالنا، کوئی میرے عمر کو فون کر کے پوچھے، کدھر ہے..... ارے بہو! ذرا کال تو ملاؤ۔ منزہ! علی کو فون کرو، پوچھو وہ ٹھیک ہے، اسے کہنا سردی سے بچائے خود کو۔“ وہ بار بار یہی باتیں دہرا رہی تھیں۔

”علی بھائی بالکل ٹھیک ہیں اماں! بے فکر رہیں اور حرم بھی سو رہی ہے۔“ عانت نے انہیں تسلی دی۔
 ”منب! عمر کو کال ملا پتر..... اسے کہہ آج جلدی آجائے گھر، موسم کی کیا خبر۔“ اماں نے دوبارہ کہا تو اس نے فوری کال ملا کے فون اماں کی طرف بڑھا دیا، اماں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ان کو کال ملا دی ہے، بات کر لیں۔“ منب نے جواب دیا، اماں کے ماتھے پر بے اختیار ہی لکیریں بن گئی تھیں۔

”ناں..... تیرا پردہ ہے اس سے؟“ انہوں نے فون پکڑے بغیر آگے ہو کر بڑی بے زاری سے پوچھا، منب بوکھلا کر رہ گئی۔

”نن..... نہیں آنٹی..... وہ میں تو.....“ اس سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پایا۔

”بھئی عجیب بات ہے، کمرے میں چاہے گھنٹہ گھنٹہ اس سے کال ملاتی ہو۔ میں نے کہا دیا تو فون میرے ہاتھ میں تھا دیا، خود کو شوہر کی فکر نہیں ہے کیا، اتنا خراب موسم ہے۔“ اماں شروع ہو گئی تھیں۔
 منزہ نے سر پکڑا اور عانت نے منب کا اڑتارنگ دیکھ کر مسکراہٹ دہائی تھی۔

”وہ..... وہ آنٹی میں تو..... میں نے کہا کہ آپ.....“ وہ گھبرائی ہوئی الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔

”اماں کہتے ہوئے کیا زبان دکھتی ہے، کیا فیروں کی طرح آنٹی آنٹی ہر وقت..... بھئی ان تین باہ میں پتا چل گیا ہے کہ بہت انگریزی آتی ہے نہیں۔“

منب کا یہ وقت ہی برا تھا، روز اماں کسی نہ کسی کی کلاس لیتی تھیں اس وقت وہ بڑا انجوائے کرتی تھی، اب خود پر بڑی تو اسے بچنے کی کوئی راہ نہیں مل رہی تھی۔

”اماں بس بھی کر دیں، بھابی اب رونا شروع ہو جائیں گی۔“ منزہ کی نظر اس کے سرخ ہوتے چہرے پر تھی، اماں نے فوراً عینک لگا کے اسے دیکھا۔

”آئے ہائے..... جا میری دھی! میں تو بخول کر رہی تھی ایسے ہی..... لے دس۔“ اس کی شکل دیکھ کر وہ فوراً ہی اپنی نرم دلی کے باعث پھسل گئی تھیں، منب کی جان میں جان آئی۔

”اماں وہ فون نہیں اٹھا رہے۔“ اس نے اب کی دفعہ آنٹی کہنے کی غلطی نہیں کی۔

”ہے ہی لا پرواہ..... شروع سے ہی ایسا ہے بے دید۔“ اماں نے منہ بنا کر تسبیح اٹھائی اور وہ جو توقع کر رہی تھی کہ اماں مزید پریشان ہو جائیں گی۔ فون نہ اٹھانے کا سن کر، ان کا ایسا لٹھ مار جواب سن کر ہکا بکا انہیں دیکھ رہی تھی۔

”یا اللہ! یہ ماں بیٹا کسی دن مجھے حیرت کے جھکے دے دے گراؤ پر پہنچا دیں گے۔“ وہ حیران سی — دوبارہ نمبر ملانے لگی۔

☆ ☆ ☆
 ”ہونٹوں میں ایسی بات میں دبا کے چلی آئی۔“

ٹیپ ریکارڈر میں دھیمے سروں میں بجتے گانے نے اس کی توجہ کھینچی۔ اس نے تہ کیے ہوئے کپڑے الماری میں رکھتے ہوئے ذرا کی ذرا اس بے نیاز کو دیکھا جو موبائل پر بڑی تھی۔

ہونٹوں میں ایسی بات میں دبا کے چلی آئی کھل جائے وہ ہی بات تو دہائی ہے دہائی ”واہ واہ.....“ وہ سن کر اشک کر اٹھی تھی، کمال کی شاعری تھی، عمر کا ذوق بہت اچھا تھا۔

”زینب.....“ اس کی آواز پر وہ چونک کر مڑی۔

”جی۔“ اس نے بے بسی سے اسے سگریٹ سلگاتے دیکھا، کتنے برے لگتے تھے اسے سگریٹ پینے والے مرد..... لیکن عمر سعید کے معاملے میں دل نے ایسی دعا دی تھی کہ اسے پھر بھی بہت اچھا لگتا تھا۔

”عائشہ نے جانے کے لیے کہا ہے، اگلے ہفتے وہ چلی جائے گی۔ آپ کل اسے شاپنگ پر لے جائے گا۔“ اس نے دھواں اگلتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز بہت خوب صورت تھی اور وہ عام طور پر بہت دھیماء، ٹھنڈ اور سکون سے بولتا تھا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ زینب نے سر ہلایا۔ گوکہ وہ عائشہ کے جانے کا سن کر اداس ہو گئی تھی۔ اس کے آنے سے گھر میں بہت رونق ہو جاتی تھی۔

”منزہ کو بھی لے جائے گا۔“ اس کے کہنے پر زینب نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر ادھر وہی ازلی سکون تھا۔ بالکل بے تاثر چہرہ، کل رات کی داستان کا کوئی حوالہ تک نہ تھا۔ زینب مایوس ہو گئی، دل پھر سے اداس ہونے لگا۔ مطلب وہ اس کے آنسوؤں سے بالکل بھی نہیں پگھلا تھا، پتا نہیں یہ شخص کبھی مجھے اپنے اندر اترنے دے گا۔ یا نہیں۔

میں کبھی جان۔ پاؤں گی کہ یہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہے، کیا محسوس کرتا ہے، ذمہ داری کے علاوہ بھی کچھ سمجھتا ہے مجھے یا نہیں.....

یا پھر شاید میں ہی ناشکری ہوں، سب کچھ تو اللہ نے دیا ہے خیال بھی رکھتے ہیں پھر بھی میں پتا نہیں کیوں جذباتی ہو جاتی ہوں لیکن خود کو سمجھانے کے باوجود بھی وہ اداس تھی۔ اسے اس کا ایسا فرض سمجھ کر نبھایا جانے والا خیال نہیں چاہیے تھا، وہ جانا چاہتی تھی اسے، اس پر حق جتاننا چاہتی تھی، اس کو ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتی تھی، اس کے ساتھ جینا چاہتی تھی۔

ایک بار..... ایک بار ان آنکھوں کو پڑھنے کی

اجازت دو عمر سعید! ساری عمر تمہاری پجارت بن کے رہوں گی، کسی بے اعتنائی پر آف نہ کروں گی، کوئی شکوہ لیوں تک نہ آئے گا۔

وہ پھر سے دور چلی گئی تھی، اپنی سوچوں کی دنیا میں، کپڑے ہاتھ میں تھے اور الماری کھلی ہوئی تھی۔ عمر نے طویل سانس بھر کے اس کے ہاتھ سے کپڑے لیے اور الماری میں رکھ دیے جب کہ وہ چونک کر ہوش میں پھر مارے شرمندگی کے زمین میں گڑ کے رہ گئی۔

”یا اللہ! یہ ساری بونگیاں میں ان کے سامنے ہی کیوں مارتی ہوں۔“ وہ آنکھ نہیں اٹھا رہی تھی۔

”آپ بیٹھ کر سوچ لیا کریں، کھڑے ہو کر سوچنے سے دماغ کے ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی تھک جاتی ہیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی، شاید وہ مسکرایا تھا۔ زینب نے دیکھنے کے لیے بے اختیار ہی سر اٹھایا مگر وہ چالاکی سے دھواں اس کے منہ پر چھوڑتا مڑ گیا اور وہ بے اختیار ہی ہاتھ سے دھواں پیچھے کرتی رہ گئی تھی۔



”پلیز مجھے کچھ کھلا دو، نہیں تو میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔“ پچھلے تین گھنٹوں کی شاپنگ نے سب سے زیادہ منزہ کو تھکا دیا تھا جب کہ وہ دونوں ابھی بھی بالکل فریش تھیں۔

”بس یہ آخری جوتا لے لیں پھر کچھ کھانے چلتے ہیں۔“ زینب نے اسے تسلی دی، جوتا خرید کے وہ ایک ریسٹوران میں آ گئی تھیں۔

”جلدی سے آرڈر کرو بس۔“ زینب کرسی پر ڈھب گئی، اسے بھی اب جوں ستار ہی تھی۔

”بھائی..... ی..... ی.....“ کھانا کھاتے ہوئے عائشہ کے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی دونوں نے چونک کے عائشہ کو دیکھا جو گھبرائی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں کی پشت دروازے کی طرف تھی، عائشہ کے اس طرح دیکھنے

پر وہ بھی بے اختیار مڑیں اور سامنے سے آتے عمر کو دیکھ کر وہ بھی بوکھلا گئیں۔ عائشہ نے یہاں آنے سے پہلے اسے بتایا تھا کہ عمر کو لڑکیوں کی ہولنگ زیادہ پسند نہیں ہے۔

”کچھ نہیں کہتے..... سکون سے کھانا کھاؤ۔“ زینب نے لاپرواہی سے کہا تو ان دونوں کو تسلی ہوئی حالانکہ اندر سے وہ بھی ڈر رہی تھی لیکن وہ عائشہ کو دیکھ کر حیران تھی جو شادی شدہ ہونے کے باوجود اتنا ڈرتی تھی بھائی سے۔ اتنے میں وہ بھی انہیں دیکھ چکا تھا اور وہ جو ایک بزنس ڈیلنگ کے لیے یہاں آیا تھا انہیں دیکھ کر ادھر ہی آ گیا۔ عائشہ اور منزہ اسے آتا دیکھ کر کھڑی ہو گئیں لیکن اس نے آ کے دونوں کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ دونوں مطمئن ہو گئیں۔

”ہو گئی شاپنگ؟“ اس نے ایک نظر دوسری طرف سرخ دوپٹے میں بیٹھی زینب پر ڈالی اور اسے دیکھتے ہی ہلکی سی ناگواری اس کے چہرے پر۔ اختیار ظاہر ہوئی جو زینب جیسی حساس لڑکی کی آنکھوں سے چھپی نہیں رہی تھی۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ کھانے میں ان کے ساتھ شریک ہو چکا تھا، شاید اسے ان تینوں کا اکیلے یہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس لیے وہ ان کے ساتھ ہی کھانا کھانے لگا، کھاتے ہوئے وہ گا ہے بگا ہے ایک نظر اس پر بھی ڈالتا اور ہر دفعہ ہی اسے اس کی آنکھوں میں غصہ ہی نظر آیا۔

زینب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے، اس طرح غصے سے تو اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو غصے میں بھی بڑا پرسکون رہتا تھا۔ اس سے بالکل بھی کھانا نہیں کھایا گیا تھا ”شاید ہولنگ پر خفا ہو رہے ہوں مجھ پر؟“ وہ دل ہی دل میں سوچتی رہی اور ڈرتی رہی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے ان تینوں کو ساتھ آنے کا کہا اور خود گھر تک چھوڑنے آیا۔

گھر کے آگے رکتے ہی منزہ اور عائشہ تیزی سے اتریں، وہ درمیان میں بیٹھی تھی، اس لیے ان

کے بعد اترتا تھا۔

”آئندہ آپ کبھی بھی چادر کے بغیر مجھے بازار میں نظر نہ آئیں۔“ گاڑی سے اترتے ہوئے اس کی سخت آواز سن کر وہ سن ہو گئی۔

اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر پچھلا دروازہ بند کیا اور زن سے گاڑی آگے لے گیا جب کہ وہ ساکت وہیں کھڑی تھی پھر آہستہ آہستہ اندر آئی اور خاموش ہی عائشہ اور منزہ کو دیکھنے لگی جو اماں کو شاپنگ دکھا رہی تھیں لیکن وہ ان کے وجود کے گرد لپٹی سیاہ چادریں دیکھ رہی تھی جو انہوں نے اتارے بغیر ہی شاپنگ دکھانا شروع کر دی تھی۔ بے اختیار ہی اس کی نظر سامنے شیشے میں اپنے عکس پر پڑی، پر عذرا لینن کے سوٹ پر سرخ کریم کا دوپٹا تھا، اس نے تو دوپٹا بھی سر پر لیتا اب شروع کیا تھا، اسے عمر کی عیسیٰ نظریں یاد آئیں تو اس نے بے اختیار جھرجھری لی۔

”میری توبہ جو آئندہ بغیر چادر کے نکلوں۔“ وہ دل ہی دل میں عہد کرتی واپس آ گئی جہاں اماں بیٹیوں پر خفا ہو رہی تھیں کہ زینب نے اپنے لیے کیوں نہیں کچھ لیا، وہ مسکراتی ہوئی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”سب کچھ ہے اماں میرے پاس، سب کچھ۔“ اس نے احترام سے ان کے ہاتھ تھامے، وہ عظیم بیٹے کی ماں تھیں۔ اماں نے بغور اس محبت کے مظاہرے کو دیکھا پھر آگے کو ہوئیں۔

”کم (کم) دس..... کم.....“ آنکھیں گھما کر پوچھ رہی تھیں، زینب بے اختیار ہنستی چلی گئی۔

”کوئی کام نہیں ہے اماں! ایسے ہی آپ پر پار آ رہا ہے۔“ اس نے لاڈ سے ویسے ہی ان کے گلے میں بازو ڈالے جیسے وہ امی کے گلے میں ڈالتی تھی۔ اماں اور منزہ حیران جب کہ عائشہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ بھی کھل کے مسکرا دی تھی، اسے آج اماں سے بالکل گھبراہٹ نہیں ہوئی تھی۔

عائشہ سسرال چلی گئی تھی اور منزہ ٹرپ پر گھر پر مزید خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ سارا دن بوکھلائی سی پھرتی رہتی۔ اماں بھی ٹھنڈ کی وجہ سے جوڑوں میں ہونے والے درد کے باعث زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھیں۔ اب بھی بوریت سے بچنے کے لیے اس نے محن چکانے کا فیصلہ کیا، وہ کئی دن سے اسے اچھی طرح دھونے کا سوچ رہی تھی مگر اماں نہیں دھونے دیتی تھیں کہ ٹھنڈ بہت ہے، رہنے دو، بیمار پڑ جاؤ گی۔ آج ذرا سورج صاحب بھی موڈ میں تھے، دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی، اس نے فوری پائپ لگایا اور شروع ہو گئی۔ ابھی آدھے سے زیادہ محن دھویا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ دوپٹا درست کرتی گیٹ پر آئی اور باہر کھڑے ادھیڑ عمر آدمی اور ان کے ساتھ کھڑی خاتون کو دیکھ کر سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ بھی حیران مگر خاتون کچھ زیادہ ہی غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”جی؟“ اس نے پوچھا۔
”تم..... عمر کی دہائی ہو؟“ وہ خاتون بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

عمر کا نام سن کر اس نے طویل سانس لیا۔ یقیناً ان کے رشتہ دار ہی ہیں، شادی اتنی سادگی سے ہوئی تھی کہ وہ ان کے بس اکاؤ کا ہی رشتہ داروں کو جانتی تھی۔

”ہاں جی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا کے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ خاتون اب بڑے غور سے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”ارے بہو! میرا چشمہ نجانے کدھر رہ گیا، دیکھو تو بھلا۔“ اماں نے اسے دیکھ کر دہائی دی۔

”اماں..... یہ.....“ اس نے اپنے پیچھے آنے والوں کی طرف اشارہ کیا مگر اماں پہلے ہی اس کے

پیچھے آنے والوں کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔
”السلام علیکم بھابی!“ وہ دونوں بڑی گرم جوشی سے اماں سے مل رہے تھے۔

”علیکم السلام! خیر سے تم آج کیسے راستہ بھول گئے عبد الستار۔“ اماں نے دیور کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ شرمندہ سے بیوی کو دیکھ رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں تم ہی جواب دو اب۔

”ارے بھابی! میں تو کب سے آنے کا سوچ رہی تھی بس ذرا مصروفیت تھی ورنہ آپ سے ملنے کا تو بڑا دل تھا میرا۔“ وہ خاتون جو غالباً عمر کی کراچی والی چچی تھیں بڑی مٹھاس سے اماں کو کہہ رہی تھیں۔

”ہوں.....“ اماں نے ہنکارا بھرا۔
”یہ بہو ہے؟“ ان کی ایکسرے کرتی نگاہیں ایک دفعہ پھر سے اس پر تھیں جو آرام سے کھڑی تھی، اماں نے ان کی نظر کے تعاقب میں دیکھا پھر بولیں۔

”ہاں، اللہ کا کرم ہے۔ بیٹیوں جیسی بہول گئی۔“ ان کے کہنے پر زینب جی اٹھی گویا، اماں کبھی بھی اس کی برائی نہیں کرتی تھیں بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی مان رکھتی تھیں اس کا، اس گھر میں سب ہی مان رکھنے والے تھے۔

”ہوں.....“ چاچی کو شاید تعریف سن کر مایوسی ہوئی تھی، وہ مسکراتی ہوئی کچن میں آ گئی اور چائے کے ساتھ دیگر لوازمات کا اہتمام کرنے لگی جب اماں کی دوبارہ آنے والی آواز پر وہ باہر آئی۔

”جی اماں!“ اس نے کہا۔
”اوپر کے دونوں کمرے کھلوادینا، تمہارے چاچا چاچی کچھ دن یہیں رکھیں گے۔ دوسرا کمرہ بھی سیٹ کرادینا، بچیاں بھی ہیں ان کے ساتھ۔ مامور کے گھر ٹھہری ہیں، شام تک آ جائیں گی۔“ اماں نے تفصیلی ہدایات جاری کیں، جب کہ وہ سر ہلا کر مڑ گئی۔

اماں، عمر اور باقی سب بھی بہت زیادہ مہماں

نواز واقع ہوئے تھے حالانکہ عائشہ نے اسے بتایا تھا کہ یہ ہی وہ لوگ تھے جن کی وجہ سے وہ بچپن میں گھر بدر ہوئے تھے مگر اماں کی ہمت سے وہ آج ان سب لوگوں سے بہت آگے نکل گئے تھے پھر بھی وہ کھلے دل سے ان کی مہمان داری کر رہی تھیں۔

وہ دل ہی دل میں ان کی مزید معترف ہوئی۔
☆ ☆ ☆

گھر میں چاچا، چاچی اور زارا، سارہ کے آنے سے کافی مل جل ہو گئی تھی گو کہ وہ دونوں کم گو تھیں۔ عمر کی فیملی مجموعی طور پر ہی کم بولتی تھی مگر پھر بھی ایک رونق سی ہو گئی تھی۔ ان کی آمد پر عمر نے کوئی خاص تاثر نہیں دیا تھا، شاید وہ واقعی ایسا ہی تھا کہ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بلا کا بے نیاز اور بلا کا پرسکون، البتہ علی، منزہ اور عائشہ سے وہ رات وائس ایپ پر بات کرتے ہوئے جب چاچا کی فیملی کی آمد کے بارے بتا رہی تھی تو عائشہ نے بے اختیار آنکھوں پر دل والی ایموجی بھیج کر اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ شکر وہ پہلے ہی سسرال آ گئی تھی۔ منزہ نے بھی بڑی خوشی سے کہا کہ شکر وہ ٹرپ پر ہے البتہ علی کے کمنٹ پر وہ شپٹا کر رہ گئی تھی، اس نے لکھا تھا کہ.....

”اس کا اس ہفتے گھر آنے کا ارادہ تھا لیکن وہ اب ان کے جانے کے بعد ہی آئے گا۔“ ساتھ ہی لکھا تھا۔

”بھابی! ذرا بیچ کے، ہمارے خاندان کی لڑکیاں عمر بھائی پر دل و جان سے فدا تھیں۔“ وہ شپٹائی اس بات پر تھی کہ یہ وائس ایپ پر بنا ہوا ان کا فیملی گروپ تھا۔ وہ عائشہ، منزہ اور علی کے ساتھ ساتھ عمر بھی اس میں ایڈ تھا اور یہ ساری بات چیت گروپ میں ہی ہو رہی تھی، جس وقت علی کا کمنٹ آیا، عمر اس نے ساتھ ہی تھا کمرے میں۔ زینب کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے گو کہ عمر نے کبھی بھی اس گروپ میں کوئی کمنٹ کرنے کی زحمت نہیں کی تھی

مگر وہ بڑھتا ضرور تھا، اس لیے وہ چپ کر کے آف لائن ہو گئی اور دوبارہ منزہ کی ٹرپ کی تصاویر دیکھنے لگی۔

اگلی صبح چاچی اور زارا اس سے پہلے کچن میں موجود تھیں اور ناشتا تیار کر رہی تھیں، زینب ایک لمحے کے لیے چکر کر رہ گئی پھر جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے چھری اور پیاز لے لی جو وہ آلیٹ بنانے کے لیے کاٹ رہی تھیں۔ چاچی نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”چاچی! میں بناتی ہوں، آپ بیٹھیں پلیز۔“ اس نے نرمی سے کہا اور زارا کو بھی منع کیا۔

”کیوں بیٹھیں..... بھی بعد میں باتیں بھی تم ہی بناؤ گی کہ ماں بیٹیاں مفت میں روٹیاں توڑ رہی ہیں اور میری زارا تو ویسے بھی بہت سکڑ ہے، فارغ بیٹھ ہی نہیں سکتی۔“ انہوں نے منہ بناتے ہوئے زارا کو دوبارہ اشارہ کیا، وہ فوراً اٹھ کر چولہے کے پاس چلی گئی، زینب بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔

”لیکن چاچی.....“ الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ وہ سیاہ شرٹ اور گرے پینٹ میں روشنیاں بکھیرنا ناشتا کرنے کچن میں آ گیا۔

اس نے ایک نظر ان تینوں پر ڈالی اور پھر خاموشی سے آ کر ٹیبل کے گرد کھٹی کرسی پر بیٹھ گیا، اس کے بیٹھتے ہی چچی الرٹ ہوئیں۔

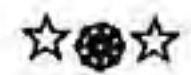
”ارے زارا! پہلے عمر کو ناشتا دو، میرے بیٹے نے آفس جانا ہوگا۔“ ان کے لہجے میں بے حد مٹھاس تھی۔

زارا کے ہاتھ مزید تیزی سے چلنے لگے۔
”زینب! مجھے ناشتا بنا دیں۔“ اس نے اپنے مخصوص پرسکون لہجے میں بنا کسی کو مخاطب کیے ڈائریکٹ زینب سے کہا۔ چاچی کا چہرہ سکی کے احساس سے سیاہ پڑ گیا تھا۔ زینب سر ہلائی آگے بڑھی مگر چاچی نے ایک دفعہ پھر اس کا بازو پکڑ کر روک دیا۔

”ارے بیٹا! زارا بتا رہی ہے نا۔“ ان کی بات

پر عمر نے پہلی دفعہ سر اٹھایا اور بغور انہیں دیکھا، پھر کہا۔

”زینب..... میرا ناشتا بناؤ۔“ وہ اب بھی چاچی کو ہی دیکھ رہا تھا جن کا رنگ بری طرح اڑ گیا تھا اس نے دوبارہ سر جھکا لیا، زینب نے زارا کے ہاتھ سے بیلن لے لیا جو اس نے مسکراتے ہوئے ہی زینب کو تھمایا تھا۔ یقیناً وہ اچھی لڑکی تھی۔ وہ بیلن تھما کر باہر چلی گئی جب کہ چاچی شرمندگی سے کچھ دیر کھڑی رہیں پھر باہر چل دیں جب کہ زینب بھی شرمندہ سی ناشتا بنا رہی تھی۔ اسے چاچی کا شرمندہ ہونا اچھا نہیں لگا تھا، بہر حال وہ بڑی عظیم گریہ بات عمر سعید کو کون سمجھائے۔ یہاں وہ ہی ہوتا تھا جو وہ چاہتا تھا اور بس.....



”بہو! ادھر آؤ ذرا۔“ وہ مغرب کی نماز اماں کے کمرے میں ادا کرتی تھی، آج بھی ادا کر کے جانے لگی تو ان کے پکارنے پر مڑی۔

”جی.....“ وہ ان کے بید پر ہی آ گئی۔

”عبدالستار نے ہاتوں ہی ہاتوں میں ملے لیے کہا ہے۔ اماں نے کہا تو وہ نا بھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا کہا ہے؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی، اماں شپٹائیں۔

”یہ لو..... سیدھی بات کی ہے مہر بھی سمجھ میں نہیں آئی۔“ وہ گویا اس کی دماغی حالت پر شبہ کر رہی تھیں۔ زینب شرمندہ سی ہو گئی، واقعی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”عبدالستار اور عذرا چاہ رہے ہیں کہ ملے کے لیے زارا یا ساراہ میں سے کسی کو لے لیں۔“ اماں نے اب باقاعدہ ہاتھ نچا کے اسے سمجھایا تو اس کے منہ سے بے اختیار ”اوہ اوہ“ نکل گیا۔

”بتاؤ تم، کیا کہتی ہو؟“ اماں نے اب آگے کو ہو کے آہستہ سے پوچھا، وہ ایک دفعہ پھر حیران

ہوئی۔

”میں..... میں کیا کہوں ہے؟“ اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں جب کہ اس کے یوں کہنے پر اماں نے بے اختیار ہی سر پر ہاتھ مارا اور ناراض سی پیچھے کو ہو گئیں۔

”مانو..... بالکل ہی عقل سے پیدل ہو، ارے میں پوچھ رہی ہوں تمہاری کیا رائے ہے؟“ وہ اب تھوڑی ناراضی سے بول رہی تھیں۔

”میں کیا رائے دے سکتی ہوں اماں! علی بھائی سے پوچھ لیں اگر وہ کہیں اور انٹر سٹڈ نہیں ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ زارا اور ساراہ دونوں ہی اچھی لڑکیاں ہیں، ہاتی آپ کی مرضی۔“ اس نے گول مول سا جواب دیا۔

جواہر اماں نے لبسا سا ہم م م..... کہنے پر اکتفا کیا پھر ایک طویل سانس بھر کر اس سے مخاطب ہوئیں۔

”تم ذرا پہنچنا آج علی سے اور پھر عمر سے بھی پوچھنا۔“ اماں کے کہنے پر وہ زور سے اچھلی۔

”نن..... نہیں اماں! عمر سے آپ خود پوچھ لیجئے گا۔“ اسے صبح والا اس کا رویہ یاد آ گیا تھا۔ اماں نے جواہر کو ملے اتے دیکھا، وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

”اوہ کے اوہ..... میں ہی پوچھ لوں گی۔“ اسے اماں کے ہاتھوں ہونے والی چھٹی باری کی عزت افزائی بھی یاد آ گئی تھی، اس لیے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق — اٹھ کے باہر آ گئی۔ ماں ہو، بیٹا..... سہنا تو اسے ہی تھا۔



ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں ان آنکھوں سے وابستہ افسانے ہزاروں ہیں وہ کمرے میں آئی تو وہ سگریٹ سلگائے ہمیشہ کی طرح شپ ریکارڈ آن کیے چت لیٹا تھا۔ زینب علی سے بات کر کے آئی تھی، جواہر اس کا سارا فیصلہ پر ہموار دینے پر وہ عمر سے بات کرنے آئی تھی۔ عا

اے اس نے کہا تھا کہ وہ کہیں بھی انٹر سٹڈ نہیں ہے، اگر مہمانی راضی ہیں ادھر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

اے اس کا لہجہ شرارتی تھا۔ وہ مطمئن سی اندر چلی آئی۔

اسے لم گوا اور سادہ سی زارا بہت اچھی لگی تھی حالانکہ سارا زیادہ منسار تھی مگر پھر بھی اسے پتا نہیں! وہ زارا زیادہ اچھی لگی تھی، رہی چاچی کی بات تو انہوں نے تھوڑی آنا تھا۔ بیٹی کے ساتھ بیاہ کے، اگر پرست ہو جاتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔

اس صبح فروزاں کو آندھی سے ڈراتے ہو اس صبح فروزاں کے پروانے ہزاروں ہیں مغینہ گنگنا رہی تھی اور وہ مسلسل سگریٹ پھٹ رہا تھا۔

”عمر۔“ اس نے بیڈ کی دوسری طرف پر بیٹھ کر آہستہ سے پکارا۔

”ہوں۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں بغیر چونکے کہا۔

”ایک بات کرنی ہے آپ سے۔“ اس نے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا۔

”کریں۔“ اس کے سکون میں کوئی فرق نہ آیا، وہ اب تیسری سگریٹ سلگا رہا تھا، زینب نے — ہونٹ سچ لیے۔

”کیا آپ اسے دومنٹ کے لیے بند نہیں کر سکتے۔“ اس کے منہ سے بے اختیار ہی نکل گیا تھا۔ جواہر اس کے لائٹر جلاتے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے، اگلے ہی لمحے اس نے بڑے سکون سے اسے سلگایا اور اس کی اس حرکت پر وہ غصے سے سرخ ہوئی تھی یعنی کہ حد ہو گئی۔

اس کے اندر کی خود سرنسب ایک بار پھر جاگ کئی تھی، علی، سارا، چاچی..... وہ سب بھول گئی اور بھٹکے سے آگے ہو کر اس نے سگریٹ اس کے ہاتھ سے کھینچ کر بازو پیچھے کر لیا جب کہ عمر اس کی اس جرأت پر اسے آگ برسائی نظروں سے دیکھ رہا تھا،

مگر اس نے بازو آگے نہیں کیا تھا، وہ ڈٹ گئی تھی۔

”یہ دے دیں مجھے۔“ آنکھوں کے برعکس لہجہ بلا کا پرسکون تھا۔

”پہلے میری بات سنیں۔“ وہ بے خونی سے بولی۔ وہ کھول کے رہ گیا تھا۔

”زینب۔“ اس کا لہجہ تنبیہی تھا، دھمکاتا ہوا وہ سر جھکا گئی تھی مگر سگریٹ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ اگر وہ ضدی تھا تو پھر اس نے ابھی زینب فاطمہ کی ضد بھی نہیں دیکھی تھی، چلو آج دیکھ ہی لے۔

”آئی سیڈ..... واپس کریں۔“ وہ اب ایک ایک لفظ چہار ہا تھا، سکون ختم ہو رہا تھا۔ زینب نے آہستہ سے سگریٹ والا ہاتھ آگے کیا اور اسے واپس کرنے کے بجائے اپنے ہونٹوں سے لگالیا، دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ اسے روک ہی نہیں سکا اور اس کے ہونٹ جلنے پر وہ ہوش میں آیا۔ ایک جھٹکے سے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور دوسرے ہاتھ سے اس سے سگریٹ چھیننی چاہی مگر اس نے مٹھی بند کر لی تھی۔ ہتھیلی بھی ہونٹوں کی طرح جل اٹھی تھی، تکلیف کے مارے اس کی آنکھوں سے متواتر پانی بہہ رہا تھا، دانت اس نے اتنی سختی سے ہونٹوں پر جمائے ہوئے تھا کہ خون رسنے لگا تھا۔ سگریٹ بند مٹھی میں بجھ چکی تھی، جب کہ وہ حیران سا ماذف دماغ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا اور وہ بہتی آنکھوں کے ساتھ ان بے تاثر آنکھوں میں لکھی حیرانی کی تحریر پڑھ رہی تھی۔

کتنی خواہش تھی کہ وہ ان آنکھوں میں کبھی کوئی تاثر دیکھے تو ثابت ہوا عمر سعید! تمہیں پڑھنے کے لیے مجھے ہر بار خود کو تکلیف دینی ہوگی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں ان آنکھوں سے وابستہ افسانے ہزاروں ہیں

کمرے میں۔ یہ ہی آواز گونج رہی تھی، وہ کچھ لمحے بے بس سا اسے دیکھے گیا پھر بہت شدت سے اپنے ساتھ لگا لیا۔
”پاگل ہیں آپ؟“ لہجہ پرسکون۔ ادا آج دیتے جذبول کی شدت لیے ہوئے تھے۔
خول اتر رہا تھا، وہ بند آنکھوں کے ساتھ مسکرائی تھی جب کہ وہ ہر چیز بھلائے بس مرہم رکھ رہا تھا پوری شدت کے ساتھ، پورے جذبول کے ساتھ۔

☆☆☆

اکلی صبح اس کے لیے ہر لحاظ سے خوش گوار تھی اور اس خوش گوار بیت میں مزید اضافہ علی اور منزہ کو گھر میں دیکھ کر ہوا تھا۔ وہ آگے پیچھے ہی آئے تھے، شاید ان کے آنے کی خوشی تھی یا کچھ اور بات تھی آج تو عمر سعید نے بھی چھٹی کر لی تھی۔
”مری سے تو میں ہو کے آئی ہوں لیکن نکھری ہوئی آپ ہیں۔“ منزہ شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کھٹکھٹا کر ہنسی، اندرونی خوشی پھوٹ پھوٹ کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔

”خیر تو ہے بڑی خوش ہیں؟“ اس نے آنکھیں گھمائیں۔

”ہاں ناں..... بہت خوش.....“ اس نے ہونٹ کا ایک کوننا دباتے ہوئے مسکراہٹ دہائی۔
”دراصل میں مس کر رہی تھی تمہیں، شکر ہے تم آگئیں۔ اس لیے میں خوش ہوں۔“ وہ دانستہ بات بدل گئی تھی۔

”السلام علیکم! یا اہلیان کچن۔“ علی کی آواز پر وہ دونوں چونکیں۔

”وعلیکم السلام! جیتے رہیں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ وہیں کرسی تھمیت کر بیٹھ گیا تھا۔

”عمر بھائی چلے گئے آفس؟“ علی نے سوالیہ نغز سے اس کی طرف دیکھا۔ عمر کے نام پر اس کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے تیز ہوئی، بے اختیار ہی اس نے ہتھیلی بھیکتی محسوس کی۔

”آج وہ نہیں گئے..... میں نے جگایا تھا اور آپ دونوں کے آنے کا بھی بتایا، کہنے لگے نہیں جانا آج۔ پھر دوبارہ سو گئے۔“ اس نے جلی ہوئی ہتھیلی پر دوسرا ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔
”خیر، آپ ملے سارہ سے؟“ اس کو یک دم جیسے یاد آیا، علی بے اختیار مسکرایا۔
”ہاں جی۔“ اس کے لہجے میں پسندیدگی کا تاثر تھا۔

”اچھی ہے ناں؟“ وہ پُر جوش ہوئی، علی اس کا جوش دیکھ کر ہنس پڑا۔
”بھابھی! میں نے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے، میری کزن ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کئی سالوں بعد دیکھا ہے تو فرق تو آیا ہے اور.....“ وہ کہتے کہتے رکا۔

”اور.....؟“ وہ دونوں آگے کو ہو گئیں۔
”اور یہ کہ واقعی اچھی ہے، اب آپ فائل کر لیں بس۔“ اس نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا، ان دونوں کے منہ سے بے اختیار ”یا ہو“ نکلا تھا۔

”خدا کی مار..... پھر سے چھپکی آگئی ہوگی، بس آج کل کی لڑکیاں بھی ناں۔ یہ اتنی اتنی سی چیز دیکھ کر ڈر جاتی ہیں۔“ اماں ان کا نعرہ سن کر ہڑبڑا اٹھی تھیں اور قیاس آرائی کر رہی تھیں۔

”ارے بہو! یہ عمر نہیں اٹھا، طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی۔“ انہوں نے وہیں سے آواز لگائی۔

”جی اماں! ٹھیک ہیں، رات کافی دیر تک کام کرتے رہے، اس لیے آج نہیں گئے۔“ اس نے ناشتا سامنے رکھ کر انہیں نسل دی، چاچا اور چاچی بھی ادھر ہی آگئے تھے۔

”بات کی تو نے عمر سے؟“ اماں کا لہجہ ان کے آتے ہی سرگوشیانہ سا ہو گیا تھا۔

”اماں وہ..... وہ..... وہ مصروف تھے رات، اب کرتی ہوں۔ ویسے علی بھائی اپنی رضا مندی دے

چکے ہیں۔“ اس نے اپنے تئیں اماں کو مطمئن کیا۔
”ہونہہ..... خیر عمر سے بات کر کے بتانا۔“ اماں نے ہنکارا بھر کے ناشتا شروع کر دیا اور وہ بھی دل ہی دل میں عمر سے بات کرنے کا ارادہ کر کے کچن میں آگئی۔ جہاں سارہ اور منزہ پہلے سے موجود تھیں۔ علی برآمدے میں کھڑا ادھر ہی دیکھ رہا تھا، اس کے دیکھنے پر جھینپ کر رہ گیا۔

☆☆☆

ناشتے کی ٹرے اس نے صوفے کے سامنے ٹیبل پر رکھ کے آئینے کے سامنے کھڑے بال بناتے عمر کو دیکھا۔ خواہ مخواہ ہی اتنا تردد کیا جا رہا تھا حالانکہ اس کے سنہری بال بھی بھی سیٹ نہیں ہوتے تھے، اس کی طرح ہر وقت اچھے سے رہتے تھے۔ وہ پھر سے کھوٹی تھی، بال بنا کے وہ مڑا تو وہ ہوش میں آئی۔
”یہ..... ناشتا.....“ وہ خواہ مخواہ ہی نزوں ہونے لگی حالانکہ وہ بالکل پرسکون تھا۔

”آجائیں آپ بھی۔“ عمر نے ہاتھ پکڑ کر اسے بھی بٹھا لیا تھا۔ وہ دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ اس عنایت پر حیران ہوئی ادھر تک گئی اور نظریں اس کی مخروطی انگلیاں پر ٹھہر گئیں۔ بڑے آرٹسٹک ہاتھ تھے، ہاتھوں سے نظراب کلائیوں پر تھی، دائیں کلائی پر بھی بلیک رسٹ واچ، اس سے کچھ اوپر ہمیشہ کی طرح فولڈ کی ہوئی آستینیں.....

”میں کھلا دوں؟“ عمر کی آواز پر وہ بوکھلا کر رہ گئی۔

”نن..... نہیں..... میں لے رہی ہوں ناں۔“ اس نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا اور دل ہی دل میں خود کو سرنش کرتی تیزی سے لقمہ توڑنے لگی۔

”کچھ کہنا ہے؟“ آج اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ بہت آہستہ سے ٹٹو سے ہاتھ صاف کر کے اس نے دوبارہ اس کا جلا ہوا ہاتھ تھام لیا، زنب کا دل پھر سے رفتار پکڑنے لگا۔

”سوری..... آئندہ نہیں پیوں گا مگر آپ کے

سامنے۔“

وہ دکھ سے اس کی ہتھیلی دیکھ رہا تھا پھر اس کی طرف دیکھا جو دھڑکتے دل کے ساتھ خوشی سے کانپ سی رہی تھی گویا وہ معنی رکھتی ہے۔ اس کی تکلیف، اس کی بات عمر سعید کے لیے معنی رکھتی ہے، اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں، وہ پوری شدت سے ان لمحوں کو محسوس کرنا چاہتی تھی، کیا ہوا جو وہ کہتا نہیں تھا۔ ہر بات کہنے کی بھی نہیں ہوئی، لمحوں میں اس نے اپنے خوش فہمیوں کے جال بن لیے تھے۔ کیا جادو تھا اس شخص کے پاس، وہ چھڑی گھماتا تھا اور وہ خوش ہو جاتی تھی۔ اس کے سحر میں جکڑی جاتی تھی، اگر یہ جان جائے کہ کتنی پاگل ہوں میں اس کے لیے.....

”اپنے ہونے پر فخر کرو تم عمر سعید! اگر تمہیں علم ہو جائے کہ کوئی تمہیں اتنا چاہتا ہے اور پوجتا ہے۔ تمہارے ایک نرم فہرے پر پھل جاتا ہے۔“ وہ ہنسنے لگی تھی اپنی دنیا میں۔

”زنب!“ عمر کے مسکراتے لہجے پر اس نے بمشکل تھوک نگل کر اپنی شرمندگی چھپانا چاہی، کیا کہتے ہوں گے، پاگل ہے یہ لڑکی۔

”کوئی بات کرنی ہے آپ کو؟“ اس کے پوچھنے پر اس نے بے اختیار ہی ماتھے پر ہاتھ مارا۔

”ہاں جی..... کرنی تو ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بات یاد کر کے وہ پھر سے پر جوش ہو گئی تھی۔

”سارہ ہے ناں اپنی، اماں چاہتی ہیں علی بھائی کے لیے مانگ لیں۔ ان فیکٹ چاچی بھی چاہتی ہیں اور علی بھائی کو بھی اعتراض نہیں۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ آپ سے پوچھ لوں تو فائل کر دیں۔“ وہ جوش سے کہتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی جو بالکل خاموشی سے سن رہا تھا۔

”میں تو کہتی ہوں چاچی کے جانے سے پہلے ہی فائل کر دیتے ہیں، ٹھیک ہے؟“ اس نے تائید

چاہی۔ ”اس کی ضرورت نہیں، علی کے لیے لڑکیوں کی سعاد کے اس رات سندھ جانے کے بعد علی نے کی نہیں جو چاچی کی بیٹی یہاں آئے۔ اس بات کو بے تابی سے اس سے پوچھا تھا کہ آیا اس نے عمر سے یہیں ختم کر دو۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں قطعیت سے کہا۔ ”نہیں سن سی بیٹھی رہ گئی، اس کی بات پر پھر اس کے کھڑے ہونے پر ہوش میں آئی۔“

”مگر علی بھائی اور اماں راضی ہیں، سارہ بہت اچھی لڑکی ہے آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ وہ تیزی سے اس کے پیچھے لگی۔

”بس.....“ نرمی غائب ہو گئی تھی لہجے سے۔ ”کون راضی ہے کون نہیں، ڈزنٹ میٹر..... میں نے کہہ دیا نہیں تو نہیں..... دیش فائل۔“ اس کے لہجے میں اب محکم تھا۔

”وائے ڈزنٹ میٹر..... شادی علی کی ہونی ہے، جب اسے کوئی اعتراض نہیں تو آپ کیوں اعتراض کر رہے ہیں۔“ وہ بحث پر آ گئی تھی۔

عمر نے مڑ کر ایک نہایت سرد نظر اس پر ڈالی، اس کے پورے وجود میں سردی لہر دوڑ گئی۔ وہ بے اختیار ہی ڈر کے پیچھے ہو گئی۔

”مجھے بحث کرنے والی اور آگے سے تڑتڑ جواب دینے والی عورتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“ اس نے ناگواری سے کہا، وہ چپ چاپ سر جھکا کر رہ گئی۔

”میری پبلنگ کر دو، مجھے دس بارہ دن کے لیے سندھ جانا ہے، امپورٹنٹ ہے اور.....“ وہ کہتے کہتے رکا، نہیب نے سر اٹھایا۔

”آئندہ یہ بات میں دوبارہ نہ سنوں..... اس گھر میں چچا کی بیٹی کے علاوہ ہر عورت آ سکتی ہے، مگر وہ نہیں۔“ غصے سے کہتا ہوا وہ سگریٹ کی ڈبیہ اٹھاتا ہر چلا گیا تھا اور بوجھل دل کے ساتھ وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆ وہ غم آنکھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ علی کو سارہ کی انگلی میں انگوٹھی پہناتے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس

کی ساری تصاویر اپ لوڈ کر کے علی اور سارہ کو بیسٹ دھڑکی تھیں اور اوپر سے سارہ کو ایڈ کر کے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ بوکھلائی سی تصویریں دیکھ رہی تھی، اس گروپ میں عمر بھی ایڈ تھا، یہ پہلو تو اس کے ذہن میں ہی نہیں رہا تھا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ”عمر کا لنگ“ دیکھ کر اس کا دل حقیقی معنوں میں اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اس وقت تو بڑی دلیری دکھا رہی تھی، اب سرد ہوتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے ریسیور کان کو لگایا۔

”کر لی آپ نے اپنی مرضی..... مل گیا سکون..... اس اور وناؤ۔“ کال انینڈ کرتے ہی اس کا برف لہجہ اسے اس برف میں دفن کرنے لگا، اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔

”مجھے لگا تھا ساری دنیا ایک طرف ہو جائے..... نہیب قاطمہ میرے ہی پیچھے کھڑی ہوگی، میرے ساتھ۔“ اب اس کے لہجے میں اذیت تھی، وہ تڑپ اٹھی۔

”خیر آپ نے بھی ثابت کر کے دکھایا کہ میری بات کی آپ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں، الٹا میری طرف سے ہاں بول کے آپ نے میری ذات کی ہی نفی کر دی۔ اس لیے آئندہ آپ مجھ سے کبھی بھی کوئی امید نہ رکھیے گا۔ آپ کی عزت میں رکھ لی ہے اماں کے آگے کہ ہاں میں نے ہاں بول دی تھی مگر آج کے بعد آپ میرے لیے ایک اجنبی کے سوا کچھ نہیں۔“ فون کٹ چکا تھا اور وہ پتھرائی سی کھڑی تھی بالکل ساکت۔

”نہیب قاطمہ میرے پیچھے کھڑی ہوگی مگر نہیں۔“

اس کے لہجے میں مان ٹوٹنے کی اذیت تھی، نہیب نے دونوں ہاتھوں سے بے اختیار اپنا منہ ڈھانپ لیا تھا۔

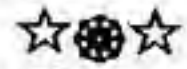
”آج کے بعد آپ میرے لیے ایک اجنبی کے سوا کچھ نہیں۔“

بہت آہستہ سے جان اس کے وجود سے نکلی تھی۔ ان چار ماہ میں اس نے کبھی اسے اتنا مل بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، وہ اسے دیکھ کر خود سے بھی اجنبی ہو جاتی تھی اور آج اس کے لیے ہی اجنبی تھی۔

”تو کیا..... وہ..... وہ مجھے چھوڑ دیں گے..... نہیں.....“ وہ کانپ اٹھی۔

”عمر بھائی کی ضد اور غصہ اللہ کی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ وہ غصے میں کچھ بھی کر دیتے ہیں۔“ عائشہ کی کہی ہوئی بات اسے یاد آئی۔

”نہیں..... پلیز نہیں..... یہ..... نہیں ہو سکتا..... نہیں.....“ اس کے حلق سے چیخیں نکلتی چلی گئی تھیں اور اگلے ہی لمحے وہ لہرا کر وہیں گر گئی تھی۔



کسی نے کاٹا تھا شاید کچھ باریک سا اس کے بازو پر چھتا تھا، اس کے ذہن پر چھائی تاریکی سمٹنے لگی۔ لاشعور سے شعور میں آتے ہوئے اس نے بمشکل بھاری ہوتی آنکھیں کھولیں، اور دھندلی سی نظروں سے دیکھا، وہ ہسپتال میں تھی شاید، بے اختیار ہی اسے کچھ یاد آیا تو ساری حسیات بیدار ہو گئی تھیں۔ ”عمر.....“ وہ تڑپ کر اٹھی، اماں اور عائشہ



دستریچا
مہدیما

قیمت - 400 روپے

نکات: 37- اور 38- (نمبر 32735021)

اس نے محمد بخش کے گھر ہمارے اولین دنوں میں جنم لیا تھا۔ بہن بھائیوں میں وہ پانچویں نمبر پر تھی۔ وہ ایک عام سادہ تھا، کسی ان ہونی کا شائبہ تک نہ تھا لیکن جس دن اس نے جنم لیا، اسی دن محمد بخش کی پرانی خدمات اور وفاداری پر خوش ہو کر مالکوں کی طرف سے تنخواہ میں اضافہ ہو گیا۔ (اتفاقاً)۔ سعودی عرب والے ماموں کو برسوں بعد غریب بہن کی یاد آئی تو اس نے خطیر رقم بمعہ تحائف بھجوا دی۔ (بس یوں ہی)۔ تانیا کا دس ہزار کارائز بانڈ نکلا۔ دادی کو کسی مختصر شخص نے عمو کروانے کا عندیہ دے دیا۔ یہ سب اتفاقات یا خوش گوار حادثات ایک ہی دن وقوع پذیر ہوئے تو سب کو یقین ہو گیا کہ یہ بچی قسمت کی وہ دیوی ہے جو سب پر مہربان ہوتی ہے۔

یوں تیسری بیٹی ہونے کے باوجود اس کی قسمت میں سب کا پیار تھا، لیکن محمد بخش کو تو وہ خاص طور پر عزیز تھی۔

”میری بیٹی کا مقدر سب سے خوب صورت ہو گا۔“ وہ اکثر یہ کہتا۔

دیگر بہن بھائیوں کی نسبت اس نے تعلیمی میدان میں خوب جھنڈے گاڑے تھے۔ بلند عزائم اور روشن خواب اب کالج جانے کے خطر تھے۔ لیکن۔

”بابا یہ دیکھیے اخبار میں میری غزل شائع ہوئی ہے۔“ اس نے خیر سے محمد بخش کو ہفتہ وار رسالہ دکھایا۔

محمد بخش نے پہلے حیرت اور پھر طیش سے غزل پڑھی۔ اپنی کم عمر، کنواری اور باپ پر بیٹی کے قلم سے عجیب، انتظار و صل اور لذت درد جیسے الفاظ اسے چراغ پا کر گئے۔ اس نے اخبار کے دو ٹکڑے کیے۔

”بے شرم“ غزل کا یہی عنوان سوچا تھا اسے۔

”یہ خرافات تمہیں کس نے سکھائی ہیں؟ استانی جی نے یا ان ہم جماعتوں نے جنہیں زیب النساء اور حور بڑھنے سے فرصت نہیں۔“ منجھلی تپانے غصے سے کہا۔

سب گھروالے جمع تھے اور ننھی ملزمہ بنی سہمی کھڑی تھی۔

”اب ہماری بیٹیوں، بہنوں کا نام پان والے کی دکان پر لیا جائے گا یا تانیا کی دکان پر لوگ مزے لے لے کر یہ خرافات پڑھیں گے۔ شاعر کا نام کھوجیں گے اور پھر تصور میں۔“ بھائی نے دھاڑ کر کہا۔

”میں تو اپنے قلمی نام مشعل سے لکھتی ہوں۔ میں نے تو اصلاحی افسانے اور مضامین لکھے ہیں۔ میری استائیاں کہتی ہیں۔“ ننھی کی صفائیاں دیتے دیتے آواز بند ہو گئی تھی۔

لیکن جہاں شک اور تنگ نظری ہو وہاں ہر دروازہ مقفل ہو جاتا ہے خواہ دل کا ہو یا دماغ کا۔ ننھی کے گھر والوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ بھابھی کو شک تھا کہ کسی لڑکے کی محبت نے اس سے یہ رومانوی شاعری اور محبت بھرے اشعار لکھوائے ہیں اور افسانے ضرور وہ رقعے ہیں جنہیں ننھی نے افسانوں کا نام دیا ہے اور اپنے تعفن بھرے خیالات کا اظہار کرنے میں انہوں نے دیر نہ لگائی تھی۔

بہنوں کو اپنی کچھ الگ، منفرد اور نازک سی بہن سے پیار تھا جس کی ہر بات میں ادا بھی اور ہر عادت خوب صورت تھی۔ جس کی روشن نگاہوں میں سہرے مستقبل کی جھلک تھی، لیکن یہ جرم جو اس کی قلمی کاوش تھی سب کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا۔

”ننھی! تیرا اسکول جانا بند۔“ بھائی نے حکم صادر کیا تھا۔ ابا نے بھرپور ناراضی کا تاثر دیا۔ بات نہ کر کے صفائی کا موقع دیے بغیر۔ اسکول میں اس کی غیر حاضری طویل ہوئی تو استانی بہ نفس نفیس خود تشریف لائیں۔ اس کا مڑھلایا چہرہ اور مایوس آنکھیں دیکھیں تو حیران رہ گئیں۔

”بس اس عید کے بعد اس کی اپنے چاچے کے گھر شادی ہے۔ لڑکا کپڑے کا کاروبار کرتا ہے۔ اللہ مقدر اچھا کرے۔“ دادی نے سلیقے سے بات سمیٹ دی۔

”چھی بات ہے فروا بتول۔ تم اپنی پڑھائی تو نہ

چھوڑتیں۔ تم نے تو بہت آگے جانا تھا۔“ استانی کا لہجہ ہمیشہ محبت بھرا اور حوصلہ افزا ہوتا تھا۔ ننھی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔

”ہم نے اپنی لڑکی سے نوکری نہیں کروائی۔ جتنا بڑھ لیا کافی ہے۔“ اب کی بار بھابھی نے روکھے انداز میں استانی کو مزید مدح سرائی سے روک دیا۔

انہیں شروع دن سے اپنی لاڈلی اور خوش اطوار منہ سے بیر تھا جواب ظاہر ہوا تھا۔ یوں مستقبل کی خدیحہ مستور، ہاجرہ مسور، ادا جعفری یا قراۃ العین حیدر جیسا ہنر رکھنے والی اپنی قلمی شناخت کی داد لیے بغیر اپنی عملی زندگی میں گم ہو گئی۔

کاروباری، سخت مزاج شوہر، مشترکہ نظام زندگی، تعلیمی پسماندگی، تنگ نظری۔ وہ اکثر قلم کا غنڈہ دیکھ کر سوچتی۔

”مشعل کی ادھوری غزلیں، نامکمل افسانوں کے مسودے اور کردار آس و نراس کے عالم میں اپنی تخلیق کار کی راہ تکتے ہوں گے۔“

اخبار اور کتابیں تو اس ماحول میں گویا شجر ممنوعہ تھیں اور جب اوپر تلے بچوں کی آمد ہوئی تو ادبی ہنر اور ذوق رکھنے والی مشعل بچھ گئی اور صرف فروا بتول زوجہ عبد المتین زندہ رہ گئی جو صبا، حمزہ، فرخ اور عمار کی محبت کرنے والی ہنرمند ماں تھی۔

اس نے بچوں یا خصوص بیٹیوں کو شاعری کرنے، مصوری کرنے سے کبھی نہ روکا تھا۔ صبا کی آواز میں قدرتی سوز اور ایک ترنم تھا۔ موسیقی اور نعت کے مقابلوں میں اول انعام اس کا مقدر بننا۔ حمزہ کو شاعری کا شوق تھا۔ فروا بتول ہر قدم پر ان کی حوصلہ افزائی کرتی۔ فرخ اور عمار۔ انہیں اس نے بہنوں سے محبت کا ہنر سکھایا تھا۔

وسیع القلبی اور آگے بڑھ کر حوصلہ دینے کا ہنر۔

صبا کالج میں داخلہ لینا چاہتی تھی۔ سب اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ عمار نے آگے بڑھ کر حمایت کی اور اگلے دن ہی اس کا داخلہ کالج میں کروایا۔

ماضی کی فروا بتول عرف ننھی جس کے اپنے خواب ادھورے رہ گئے تھے اور تخلیقی ہنر اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ قدرت نے اس کے خواب اس کی اولاد کی صورت میں مجسم کر دیے تھے بلکہ شرمندہ تعبیر کر دیے تھے۔ آج زندگی میں پہلی بار اس نے ماضی کے اور اق اپنی اولاد کے سامنے کھولے تھے۔

”تو کیا آپ نے اپنے آپ کو اندر سے مار دیا۔“ صبا نے افسردہ انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔ میرے اندر کے تخلیقی ہنر نے خوابوں کو نئے راستوں سے روشناس کروایا۔“ فروا نے آنکھوں کے نم گوشے انگلی کی پور سے صاف کیے۔

”میں نے سوچا کہ میں آگے تعلیمی سفر جاری نہ رکھ سکی۔ ادھوری غزلیں اور نامکمل افسانے میری راہ تکتے رہ گئے۔ میں بے جاشک اور تنگ نظری کا شکار ہو گئی، تو کیا اجالے کا سفر مجھ تک آکر رک جاتا۔“ فروا کی آواز میں نمی تھی، لرزش تھی۔ صبا، حمزہ اور عمار ہمہ تن گوش تھے۔

”میں نے شادی کے بعد اپنے حالات، اپنے ہنر کو مقدر کی سیاہی کا نام نہیں دیا، بلکہ اپنے تخلیقی ہنر کو اپنی اولاد میں منتقل کر دیا۔“ فروا نے مسکراتی نظروں سے دونوں کو دیکھا۔ اب کی بار اس کی آواز واضح اور با اعتماد تھی۔

”لیکن یہ ہنر، یہ شاعری، یہ مصوری کا ہنر مجھ میں تو نہیں آیا۔“ عمار نے شکوہ کیا۔

”تم میں میں نے رشتوں کا احترام، محبتوں کا ہنر اور وسیع القلبی کے بیج بو دیے ہیں۔ اس لیے صبا اور حمزہ کی ہر کامیابی، تمہیں اپنی کامیابی لگتی ہے۔ انہیں سراہتے ہو، حوصلہ دیتے ہو۔“ فروا نے عمار کی پیشانی کو محبت سے چوم لیا۔

”ایسا وقت عورت کی زندگی میں ضرور آتا ہے جب اس کے ہنر کا اظہار ہوتا ہے اور میں نے اپنا تمام ہنر تم لوگوں کی تربیت پر آزمایا ہے۔“

ہاں آنے والا اجالا اب نئی نسل کا تھا جس نے وسیع القلبی کا ہنر سیکھ لیا تھا۔

دیکھ کر سناؤ

سفید برجوں والی اونچی حویلی کی سارے علاقے میں بھی ایسی دھاک بھی جیسے دو برجوں کے درمیانی فاصلے میں محرابوں کی نقاشی، دور سے دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی محسوس ہوتی تھی، مگر وقت نے بہت کچھ بدل دیا تھا۔ حویلی کا صرف نام رہ گیا تھا یا ایک خستہ عمارت۔ اب برجوں والی کے اندر صرف اوسط درجے کے لوگ رہ رہے تھے۔ محرابوں کے بیچ میں نصب سفید سینٹ کی پٹیوں والی سیم زدہ جالی کے سامنے اس نے خود کو بیٹھے پایا۔ اس کی نگاہ مشرقی پہاڑ سے ڈھلوان کی جانب زمین پر تھی جہاں نئی عمارت کے ڈھانچے میں کہیں کہیں سے چھوٹے زرد بلب جلتے دکھائی دے رہے تھے۔ رات

اتری آتی تھی لیکن وہ وہاں کام کروا رہا تھا۔ نگاہ کے سامنے سے شیشے کی کھڑکی ہٹ گئی۔ وہاں دیوار، شیشم کے درختوں سے ڈھکی ہل کھائی سیاہ سڑک بھی معمول سے زیادہ پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ بھی اس سڑک کے بچنے پریشانی علاقے والے خاصے برہم ہوئے تھے، سب کا خیال تھا شاید، بارش سے بہہ آنے والے پانی سے گھبرارے ہیں، امام دین جس کے کہے میں سب بوڑھوں کا ایک تھا۔ بڑھاپے سے لرزنی آواز میں انوکھی بات کہہ گیا۔

”پانی کا کیا ہے، وہ تو نشیب میں آئے گا، سڑک سے نہ سہی پہاڑوں سے پھسل کر، مگر صاحب سڑک پر چل کر جو نکل گیا، وہ پلٹ کر نہیں آنے والا،

مکمل ناول



وہ پانی ہوا اولاد، پانی تو زمین میں اتر کر سوکھ جاتا ہے لیکن اولاد سکھا کر زمین میں اتار دیتی ہے۔۔۔

سب نے حیرت سے اس کے جھریوں سے بھرے چہرے کو دیکھا تھا، جہاں فکر تھی غم تھا۔

”میرے بیٹے جوان ہو رہے ہیں، اگر وہ اس پر چڑھ نکلے میرا بڑا ہاتھ پاؤں لگے گا شہر نکل لے گا انہیں اور مجھے جدا کی۔“

امام دین کا یہ جملہ اس نے اپنے بڑوں سے سنا تھا اور بہت حیرت ہوئی تھی، بھلا شہر کسی کو کیسے نکل سکتا ہے، پھر امام دین کو روکتے دیکھا اور سڑک کو بختے۔ وہ

روتا جاتا، سڑک بنتی جاتی، پھر اس کا خدشہ پورا ہوا تھا، اس کا بیٹا سڑک پر چڑھ کر شہر نکل گیا تھا۔ آتا تھا کبھی کبھی، شروع میں مہینوں بعد پھر عید، شب برات سے ہوتی بات سالوں پر گئی، بیوی بچے سب، ادھر ہی تھے امام دین کے ساتھ۔ شروع میں خرچا بھی بھیجتا تھا، کم کرتے کرتے بات ہی ختم کر دی۔

کوئی کہتا اس نے وہاں شادی کر لی، کوئی کہتا اس کا خون سفید ہو گیا۔ وقت گزرتا گیا، اس کی بیوی انتظار میں بوڑھی ہوئی، بچے جوان، امام دین نے انہیں سڑک پر چڑھنے کے لیے فارغ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ اسکول تو کیا دکھانا، س، ڈ، ک جیسا کوئی حرف لکھنے نہیں دیا، امروز خان کی زمینوں پر چھوڑتے ہوئے زور دے کر کہا تھا، انہیں اتنی فرصت ہی نہ دینا سڑک لکھ تو کیا دیکھ بھی سکیں، اور اب ان کا سوچ کر خجستہ کا دل بندھی میں دھڑکا۔

”کل ریز چاچا، اینٹیں تو اپنے بچوں کو چڑھانے کے لیے رکھی جاتی ہیں، تم تو ان کے لیے دیوار بن گئے۔“

وہ خود سڑک پار بیٹھی تھی۔ فیصلے میں آسانی ہو گئی۔ ہتھیلی کے کناروں سے سبز آنکھیں پونچھ کر وہاں اپنے کمرے کی جانب بڑھی، ہر اثنا قدم پہلے سے زیادہ مضبوط لگا۔ ☆☆☆

تیم بیرے بٹتے ہی ان کی کیب بڑے سے آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ چوڑی سی سلیٹی سڑک

کے دونوں جانب بڑے بڑے ایسے میدان تھے جن میں گھاس نہیں اونچی کہیں بالکل چلی گئی تھی۔ چلی گھاس کو مزید روندتے اسٹوڈنٹس کے گروہ کے گروہ تھے لڑکے لڑکیاں، کچھ نے سفید اور آل پہن رکھے تھے، کچھ کہنیوں پر ڈالے اپنی دنیا میں مگن۔۔۔ کئی گروپس کی صورت بیٹھے تھے۔ کتابیں کھلی تھیں اور کئی ہاتھ پاؤں کے مشابہہ ماڈلز لیے ایک دوسرے کو جانے کیا سمجھا رہے تھے۔ امروز خان نے ان سب پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ انہیں خاصا معیوب لگا تھا لڑکے لڑکیوں کا اتنا گھلے ملے انداز میں اکٹھے بیٹھنا۔ ان کی کیب نیکی اسٹینڈ پر رکھی تو امروز خان نے اس سے پوچھا تھا۔

”پہلے جانا کہاں ہے کچھ پتا بھی ہے۔۔۔؟“

”ایڈمن آفس۔۔۔ یہ جمع کرائی ہے نا۔“

اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی اپنی اور بجنل ڈاکومنٹس کی فائل دکھائی تھی۔

”جیسے یقین ہے تمہارے اصل ڈاکومنٹس پانچ سال ان کے پاس رہیں گے؟“

امروز خان کو خاصی حیرت ہو رہی تھی، اتنی اہم اسناد۔ پانچ سال میں کوئی بھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ خجستہ پورے وثوق سے کہہ رہی تھی۔

”جی۔۔۔ ایم بی بی ایس کمپلیٹ ہونے تک، یہ اسٹوڈنٹ کی توجہ کی گارنٹی ہے۔“

ان کی ہر بات سے انجان زر بخت دانت میں چادر کا پلو دبائے حیرت سے ادھر ادھر دیکھتی چل رہی تھی، ایسے تعلیمی ادارے میں پہلی بار آنا ہوا تھا، اور اسے کون پوچھتا تھا یہاں آتے ہوئے اگر اس کے علاج کا خیال نہ ہوتا کہ چلو اسی بہانے سے اس کا چیک اپ بھی ہو جائے گا۔ بہانے سے ہی سہی اس کا علاج ہو جائے گا وہ بہت خوش تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد کوئی ایسویٹس ٹوں ٹوں سائرن بجاتی پاس سے گزرتی تو وہ اچھل جاتی۔

”اللہ رے۔۔۔ لگتا ہے کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے

یا بم دھماکا، کیسے ایسویٹس آئے جارہی ہیں؟“

امروز نے مسکراتے ہوئے ناک سے کبھی اڑائی تھی۔

”یہ میڈیکل کالج ہے، یہاں ایسویٹس نہیں آئے گی تو کیا ہمارے پہاڑوں پر پھرے گی۔“ زر بخت کو خجستہ کی فکر ہوئی تھی۔

”خجستہ! تمہیں یہاں ڈر تو بہت لگے گا۔“

”ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ہماری خجستہ بہت بہادر ہے۔“

خجستہ کی جگہ جواب امروز خان نے دیا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اسے بھی یہ یقین نہیں تھا اس کے اس شوق میں کم از کم اس کی اپنی فیملی ساتھ دے گی جب اس نے پہلی بار یہ بات منہ سے نکالی۔

”مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔“

خانی ماں تو ہنسی ہی تھیں، صفورا چاچی تحیر میں ہنس ہنس کر دہری ہوئی گئیں۔

”مڑے (ارے) خانی! تیری بیٹی نے دو نمبر کیا لیے، اس کا تو سمجھا بیٹ گیا۔۔۔۔۔ یہ ڈاکٹر بنے گا، لو کر لو بات، ہم نے بھی اسکول نہیں دیکھا یہ ڈاکٹر بنے گا۔“

خانی ماں کو اس کے ارادوں سے خوف محسوس ہوا۔ وہ بچپن سے ایسی ہی تھی۔ جو بات کہہ دی سواڑ مکنی، پوری کروا کر دم لیتی تھی۔ اسکول تک جایا، سہیلیوں سے مل لینا، یہاں تک تو بات درست تھی لیکن ڈاکٹر یعنی پڑھنے کے لیے دور شہر جانا۔۔۔۔۔ یہ تو ان کے لیے ایسے ہی تھا جیسے ایمان سے پھر جانا۔ وہ تو اس بات پر راضی نہیں تھیں کہ علاقے کے کالج سے انٹری کر لے۔ بات سیف خان تک جا پہنچی۔

رات درود یوار پر پھسلتی حویلی کے اندر تک ہانکھی تھی۔ صنوبر کی سنہری لکڑی سے بنے بھاری سے صوفے پر سیف خان ٹیک لگائے بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ کمرے میں قہوے کی گرماہٹ، اور صنوبر کی مہک تب پھیلی، جب خجستہ کے کمرے میں داخل

ہوتے ہی سیف خان نے ہاتھ میں پکڑی پیالی ہتھی پر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں پچکارا۔

”آؤ بیٹھو۔۔۔۔۔“

انہوں نے اپنے پاس اس کی جگہ بنائی تھی مگر وہ سامنے بیٹھ گئی۔ نگاہ پیالی میں موجود گرم قہوے پر تھی۔

”میں نے سنا ہے، گھر میں کوئی بات چل رہی ہے۔ کیا مسئلہ ہے۔۔۔۔۔؟“

”مسئلہ نہیں خواہش۔“

لہجہ ٹھوس تھا، صنوبر جیسا مگر نگاہ میں ہلکتے قہوے جیسی التجا بھی۔

”خواہشیں صرف مردوں کی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ عورتیں تکمیل کے لیے ہوتی ہے بچے۔“ سیف خان کے اندر کاروائی پٹھان گرم ہوا تھا۔

”میں مان لیتی داجی۔۔۔۔۔ اگر دل کی دھڑکن محسوس نہ کرتی، دماغ بار بار سوچنے پر نہ اکساتا، کہ عورت دل رکھتی ہے، اس کے اندر احساسات پھوٹتے ہیں۔“

گہرا تاثر دیتے ہوئے سیف خان کی بھنوں کے کنارے آپس میں جڑ گئے تھے۔ آج سے پہلے کسی لڑکی کو ایسے بولتے سنا تھا نہ دیکھا تھا، اس سے پہلے وہ کچھ کہتے، امروز لالہ اور درخزئی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ حاضر وقت مسئلہ جاننے میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا تھا کیونکہ کئی دن سے ایک بحث چل رہی تھی ”خجستہ کالج جانا چاہتی ہے، اور یہ جا کر دم لے گی۔“

اس کا کالج جانے کا کہنا ایسا ہو گیا تھا جیسے اس نے لندن جانے کا کہہ دیا ہو یہ ایک پہاڑ کی مسافت بڑھ گری کالج تھا۔ کئی برس پہلے جمال خان علاقے کے ضلعی ناظم بنے تھے تب ہی ووٹ لینے کے لیے علاقے میں بہت سے کام کروائے تھے۔ لڑکیوں کا ایک ڈگری کالج منظور کروالیا۔ وقت کے ساتھ اسٹاف بھی آ گیا۔ اب تو اس جانب کافی رونق تھی۔ سڑک بھی پکی ہو گئی تھی۔ کئی گھرانوں کی لڑکیاں کالج

میدان میں ڈھل گیا ہو، اور ہسپتال کی عمارت اونچی ہوئی جاتی ہو۔ داعی کو امروز نے اشارے سے چپ رہنے کا کہا تھا۔

”انٹر کا کیا ہے کر لینے دو، اب تو علاقے کی کئی لڑکیاں کالج جا رہی ہیں، رہی بات ڈاکٹر بننے کی، وہ بننا اتنا آسان نہیں جیسا میٹرک میں ٹاپ کرنا، ابھی تازہ تازہ خبریں سنی تھیں میڈیکل کا میرٹ آسمان سے باتیں کرنے لگا ہے۔ ہر سال اونچا چمپ، بچوں کا رونا پیٹنا، احتجاج، توڑ پھوڑ، خودکشی و خودسوزی کی کوشش، بورڈ کے ٹاپر رہ جاتے ہیں یہ تو پھر علاقے کی ہے..... پھر انکار کر کے اس میں بغاوت ضرور بھرنی ہے۔“ داعی نے نہ چاہتے ہوئے نیم رضا مندی دے دی تھی مگر درخزنی ہنستے سے اکھڑ رہا تھا۔

”آج کالج جانے کا کہہ رہی ہے، کل شہر جا کر پڑھنے کا کہے گی..... لوگ ہم کو باتیں ماریں گے۔“

جادو ماتھے تک پہنچتی تجتہ اس کے پاس سے گزرتے گزرتے آہستہ سے کہہ گئی۔

پورے علاقے میں ٹاپ کر جائے گی۔ حیرانی تھی اور بہت تھی اس سے زیادہ تب ہوئی جب اس نے کہا وہ کالج جائے گی۔ صفورا چاچی کو اس کی بات انتہائی اہتمام لگی، خانی بیگم نے جھاڑ کر رکھ دیا۔ وہ شادی کا سامان دھڑ دھڑ اکٹھا کیے بیٹھی تھیں، اور وہ منہ سر لتابوں میں جھونکنے کی باتیں کر رہی ہے، اور زر بخت تو اس کے دسویں سے آگے پڑھنے کا سوچنے پر ہی دم بخود تھی۔

”میری بھی تو شادی کر دی تھی، اس کی بھی ہونی چاہیے ورنہ چہرے کا نور کتابیں چاٹ لیں گی۔ نہ بھولیں رہے گانہ حسن۔“

تجتہ نے ان عورتوں میں سر کھپانے کے بجائے امروز لالہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”آپ تو کہتے تھے ہم آپ کے بچوں کی طرح ہے..... اگر آپ کی بیٹی پڑھنے کا کہتی تو نہ پڑھاتے۔“

امروز خان کی گہری نگاہیں اس کے صبح چہرے پر گڑی رہ گئیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک تین سال کی ایک چار کی، اس وقت اس کے چہرے میں ان کا بھولپن جھلکا تھا۔ تجتہ کے کندھے پیار سے تھپکے۔

”جو داعی فیصلہ کریں گے، ویسا ہوگا۔“

داعی سن کر کچھ دیر تو چپ رہے پھر تھل سے پوچھا۔

”آگے پڑھ کر کیا کرو گی۔“

”ڈاکٹر..... ڈاکٹر بنوں گی۔“

خانی بیگم، صفورا چاچی، اور زر بخت کو تو سانپ نہ لگ گیا تھا۔

”پہاڑ سے جو گرتے ہیں ہسپتال پہنچتے پہنچتے بان سے چلے جاتے ہیں۔ پہاڑ پر ہسپتال بناؤں گی، عورتوں کو اجازت نہیں۔ مرد ڈاکٹر کے پاس جانے کی ایڈی ڈاکٹر ہونی چاہیے ہماری عورتوں کے لیے۔“

وہ ایسے وجد میں بولی تھی جیسے پہاڑ چٹیل

گیا، پورے گھر میں ایک خجستہ تھی باقاعدگی سے اسکول جانے والی، امروز لالہ اُسے لاتے لے جاتے تھے، ابھی اگر درخزنی کو لانا پڑ جاتا ناںک منہ چڑھاتا، سارے رستے گھور گھور کر سانس خشک رکھتا۔ کچھ عرصہ اس نے برداشت کیا آخر ایک دن سیف خان سے کہہ ہی دیا۔

”داعی! ہم درخزنی کے ساتھ نہیں جائیں گے۔“

صفورا چاچی نے گھر کا، خانی بیگم برس ہی پڑیں۔

”کیوں نہیں جائے گا.....؟“

”کیوں کہ یہ بہت غصہ کرتا ہے، کسی دن ہمیں پہاڑ سے دھکا دے دے گا۔“

”آرام سے بات کرو۔“

خانی بیگم اونچی آواز میں بڑبڑاتی تھیں۔ ”ادبہ، پہاڑ سے دھکا دے دے گا..... مالک ہے وہ تیرا.....“

بارہ تیرہ سالہ بچی کے منہ سے الفاظ تو نہیں نکلے تھے البتہ بھولی سی سبز آنکھوں میں ابھرنی لگی تھی۔ ”مالک تو زمین کے ہوتے ہیں، جانوروں کے ہوتے ہیں..... مس کہتی ہے مالک اللہ ہے، پر میرا مالک یہ ہے، یہ بدتمیز.....!“

خانی بیگم سے پھسل کر نگاہ قاصطے پر کھڑے درخزنی پر گئی تھی جس کی گردن مالک کا سنتے ہی مزید تن گئی تھی۔ ماتھے پر کھٹکی۔

تجتہ گھر کا سب سے چھوٹا بچہ تھی اور سیف خان بہت مہربان، وہ اپنی نشست سے اٹھتے بہت پیار سے بولے تھے۔

”چلو آج سے ہم چھوڑنے جائے گا تمہیں۔“

دو چار سال کی تو بات تھی، پھر شادی کر دینی تھی۔ سیف خان کو اس کی بات ماننا اچھا لگا تھا۔

☆☆☆

پہاڑوں پر اترتی چڑھتی دھوپ نے سال بتاتے وقت نہیں لگایا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سیاہ کڑھائی والی چادر میں لپٹی سر جھکائے چلتی لڑکی

جانے لگی تھیں لیکن برج حویلی سے ابھی کوئی نہیں گئی تھی یہاں بھی ہی کون جو کالج جاتی۔

ایک زر بخت، دوسری تجتہ جمال خان کی ناگہانی وفات نے سیف خان کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ دنیا میں دو ہی بھائی تھے۔ بھائی بھی ایسے کہ محبت و خلوص میں پورے علاقے پر بھاری، اس طرح جڑے درمیان سے کوئی سوئی نہ گزار سکے، اک اک چیز میں یاد دہانی تھی، پھر وارث بھی نہ چھوڑا، کوشش بہت کی تھی پر اللہ کو منظور نہیں تھا، منتیں مرادیں۔ دائیوں مائیوں کے ٹوٹے ٹوٹے مگر توڑ نہ چڑھے، ڈاکٹر سے مشورہ شرم کی حد توڑنے کے مترادف تھا۔ گھریلو علاج سے خانی کو لنگ ضرور مل گیا تھا مگر بیٹا نہیں۔ جمال خان کے دل کا ملال اپنی جگہ مگر اظہار بھی نہیں کیا تھا، کچھ شاکر سی طبیعت تھی، ماشاء اللہ بھائی کے دو چراغ تھے سو گھر کے دروازے پر روشنی رہی۔

وقت گزرا کہ جمال خان بھی گزر گئے، ترکہ میں جائیداد کے ساتھ چھوڑی دو بیٹیوں کو دیکھ کر سیف اللہ کا دل بھر بھرا آتا تھا۔ جمال خان کی پہلی برسی پر زر بخت کا نکاح امروز خان سے کر کے زحمتی دل پر پھیلا رکھ لیا۔ زر بخت اس وقت دسویں میں تھی، امروز کو بی اے کے بھی دو سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ باپ کے ساتھ اپنا آبائی کام بہت خوشی سے کر رہا تھا۔ شادی کے وقت دونوں کی عمروں کا آٹھ نو سالہ فرق جو اس وقت محسوس بھی ہوا زر بخت نے خانی بیگم کی کاپی بن کر دو سالوں میں ہی مٹا دیا تھا۔ درخزنی شروع سے لا پرواہ، جم کر بیٹھنے سے اوب جانے والا تھا۔ بمشکل مڈل کی تھی۔

”جب امروز لالہ بی اے کے بعد بھی پہاڑ کی پچھلی زمین پر باجرہ مٹی اگا رہے ہیں تو اسے اگاتے شرم آئے گی.....؟ جب کرنا ہی یہی کام ہے تو بی اے جائے بھاڑ میں آٹھویں کی کتابیں دوست کو تحفہ کر، خود زمینوں پر جانے لگا، زمینوں سے سارے علاقے میں گھومتا گھماتا کچھ سر چڑھا سن مو جی ٹاپ بن

ہیولٹی بکس کا انتخاب کردہ
Herbal
سوہنی شیمپو
SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت - 120/- روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور مشی آرڈر سے منگوانے والے
دو بوتلیں - 300/- روپے تین بوتلیں - 400/- روپے
اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ
بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ماہی اے جناح روڈ، کراچی۔
دفعہ خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

”خواہشوں کو تکمیل کا رنگ تو اللہ چڑھاتا ہے،
انسان کی کیا اوقات.....“

☆☆☆

سبز بچوں پر ٹپ ٹپ برس کر پھسلتی بوندوں کی
طرح دن سنگلاخ پھروں میں جذب ہوتے جاتے
تھے، سال اول کا نتیجہ بہت زبردست رہا تھا۔
سہیلیوں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ استادوں کا مان بڑھ
گیا تھا۔ جہاں خجستہ کی امید بڑھی تھی وہاں سرکار درد
بھی بڑھ گیا تھا، تختہ سیاہ پر لکھے سفید لفظ کھر کی طرح
مٹے مٹے لگتے، آنکھیں چند حیا چند حیا کر غور کرنی، کن
پٹیوں پر زور پڑتا، بار بار نشست سے اٹھ کر جاتی،
کاپی پر اتار لاتی ایک دن مس نے کہہ ہی دیا۔
”خجستہ! تمہیں آنکھیں چیک کروانی چاہئیں،
تمہاری نگاہ کا مسئلہ ہے۔“
”نہیں نہیں مس.....“

اُسے مس کے جملے سے بھی خوف آیا تھا۔
صرف یہ سوچ کر کہیں یہ سچ نہ ہو جائے، پھر تو گھر
والے اس کی کسی صورت نہیں مانیں گے۔ رات کو
خانی بیگم کمرے کا بلب جلانے نہیں دیتی تھیں، انہیں
روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔
چاچی کہتی تھی ”رات کو پڑھ پڑھ کر تیرے بال
گر رہے ہیں، چھپا آدمی رہ گئی۔“
دامی کہتے گھر میں دکھائی نہیں دیتی، ان کتابوں
نے میرا بچہ چھین لیا۔“

زربخت کو کون سا پسند ہے دیر تک درتے پچے کا
زیر و پاور بلب جلانے رکھنا، تھوڑی روشنی نے نگاہ پر
اثر ڈالنا شروع کیا تھا، درخزنی کے تو کہنے ہی کیا، وہ تو
چاہتا تھا بھلے اندھی ہو جائے، گھر تو لگے گی۔ خجستہ نے
دعا میں مانگتی شروع کر دیں۔

”اللہ میری آنکھیں ٹھیک رکھنا۔“
سہیلی کے کئی سال سے عینک لگی تھی اس نے
اپنی اتار کر دی۔

”خجستہ یہ لگا کر دیکھو، صحیح نظر آتا ہے تم کو؟“
باریک کمائی کی چھوٹی سی عینک، پتلی ناک پر

”اسٹبل بھوادوں.....؟“
اس نے نا جمی سے ماں کو دیکھا۔
”کیا مطلب.....؟“
”مطلب کیا.....؟“

انہوں نے فرش سے بکھری چیزیں اٹھاتے
ہوئے اسے گھر کا۔ ”جہاں بیٹھا وہیں کھایا، ادھر گرا
ادھر گرا..... کپڑے جوتے چادر سب بکھیر رکھا ہے،
کوئی عقل نامی چیز ہے تجھ میں، یا گھوڑوں کی طرح
گھاس کھائی دم ہلائی۔“

ماں کی ضرب المثل پر تو کھول کر رہ گیا۔
”گھر کی عورتیں مر گئی ہیں کیا..... کریں کام۔“
اس نے بال بنا کر کنگھا بیڈ پر اچھال دیا۔
”مری نہیں، بوڑھی ہو گئی ہیں..... نہیں دم رہا
اب بیڈوں میں اتنا، خواخواہ کا گند سیمٹوں۔“ اس کے
بیڈ سے کنگھا اٹھاتے ہوئے اسے ایک بار پھر نخوت
بھری نگاہ بخشی۔

”جو جوان ہے اس سے کیوں نہیں کروا تمیں
بٹھاؤ گھر اسے، بلا وجہ تمنا شاگرا کھا ہے۔“
گردن جھٹکتے ہوئے گرم مظر گردن کے گرد
لپیٹا دانٹوں تلے آئے کڑوے بادام جیسا منہ بناتے
ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ درتے پچے کے آخری
لڑنے میں انکیٹھی کے پاس بیٹھی وہ لٹل کر اپنا
بقیاد کر رہی تھی۔ انکیٹھی کی ساری تپش درخزنی
میں بھر گئی۔ دانت کچکا پاتا ہوا اس کے قریب ہوا، اسے
اور اس کی کتابوں کو تنفر سے دیکھا تھا۔

”کیا سمجھتی ہے چار لفظ پڑھ کر ہم پر حکومت کر
لے گی۔“

سبز آنکھوں میں ساری بے بسی اتر آئی تھی۔
”حکومت کرنے کے لیے تو حمایت کا ہونا

ضروری ہے، میں تو خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“
”ہونہ خدمت..... خدمت تو تجھ سے ایسی

لوں کا ہے ان کاغذوں کو دیکھ دیکھ کر روئے گی۔“
”اس کی چوکی کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا، اوس
میں ابی سبز آنکھیں اس کی پشت دیکھتی رہ گئی تھیں۔“

حر یہ نہیں چھوڑا تھا اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کا،
کاغذ کی ضرورت ہوتی تو دھڑ دھڑ اس کی کتابیں پھاڑ
لیتا، قلم پیا نہ چاہیے، خجستہ کا بیک حاضر، اسے پڑھائی
میں مصروف دیکھ کر اسے اپنی مصروفیات یاد آ جاتیں،
کمرے میں وہ دھما چو کڑی مچاتا صاف کرنے والے
کے کئی گھنٹے برباد ہو جاتے، زربخت بچیوں کے کام
اور گھر والوں کے لیے کھانے پکانے کا کرتے کرتے
ہی تکلیف سے دہری ہو جاتی تھی، دوسری بیٹی کے
بعد سے اس کی صحت کچھ گرتی جا رہی تھی۔ علائے
کی (L.H.V) لیڈی ہیلتھ وزیٹر سے دوا لی۔ کچھ دیر
کو فرق پڑ جاتا لیکن بھاری کام کرنے سے گردے کی
جگہ بہت درد ہوتا تھا اسی لیے صفائی ستھرائی کا سارا
کام خجستہ کے سر تھا۔

کالج جانے سے پہلے چیزیں سیٹ جاتی،
آتے ہی گھر الٹا ملتا تھا، ہر جگہ درخزنی کی چیزیں، جو
کمرے کی حالت تھی وہ تو الامان، وقت کی کمی کا
بہانہ اس نے اس خوف سے نہیں رویا کہ وقت نکالنے
کے لیے اسے کالج سے اٹھا لیا جاتا۔

ایک دن صفورا چاچی کو یہی خیال آیا تھا، وہ بھی
اس لیے کہ کئی دن سے دیکھ رہی تھیں وہ کالج سے تھکی
تھکی آتی ہے کھانا کھا کر کام میں لگ جاتی ہے۔ کئی
بار دیکھا اپنا یا تھا، کن پٹیاں پوروں سے آہستہ آہستہ
سہلا رہی ہوتی تھی۔

”تھک گئی تو رہنے دے، ٹھہر کر ہو جائے
گا..... آتے ہی لگ جاتی ہے۔“

اس نے فوراً ہاتھ نیچے کر لیے۔
”نہیں چاچی، ویسے ہی بس..... شام کو تو پڑھنا

بھی ہوگا۔“
”ایک تو تجھے پڑھنا لے ڈوبے گا..... لعنت

بھیج ایسے پڑھنے پر، جوانی میں سر دیکھنے لگے۔“
خجستہ نے لعنت اپنے سر درد پر بھیجی اور کام میں

لگ گئی۔ اس کے شوق پر دل کچھ سبجا بھی تھا تو درخزنی
سے چاچی نے کہہ ہی دیا۔

”لگتا ہے تو گھر میں رہنا بھول گیا..... تجھے

”ڈنڈے تو نہیں ماریں گے۔“
”دیکھا دیکھا..... دامی، ابھی سے کتنی زبان
ہے اس کی..... کل کو اور آگے سے چلانے لگے گی۔“
کمرے کی جانب بڑھتے خجستہ کے قدم اس
کے جملوں پر رکے، بلیٹ کر آئی اور مستحکم انداز میں کہا۔
”پڑھوں گی تو قلم چلے گا، زبان رک جائے
گی۔“

درخزنی نے نخوت سے گھورا تھا۔ اس کی ایک
فیصد مرضی بھی نہیں تھی وہ مزید آگے بڑھے، ہر ممکن
احتجاج کیا تھا لیکن امروز لالہ نے اس کے غصے کو زری
سے قابو کر لیا تھا۔

☆☆☆

اس کا ڈگری کالج میں پہلا دن تھا اور خجستہ نے
ذہن پر ایسے سوار کر رکھا تھا جیسے اس کا پہلا امتحان
ہو۔ ایک ایک چیز بیک میں موجود ہونے کے باوجود
کوئی دس بار اٹھ اٹھ کر بیک چیک کیا تھا، پھر یہ معمول
بن گیا۔ رات کو ہر چیز تیار کر کے تسلی سے سرہانے
رکھتی تھی، اسے پتا تھا اس کام میں اس کا ساتھ دینے
والا کوئی نہیں ہے، عام طور پر بچوں کی چیزیں مائیں
تیار کر کے رات کو سوتی ہیں، لیکن خانی بیگم اس حق
میں ہی نہیں تھیں کہ وہ پڑھے، انہیں یہی فکر تھی کہیں
پڑھائی اس کا دماغ اونچا ہی نہ کر دے۔ ہم میں
، ہماری روایات میں نقص نکالنے لگے۔ صرف دامی یا
امروز ہی تھے جنہوں نے ڈرتے ڈرتے۔ اسے
داخلہ دلوادیا تھا، خجستہ کے لیے یہی بہت تھا۔

وہ امروز لالہ یا دامی کے ساتھ ہی کالج آتی
جاتی، بہار سردی، گرمی، بارش طوفان اسے کسی چیز
سے غرض نہیں تھی۔ بس اسے نمبر چاہیے تھے، اتنے
کہ اس کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو جائے۔ اسے
انتاپتا تھا پرائیوٹ میڈیکل تعلیم کے لیے اس پر کوئی
پچاس ساٹھ لاکھ خرچ نہیں کرنے والا، اور کرتے بھی
کہاں سے؟ گھر کا ساز و سامان بیچتے، یا خود کو
..... جو کرتا ہے اسے اپنی محنت کے بل پر کرتا ہے۔
اس کی محنت پر ہی درخزنی کو بل پڑتے تھے، کوئی

جاتے ہی لمحہ بھر کے لیے تو چکر سا آیا تھا۔ جھٹکے سے آنکھیں بند ہوئیں، پھر کھولیں، بالکل صحیح تو نہیں لیکن کچھ سکون ملا تھا۔ خاص کر دائیں آنکھ کو، ہوسکتا ہے دونوں کی دائیں آنکھ کا میرا ایک ہو، کچھ دیر لگا کر رکھنے کے بعد جب اسے لوٹائی تھی تب عد سے کی اہمیت کا پتا چلا تھا۔ آنکھ شدت سے چاہ رہی تھی اسے اس عد سے دیکھا جائے۔ نجستہ نے پلوٹہ سے استفسار کیا۔

”یہ کتنے کی ہے.....؟“

”پورے ہزار کی، میرے دامی کتبہ موڑ والے عینک ساز کے پاس لے کر گئے تھے، تم بھی اسی کے پاس چلی جانا۔“

”میں دامی سے کہوں تو شاید وہ مجھے بھی لے جائیں، عینک تو لگ جائے گی، مگر اور بہت کچھ چھین جائے گا۔“ سندوری ہونٹ کچلتے اس نے دل میں سوچا تھا۔

کوئی اور تدبیر نہیں تھی اس درد سے چھکارے کی، دو دن بعد اس نے پلوٹہ سے التجا کی۔

”ایسا نہیں ہوسکتا تم اپنی عینک مجھے دے دو، میں تھوڑے تھوڑے کر کے پیسے دے دوں گی۔“

اس کی احمقانہ بات پر پلوٹہ حیرت میں گھر گئی۔

”ہر کسی کا الگ نمبر ہوتا ہے نجستہ! تم چیک کرواؤ۔“

”نہیں، مجھے اس سے صحیح دکھائی دے رہا تھا، میرا یہی نمبر ہوگا، تم اور بنو الیتا۔“

پلوٹہ نے کچھ دیر سوچا پھر چھٹی کے وقت اتار کر اسے دے دی۔

”میں دامی سے کہہ دوں گی، میری ٹوٹ گئی..... تم رکھ لو۔“

درد کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی کسی کی چیزوں نہ لیتی۔ خود دار پٹھان تھی، لیکن کیا کریں ظالم درد کا جو بعض اوقات خود داری پر چھا جاتا ہے۔ اس نے پکڑ کر عینک بیگ میں رکھ تولی اب لگانا کون سا آسان تھا۔ ایسی چیز تو تھی نہیں گلے میں چھن دوپٹے سے

چھپائے رکھتی، یا بازو پر باندھ لیتی، چہرے پر نکائی تھی، دن میں جیسے تیسے چندھی آنکھوں سے گزارا کرتی تھی مگر رات کو جب سب اپنے کمروں میں ہوتے وہ عینک جما کر بڑھتی، کسی آہٹ پر اتار کر بیگ میں رکھ لیتی۔ اس عینک کی آنکھ پجولی کو تیسرا دن تھا۔ وہ اپنے بڑھنے میں گمن تھی۔ امروز لالہ کسی کام سے باہر نکلے اس کے عینک جی دیکھ کر ٹھٹھک سے گئے۔

”یہ کب لگی.....؟“

وہ جلدی میں چھپا بھی نہ سکی، ہلتی رنگ چہرے پر چھا گیا تھا۔

”پلوٹہ کی ہے۔“

”تم نے کیوں لگا رکھی ہے.....؟“

”وہ مجھے..... اس سے..... صحیح نظر آتا ہے۔“

اس کے تھوک نکل نکل کر کہنے پر لمحہ بھر تو اسے دیکھتے رہے، اپنی گرم چادر صحیح طرح سے پٹی پھر ایک کرسی بچ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

”اگر اتنا مسئلہ تھا تو کیا بتانا نہیں چاہیے تھا، اس طرح کسی دوسرے کی لگا کر مزید خراب ہو گئیں تو.....؟“

”جیسے بتاتی اس نے ایک ہی بات کہنی تھی۔“

اس کے لہجے میں یک لخت نمی کھل گئی تھی۔

”بڑھنے سے ہوئی ہیں، دفع کرو پڑھائی کو.....“

”غلط بھی نہیں ہے یہ..... اتنا پڑھ کر کیا کرو گی نجستہ..... ہم پہاڑی لوگ ہیں۔ ہمیں پہاڑوں میں ہی رہنا ہے۔“

”ہاں..... لیکن ہم پہاڑ تو نہیں ہیں..... انسان ہیں، ہمیں پہاڑوں میں ہی راستے بنانے ہیں۔“

اس کے ٹھوس انداز پر وہ کچھ دیر اس کا چہرہ ٹوٹتے رہے، اس گھرانے کی کسی لڑکی نے بھی ایسا سوچا بھی نہ ہوگا جو وہ کہہ جاتی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا نجستہ! تم میں پڑھائی کا اتنا جنون کس نے بھر دیا؟“

”لیکن میری سمجھ میں آتا ہے لالہ۔“

توقف کے دوران ہونٹوں کو چلتی بہت درد سے بولی

تھی۔ ”میرے باپ کی خون میں لت پت لاش نے، میری ماں کے ناقص علاج سے ہونے والے لنگ نے، اور میری بہن کے روزاٹھنے والے درد نے۔“

☆ ☆ ☆

صبح چہرے کی سبز آنکھیں لال پانی میں تیر رہی تھیں، جس میں جمال خان کا خون میں لتھڑا جسم کراہ رہا تھا۔ پہاڑی لوگوں کی خاندانی دشمنی کی داستان ایک معمول کی بات ہے وہ بھی اسی معمول کا شکار ہوا تھا۔ پہلے دادا اس خاندانی دشمنی کی بھیئت چڑھا پھر جمال خان حالانکہ مرنجاں مرنج انسان تھا۔ جس کا حاملہ پھر کسی وقت براٹھا رکھتے ہیں۔

کیسے صلح ہوئی، کتنے لوگ اس کی بھیئت چڑھے لیتا سر مایہ لگا، کون کون سی زمین کی، لیکن فی الوقت جمال خان کی جان لیوں پر تھی۔ ٹانگ پر اور کمر کے نیچے چار گولیاں لگی تھیں، ٹانگ والی تو گوشت کو بھاڑ کر خود ہی نکل گئی مرہم پٹی قرمبی ڈپسری میں ہو گئی لیکن کمر والی گولی ہڈی میں ایک گئی تھی جسے نکالنے کے لیے باقاعدہ آپریشن کی ضرورت تھی۔ ڈپسری میں نہ تو آپریشن تھیز تھا، نہ ہی کوئی سرجن۔

یہ انک کے قریب ہی کا مرہ نواحی علاقہ تھا، گاؤں اور شہر کو ملانا کتبہ موڑ اب اتنی دور بھی نہیں تھا یہی کوئی تیس سے چالیس منٹ کی ڈرائیو پر، وہاں الٹرز بھی تھے ہسپتال بھی، کچھ وقت ڈپسری میں، باہر ہو گیا تھا، کچھ تیس چالیس منٹ کا فاصلہ طے کرنے میں، اس سے پہلے کہ جمال خان کے قدم ہسپتال تک پہنچتے، اس کے پیروں سے روح نے قدم باہر نکال لیے تھے۔

نجستہ کی عمر اتنی نہیں تھی کہ کچھ سمجھ سکے، لیکن لوگوں کے بین نے سمجھنا بہت آسان کر دیا تھا۔ پلوٹہ لی ماں بار بار کہہ رہی تھی۔

”خانہ خراب ڈپسری والا، گولی نکال دیتا تو اتنا ٹھون ساٹع نہ ہوتا۔“

”مزے (ارے) بتایا تو ہے، ڈاکٹر یہاں لوں، اوتا۔“

”جو تھا پاگل کا باچہ (بچہ) وہ خود نکال دیتا، ڈاکٹر ضروری ہے.....؟“

”اے بہن، گولی بڑا ڈاکٹر نکالتا ہے ڈپسری نہیں۔“

”اودہ تو گولی ڈاکٹر نکالتا ہے۔“ نجستہ کے سبے ذہن نے ایک بات سمجھی ہی تھی کہ چاچی نے ایک سفید چادر لاکر بہت دیر سے سکتے میں بیٹھی خانی بیگم کے اوپر ڈال دی تھی پھر جو خانی بیگم کا سکتہ ٹوٹا تھا، اس کی چھین آج بھی نجستہ کے کانوں میں گرم سلاخوں کی طرح گھس رہی تھیں۔ غم پلکوں کے سائے میں ماضی ابھر کر معدوم ہوا، لرزنی پلکیں اٹھا کر اس نے امروز خان کو دیکھا تھا وہ متاسفانہ مسلسل اسے دیکھ رہے تھے۔

”لالہ! میرا باپ گولی کتنے سے نہیں مرا تھا، گولی نہ نکلنے کی وجہ سے مرا تھا..... اگر ڈاکٹر ہوتا، شاید میرا باپ بھی ہوتا۔“ سبز جھیل سے پانی گلابی رخساروں پر چھلکا۔ ”سب کچھ ہے میرے پاس، محبت، شفقت، خیال، پیار لیکن میرے دامی نہیں ہیں۔“ اک ننھی سسکاری نے سندوری ہونٹوں پر دم توڑا، جڑے غم ہو کر بھاری ہونے لگے، بھلے باپ سخت گیر ہو، مگر اس کا ہونا ہی بیٹیوں کے لیے اپنی چھت جیسا ہے، اور نجستہ کو اپنی چھت تنکوں کی لگتی تھی۔

”اور لالہ..... مرا تو میرا باپ تھا، سفید کفن میری ماں پر کیوں لپیٹا تھا، میری ماں کی وہ چھتیں، میرے باپ کے خون کے قطرے میرے اندر جنون بھر رہے ہیں، مجھے ڈپسری میں ڈاکٹر بن کر بیٹھنا ہے..... کسی اور کی ماں سفید کفن نہ لپیٹے بہت درد ہوتا ہے بچوں کو ماں کی چیخوں سے، باپ کی موت سے۔“

اس کے لہجے کی نمی سے امروز خان کے دل کو دھکا سا لگا تھا، دل گرفتگی سے اٹھتے اٹھتے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”نجستہ بچہ! یہ سب تقدیر میں لکھا تھا، ہونا ہی

تھا۔

”تقدیر کون لکھتا ہے لالہ.....؟“

وہ یک لخت ان کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اللہ لکھتا ہے ناں تقدیر، تو پھر اس نے جنت دوزخ کے راستے کیوں بتائے ہیں..... تقدیر میں تو لکھا گیا ہوگا فلاں برا ہے، وہ دوزخ میں جائے گا، جس کو اچھا لکھا اس نے نیکی کرنی ہی کرنی ہے..... پھر جنت کے حصول اور دوزخ سے بچاؤ کی محنت کیوں.....“ امروز خان کی متاسفانہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی جا رہی تھیں ”نہیں لالہ..... تقدیر میں بہت سا حصہ تدبیر کا بھی ہے..... اور میں صرف تدبیر کی کوشش کر رہی ہوں.....“ تقدیر کو رنگ اللہ نے چڑھانا ہے۔

☆☆☆

مشکلات ضرور تھیں لیکن اس کی کوشش رائیگاں نہیں جا رہی تھی، امتحان نزدیک آرہے تھے، محنت بڑھتی جا رہی تھی۔ امروز خان پہلے ہی اسے کتبہ موڑ کے ڈاکٹر سے عینک لگوا لائے تھے۔ پلوٹہ کی واپس کر دی تھی۔ عینک کا بھی عجیب ہی قصہ تھا۔ حد درجہ احتیاط کے باوجود ٹوٹی ہوئی ملتی تھی۔ خانی بیگم الگ ڈاکٹریں، چاچی الگ لاپرواہی کے طعنے دیتی۔ ٹوٹی بھی ایسے جیسے غصے میں پکڑ کر دو کلڑے کی گئی ہو۔ یہ آج تک پتا نہ چل سکا کہ عینک پر غصہ کون نکالتا تھا، جب کہیں رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے اٹھی، ٹوٹی ہوئی ملی۔ خجستہ نے آخر اسے ڈوری سے باندھ لیا۔ سوتے ہوئے گریبان میں ڈال لیتی، عینک محفوظ ہوگئی، درخزئی کا غصہ بڑھ گیا۔

انٹر کے امتحانات کا شیڈول جاری کر دیا گیا تھا، اسے یقین تھا سال دوم کا نتیجہ سال اول سے بھی بہترین ہوگا۔ بات ایف ایس سی پر ہی تھوڑا ختم ہوئی ہے، UHS (یونیورسٹی آف ہیلتھ اینڈ سائنسز) نے میڈیکل کے داخلے میں طلبہ کے قد سے بھی اونچی رکاوٹ انٹری ٹیسٹ کی لگا رکھی ہے، پڑھے لکھے خاندان، یا شہروں میں رہنے والے پھر اس بات کو کسی حد تک سمجھتے ہیں کہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے بھی

کسی ادارے میں جانا پڑتا ہے، لیکن جن علاقوں میں میڈیکل کی بنیاد ہی نہ ہو وہ اس بات کو کیا سمجھیں۔ ”مڑے (ارے) تم تو کہہ رہی تھیں بارہویں کی کتابوں سے پرچا آئے گا، وہ پڑھ تو لیں اب کیسی تیاری۔“ خانی بیگم حیران تھیں، چاچی گھور رہی تھیں۔ خجستہ ان معصوم عورتوں کو اپنا فرسودہ نظام تعلیم کیا سمجھاتی، ایف ایس سی کے اندر استاد جو حصہ یہ کہہ کر چھڑوا دیتے ہیں۔

”بچوں یہ پیپرز چھوڑ دو، اس میں سے کبھی پیپر نہیں بنتا، پچھلے پانچ، چھ سال کے پیپرز دیکھ لو، یہ سوال نہیں ملیں گے، باقی کی تیاری کرو۔“ وہ ہی ایف ایس سی کا مشکل ترین حصہ میڈیکل کالج کے انٹری ٹیسٹ کا نچوڑ ہے، دو سالوں میں استاد وہ مشکل حصہ پڑھانے سے گھبراتے ہیں، پوچھ ایس یہ چاہتی ہے بچے نوے دن کی تیاری میں وہ انگلیوں کی پوروں پر کسی روبروٹ کی طرح یاد کر لیں۔ سلام ہے اس دور کے بچوں پر وہ پھر بھی کر لیتے ہیں۔ کر تو خجستہ بھی لے گی مگر اسے اس ادارے تک جانے کا راستہ تو ملے۔

ایم۔ کیٹ (میڈیکل کالج انٹری ٹیسٹ) کی کلاسز تمام کوچنگ سنٹرز میں پیپرز سے اگلے دن ہی شروع ہو چکی تھیں اور میڈیکل کے تمنائی بچے دھڑا دھڑا اس میں داخلہ لے کر اکیڈمی مافیا کی ہانڈی بھر رہے تھے، ایک تو کامرہ انک کا نواحی علاقہ، پھر گھر والوں کو قائل کرنے میں اسے پندرہ دن لگ گئے تھے۔ امروز خان اس کے شوق کے آگے ہار گئے انہوں نے ہی داجی کو قائل کیا تھا۔

”ایک میڈیکل کالج لڑکیوں کا بھی ہے فاطمہ جناح میڈیکل کالج..... ہو سکتا ہے اس میں نا آجائے، آج کل سب کی لڑکیاں پڑھ رہی ہیں اور اس کا شوق ہے، ہمیں دیوار نہیں بننا چاہیے داجی.....“

اگر شوق کو راستہ گھروالے نہ دیں تو وہ جنوا بن جاتا ہے۔ جنون پستی کا دوسرا نام ہے۔ داجی

قائل کر کے اسے پستی سے امروز لالہ نے بچالیا تھا، انہوں نے ہی ایک دین کا انتظام کیا جو اسے انگ شہر کی اکیڈمی تک لانی لے جاتی، دن تو بہت گرم تھے مگر پہاڑ ان کی گرمی کو کسی حد تک جذب کر لیتے تھے اس نے دن رات محنت کی تھی، ساری تیاری مکمل تھی رول نمبر دے کر دن کا اعلان ہو چکا تھا۔

☆☆☆

عموماً اکیڈمی ”بیٹ آف لک“ کارڈ دیتے ہوئے آخری دن کی چھٹی دے دیتی ہے، تاکہ بچے مطمئن ہو کر اپنی تیاری کو فاصلے پر دے لیں، اس نے ساری رات پڑھا تھا، فجر پڑھ کر کچھ دیر کو سوئی، سورج اونچا ہوتے ہی اٹھ گئی۔ آج اکیڈمی نہیں جانا تھا، کیوں کہ بیٹ آف لک آزمائش تھی، سارا دن اپنا تھا۔ آٹھ کتابیں، دو سال کی محنت اک طرف اس ایک دن کی محنت ایک طرف۔ وہ ناشتہ کرتے ہی کتابیں لے کر درپے میں بیٹھ گئی۔ داجی اور امروز لالہ اپنے کام سے باہر تھے، کچھ ہی دیر میں صحن کے نیچوں دنچ دھاڑ دھاڑ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس نے دو تین بار ناگواری سے دیکھا۔ اور خزئی گھر کا مین دروازہ اتارے جانے اس میں کیا ٹھوک رہا تھا۔ چاچی سر پر دوپٹا باندھتی ہوئی پوچھنے آئی تھیں۔

”کیا ٹھک ٹھک لگا رکھی ہے، ہمارا سر پھٹنے کو ہو گیا۔“

”دروازہ خراب ہو رہا ہے، وہ ٹھیک کر رہا ہوں۔“

کہہ کر اس نے پوری قوت سے پکی لکڑی پر ہتھوڑے برسائے شروع کیے، خجستہ سارے دن کی ٹھاٹھا سے تنگ آ گئی تھی۔ آٹھ کے آئی اور بہت جی انداز میں بولی۔

”خدا کے واسطے کل ٹھیک کر لیتا۔“

”اچھا!! تاکہ گھر میں چور گھس آئیں، دیکھا

نہیں، دیمک نے سارا لکڑی کھا لیا ہے۔“ اس نے آری کے ساتھ دروازے کا ایک حصہ

کاٹ کر الگ کیا اور پکی لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کر میٹھیں اس میں گاڑنے لگا۔

”ایک دن سے کیا ہوتا ہے ایک دن میں دیمک نہیں کھا جاتی۔“

خجستہ کی منتوں پر اس نے استہزائیہ دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”دیمک ایک دن میں واقعی نہیں کھاتی..... ہونہ۔“

اس نے گردن جھٹک کر پہلے سے بھی زیادہ قوت سے ہتھوڑے برسائے شروع کیے۔ خجستہ نے جا کر کمرے کا دروازہ بند کر کے ہتھیلیاں کانوں پر جما لی تھیں۔ اسے اپنی بے بسی پر بہت روٹا آیا تھا۔ اسے وہ سب لڑکیاں یاد آنے لگیں جو روز کہتی تھیں۔

”میرے داجی نے، آج کل گھر میں مہمانوں کی آمد پر پابندی لگا رکھی ہے..... میں ڈسٹرب نہ ہوں ناں۔“

کوئی کہتی ”مورے (ماں) میرا بہت خیال کرتی ہے۔ باوام اخروٹ دودھ کے ساتھ دیتی ہے..... پڑھ پڑھ کے سر دکھنے لگتا ہے ناں۔“

اور خجستہ کے سر پر ہتھوڑے برس رہے تھے، آہنی ہتھوڑے سے میٹھیں لکڑی میں ٹھونکنے کی آواز سارے گھر میں گونج پیدا کر رہی تھی۔ اسی گونج میں اسے تیاری کرنا بھی اور وہ کر بھی رہی تھی۔

☆☆☆

دروازہ ٹھیک ہو کر لگ چکا تھا۔ درود یوار کی گونج ختم ہوئی ہی تھی کہ سارے گھر میں یک لخت اندھیرا چھا گیا۔ اس نے دروازے سے باہر درخزئی کو جاتے دیکھا تھا اور بس اندھیرا، گھر کی ساری بتیاں چیک کر لی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا لائٹ کو ہوا کیا، داجی گھر آچکے تھے۔ امروز خان نے سوئچ چیک کیے، یہی لگا شاید وائیرنگ اڑ گئی، داجی نے تو درخزئی سے کہا بھی۔

”تم گھر میں تھا کسی کو دکھا دیتا۔“

”داجی جو ہوا ہے ابھی ہوا ہے، ہمیں کیا پتا وائیرنگ خراب ہو یا بجلی پیچھے سے گیا ہے۔“

اللہ تو بہر حال جانتا ہی تھا، جستہ کو بھی پورا یقین تھا۔ درخت کی کا کچھ ہاتھ ضرور ہے، اور واقعی اس نے میٹر کا سلائی تار چبکے سے کاٹ دیا تھا۔ گھر میں ایک دو چار جنگ لائیں تھیں۔ کوئی لے کر کمرے میں جا رہا تھا، کوئی باتھ روم یا کچن میں، جستہ نے امروز لالہ کے موبائل کی ٹارچ آن کی۔ موبائل منہ میں دبائے نو میرے نظر حل کئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اٹھ کر آتا پانی اور دل کی دھڑکن واضح کہہ رہی تھی۔
”درخت کی تمہارے اندھیرا کرنے سے کچھ نہیں ہونے والا، بس میرا اللہ اندھیرا نہ کرے۔“

☆☆☆

تھکن سے پھر رات ختم ہوئی سنہرا دن طلوع ہو چکا تھا۔ انٹری ٹیسٹ کے مرکزی سنٹر کا بھرپور تار چر اپنے نازک کندھوں پر اٹھاتے بچے گروہ درگروہ موجود تھے، تیار ایمبولینسز، نمبریری میڈیکل کمپ، اور ماں باپ کی تسبیحات..... چونتیس سو سیٹوں کے لیے اس ملک کے ذہن ترین ساٹھ ہزار بچے تقدیر اور تدبیر کے رنگ دیکھنے نکلے تھے۔ ہر طبقے کا بچہ تھا۔ جستہ نے مرکز میں قدم رکھنے سے پہلے ایک نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھتے ایک بات سوچی تھی۔
”نہیں بدل سکتا کوئی اسے، اگر میرا رب ارادہ کرے۔“

ہمیں وقت سے پہلے چاہیے ہوتا ہے لیکن رب کے ارادے وقت پر رنگ دکھاتے ہیں، رب کے ارادے کا رنگ چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔

حسب روایت مشکل سے مشکل ترین پیپر مخصوص وقت میں حل کر کے وہ بہت پر امید واپس لوٹی تھی شام تک نیٹ پر آنسر کی لسٹ (درست جواب) بھی آچکی تھی۔ جستہ کی تقدیر پر تدبیر کا رنگ چڑھ گیا تھا۔ جب میڈیکل کالج کی لکھیں لکھیں اپنا مکمل نام تاریخ پیدائش، شہریت، راولپنڈی میڈیکل کالج کی لسٹ میں جگہ گاتا دیکھ کر وہ اندھا دھند بھاگتی آئی تھی۔ خوشی سے بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا، اور سبز آنکھیں نم، دالان کی جانب بڑھتے اس کے قدم

دامی کی آواز پر تھم گئے تھے۔

”امروز خان! تم تو کہتا تھا اس کا داخلہ لڑکیوں کے کالج میں ہو جائے گا، لیکن پنڈی کے کالج میں تو لڑکے ساتھ پڑھتے ہیں۔“

ہاں دامی..... نمبر تو اس کے بہت تھے، میرٹ اس سال اور اوپر چلا گیا..... کیا کیا جاسکتا ہے۔
یعنی کہ امروز لالہ اس سے پہلے میرٹ لسٹ چیک کر چکے تھے۔

”کیا مطلب ہے کیا کرنا ہے۔“

امروز کے جواب پر درخت کی پورے کر دفر سے تڑپ کر اٹھا تھا۔ ”اب ہم اتنا بے غیرت ہو گیا ہے، اسے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے بھیجیں..... بٹھاؤ گھر میں، ورنہ بھاگ جائے گا وہ۔“

سننے ہی جستہ کے پاؤں زمین میں گڑ گئے تھے، اس نے ترحم بھری نگاہ سب پر ڈالی تھی۔ خالی بیگم، سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ چاچی انگلی گال میں گاڑے درخت کی بات پر غور کر رہی تھیں۔ شروع سے دیو زربخت کو تو بھاگ جانے کے خوف سے پسینہ آ گیا تھا۔ امروز لالہ، دامی چپ تھے۔

کبھی کبھی ہماری جنگ میں ہمارے ماں باپ بھی ساتھ کھڑے نہیں ہوتے، حالات سے ڈر جاتے ہیں۔ باپ تو تھا نہیں، اور ماں خوفزدہ، اسے اپنے لیے خود لڑنا تھا۔ وہ قدم اٹھاتی ان کی جانب بڑھی، قدم اس قدر بھاری تھے اسے لگا زمین اس کے قدموں سے چپک گئی ہو۔ خوشی سے لرزتا بدن خوف میں ڈھل گیا تھا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے اپنے قدموں میں جان پیدا کی، آواز پر قابو رکھا۔
”دامی! میں پہاڑوں کی بیٹی ہوں..... پستیوں سے بچنے کے لیے، اونچے نیچے راستوں پر مجھے جما کر قدم رکھنے آتے ہیں۔“

سب نے ہی چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ درخت کی تو ایسے دیکھ رہا تھا، جیسے ابھی چیر پھاڑ کر اسے پستیوں میں پھینک دے گا مگر وہ بچی انداز میں دامی کو دیکھتے ہوئے کہتی رہی۔

”جو خود کھائی سے ڈرتی ہو، وہ اپنے دامی یا لالہ کو مارنے دے گی.....؟“

اس کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس سے کرنے کے لیے سوال بہت تھے کیے بھی تھے، اب دیتی رہی قائل کرتی رہی اور آخر جب کچھ بات بنتی نظر نہ آئی تو آخری حربے کے طور پر کہا تھا۔
”امروز لالہ! مجھے صرف ایک بات کا جواب دے۔“

امروز اور سیف اللہ نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ وہ قطعیت سے کہہ رہی تھی۔ ”ہم بیٹیوں کو لڑکے بننے نہیں دیتے، بہت کھلی تعلیم ہے یہ، لیکن بیوی کے علاج کے لیے لیڈی ڈاکٹر ہی کیوں ڈھونڈتے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر کی تلاش میں وہ درد سے تڑپ کر مر جائے۔“

درخت کی اس کی بات پر استہزائیہ ہنسا تھا۔ امروز نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے مگر اس کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”زوار کا کا کی بیوی تو سب کو یاد ہوگی ایسی بھولنے والی بات ہے تو نہیں۔“

زوار خان پہاڑ کی پچھلی جانب کی گلیوں میں رہتا تھا۔ بہت نیک خدا ترس انسان، اس کی بیوی زربینہ کو جانے کیا ہو گیا تھا۔ تکلیف ہاتھوں کی معمولی غارش سے شروع ہوئی تھی پھر سارے بدن میں پھیل گئی۔ غارش کرنے پر چھوٹے چھوٹے دھڑبن ہاتھ جن میں سرخ دانے بننے لگے، کوئی چھپا کی کہتا کوئی چنیل، دانے سرخی سے زردی میں ڈھلنے لگے تھے، پہلے گھریلو علاج شروع ہوا، فرق نہ پڑنے پر اس پر دوس کے ٹوٹکے، تکلیف شدت پکڑنے لگی تو بات علیم تک جا پہنچی۔ زوار خان حکیم کو حالت بتا کر مرہم لے آیا جتنی دیر مرہم لگا رہتا، سکون رہتا جیسے کچھ وقت گزرتا گیا غارش میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ زخم رسنے لگے۔ کسی نے انک لے جا کر ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا۔ زوار نے لالہ کو اس سے پتا کر لیا تھا انک میں جلد کی کوئی لیڈی

ڈاکٹر نہیں تھی۔ مرد ڈاکٹر کو وہ اپنی بیوی کا جسم دکھائے، اس سے کہیں بہتر تھا وہ مر جائے، پھر ایسا ہی ہوا، لیڈی ڈاکٹر تو نہ ملی البتہ وہ خالق حقیقی سے جا ملی۔ اس کے مرنے سے فرق کسی کو نہیں پڑا تھا، نہ زوار کو نہ زوار کے گھر کو، کیوں کہ گھر کی ابتری دیکھ کر دو ماہ میں ہی زوار نے دوسری شادی کر لی تھی، لیکن اس کی دو سالہ بیٹی کی زندگی سارے محلے نے دیکھی تھی۔ تین وقت کے کھانے کے ساتھ مار پیٹ بھی خوراک میں شامل ہو چکی تھی۔ کسی وقت کی خاموش بچی کی ضد اب پورے علاقے میں مشہور تھی۔ سب کو ترس آ جاتا تھا سوائے زوار خان کے۔

جستہ نے جس انداز میں کہا تھا امروز کی آنکھوں کے سامنے زوار خان کی روٹی ہوئی بیٹی آکھڑی ہوئی تھی، دامی چپ تھے، درخت کی کا چپ رہنا ہمیشہ ہی مشکل رہا تھا، جستہ پھلاتے ہوئے بولا تھا۔

”بیماری اور شفا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں زوار کا کا، کا کیا قصور.....؟“

”شفا اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، شفا کے لیے بھاگ دوڑ بھی اللہ ہی کا حکم ہے، اگر علاج کا حکم نہ ہوتا تو علاج کے اللہ طریقے ہی نہ بتاتا..... کیوں امروز لالہ.....؟“

اس نے درخت کی کو نظر انداز کرتے ہوئے امروز کی جانب دیکھا تھا۔ ”علاج کا حکم ہے نا..... اور کیا ہم علاج کے لیے لیڈی ڈاکٹر نہیں ڈھونڈتے..... بے شک تلاش میں بیماری کتنی بڑھ جائے۔“
امروز کی نگاہ میں پشیمانی لہرائی تھی۔ زربخت کی گردے کی تکلیف بھی یوں ہی بڑھتی جا رہی تھی، علاقے کی گائنا کالوجسٹ کو دکھایا تھا۔ اس کا خیال تھا الٹرا ساؤنڈ ہو، تاکہ بیماری واضح ہو۔ اور الٹرا ساؤنڈ لیڈی اسپیشلسٹ نزدیک علاقے میں کہیں بھی نہیں تھی۔ یہی طے تھا کبھی وقت نکال کر راولپنڈی جائیں گے تو یہ کام بھی ہو جائے گا۔ جستہ کی باتوں پر امروز کی نگاہ زربخت پر پڑی۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے سے اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے اچھے خاصے آثار تھے،

اس کی گود میں بے فکر سوتی چھوٹی سی پری پر امروز کی نگاہیں گڑی رہ گئی تھیں اور ایک منٹ لگا تھا انہیں خجستہ کی حمایت کرنے میں۔
”تم اپنی تیاری شروع کر دو میں تمہیں چھوڑ کر آؤں گا۔“

داجی امروز کا چہرہ دیکھتے رہ گئے مگر بولے کچھ نہیں۔ درخزنی نے بہت شور مچایا، یہاں تک کہا کہ منگنی توڑ دے گا..... امروز نے اس سے ایک بات کہی تھی۔
”خواجواہ کی ضد پر احمقانہ فیصلے نہیں کیے جاتے۔“

☆☆☆

گھر کا فرد ہاتھ تھام کر چلائے تو خوشی دگنی ہوتی ہے، خجستہ بھی بے حد خوش تھی جب امروز لالہ اور زربخت اسے کالج چھوڑنے آئے تھے۔ امروز نے دو دن پہلے آکر ہاسٹل اور کالج کے تمام واجبات جمع کروادیے تھے، اصل ڈاکو منٹس کیوں کہ اسٹوڈنٹ کو خود جمع کروانے ہوتے ہیں اس لیے یہی کام رہ گیا تھا۔ وہ حیزی سے ایڈمن آفس کی جانب بڑھے ہی تھے سامنے سے سینئرز کا ایک بچہ قریب آیا۔

”آپ فرسٹ ایئر میں ہیں۔“

”لیں۔“

اول تو فرسٹ ایئر کی تصدیق قطعاً ضروری نہیں اپنے ہونق پن سے دور سے پہچانی جاتی ہے، لیکن خجستہ نے خاصے اعتماد سے گردن ہلائی تھی۔
”ویکرم ویکرم۔“

ایک لڑکا جوش سے ہاتھ ملانے کے انداز میں آگے بڑھا، خجستہ جھینپ کر دو قدم پیچھے ہو گئی۔ امروز خان کی آنکھوں میں یک دم آجانے والی سرخی اس کی سامنے لڑکی نے پل میں محسوس کی اور اپنا ہاتھ بڑھاتے مسکرائی تھی۔

”ایچو ٹی ہم سب فرسٹ ایئر کا ہی وہیٹ کر رہے تھے، ہم آپ کے سینئرز ہیں، ہماری ڈیوٹی ہے

آپ کو گائیڈ کرنا، آپ کی کلاس تک لے جانا۔“
خجستہ نے اپنے دونوں ہونٹ اندر کی جانب بھیج رکھے تھے۔ وہ لڑکی اب امروز خان سے مخاطب تھی۔ ”آپ ان کے.....؟“
”بھائی۔“

”بس پھر بھائی! اب آپ بے فکر ہو کر جاسکتے ہیں..... یہ اصل جگہ پہنچ چکی ہیں، یہاں سے فارغ ہو کر ہم سب ہاسٹل چلے جائیں گے، یہ ہمارے ساتھ ہوں گی۔“

امروز کا وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، لیکن جانا تو تھا ہی، جاتے جاتے کئی بار کی کچھ نصیحتیں پھر سے دہرائی تھیں۔

”پہاڑ سے اترنا بہت آسان ہے خجستہ، لیکن چڑھائی کے لیے صرف مضبوط ارادہ اور ہمت چاہیے۔“

”لالہ! میرے قدم جب بھی ڈمگائے تیر واپس آ جاؤں گی۔“

خواہ وہ اندر سے جتنی بھی ڈری ہوئی تھی لیکن بہت آرام سے امروز کی تسلی کی تھی۔
”شباباش۔“

اس کے سر پر چار بھری چھکی دے کر واپسی لیے مڑے تھے، خجستہ گردن موڑے انہیں جانا دیکھ رہی تھی جب اسی لڑکے نے اس کے ہاتھ میں پکڑ فائل اچک لی۔ وہ یکدم گھومی تھی۔

”یہ میری ہے۔“ خجستہ کی دلی سی آواز نکلی تھی۔
”اور بیکل ڈاکو منٹس ہوں گے.....؟“

اس نے فائل کھولتے ہوئے تبصرہ کیا، خجستہ ہاں میں سر ہلاتی رہ گئی۔ جب کہ وہ اطمینان سے رہا تھا۔

”نو پر ایلیم، اسے میں سب مٹ کر داتا ہوا آپ جائیں ان کے ساتھ، آپ کی کلاس ہے.....“
”لیکن یہ تو اسٹوڈنٹ کو جمع کروانے ہیں.....“

نے سنا ہے سائن وغیرہ۔“
اس کے ڈرے لہجے پر سارے گروپ

تباہ لگایا، وہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔ وہ ہی لڑکا دوبارہ ہوا تھا۔

”ہم کون سا کھوتے ہیں، ہم بھی اسٹوڈنٹ ہی ہیں بی بی! سائن بھی کرنے آتے ہیں..... بھلے آپ کا شکل سہی مگر لکھ لیں گے۔ ہماری ایڈمن سے جان پچان ہے۔ ذرا جلدی کام ہو جائے گا آپ کا۔“

گروپ کی کچھ لڑکیاں ہادی کو دانت نکوستے بے دے انداز میں اشارے کر رہی تھیں۔ ”دو اس لی فائل“ ہادی نے واضح کندھے اچکائے اور گروپ کو پٹ کر بولا۔

”سینئرز کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ..... انہیں ای ایچ لے جاؤ، دیر ہو رہی ہے۔ ان کی کلاس مس نہ ہو جائے۔“

”بہت بڑے ہونق ہادی.....“

”اسٹوڈنٹ.....!“

”بدتمیز.....!“

جس کے منہ میں جو آیا اس نے کہا اور خجستہ کو ساتھ لے کر چل پڑے۔

ہاتھوں کو مسلتے ان کے پیچھے چلتی خجستہ کو اپنی فائل کی فکر تھی۔ ”میرے اللہ میں یہاں آ تو گئی، پتا نہیں یہاں کے لوگ کیا کریں گے..... زندگی میں ایک درخزنی کم تھا؟“ پاؤں کے نیچے گھاس روندتا بے لڑ چلتا سینئرز کا گروپ اسے مزید ہراساں کر رہا تھا۔
”ڈاکٹر بننا آسان تھوڑی ہے، بڑے مرحلے ہیں یہاں، کم از کم چھری چاقو سے بالکل نہیں اڑنا..... خیر ہم ہیں ناں آپ کی مدد کو۔“

اور خجستہ کو لگا تھا واقعی اس کی مدد ہونے جارہی تھی۔ آنکھیں تو تب کھلی تھیں جب وہ ڈی ایچ ہال پہنچی تھی۔ ایک عجیب سی بساند میں رچا کرہ جس کی چار دیواری پر شیشے کی کیمبن نما الماریاں بنی تھیں اور سب میں انسانی اعضاء کی ہڈیاں مختلف رنگوں کے ساتھ رکوں اور غلیوں کے ڈائیکرام سے سجا کر ایسے ہی تھیں جیسے قیمتی ڈیکوریشن ہوں، کچھ پلاسٹر آف گس کی کچھ اصل، بنا آنکھوں کی کھوپڑی، اور ایک

جار میں تیرتی آنکھیں دیکھ کر حلق خشک ہوا تھا، لیکن وہاں پہلے ہی فرسٹ ایئر کے لڑکے لڑکیاں کھڑے تھے جنہیں سینئرز کا ایک اور گروپ عجیب و غریب پتھر دے رہا تھا۔ بچے بھی شرم سے سرخ پڑ جاتے بھی خوف سے پیلے۔ خجستہ بھی ان میں آکر شامل ہو چکی تھی۔ وہ جہاں کھڑی تھی اس کے آگے ایک بڑا سا اسٹیل کا پٹی نما لمبا چوڑا ڈیسا رکھا تھا۔ اس ہال میں کئی ڈبے تھے۔ انہیں دیکھ کر یہی تاثر ملتا ”میڈیکل کالج کے ڈیسک لکڑی کے بجائے اسٹیل کے ہیں، کمال ہے۔“

تب ہی اس نے اس پر اپنی کہیاں اور غور سے سینئرز کی باتیں سننے لگی، جن میں اہم بات یہی تھی جو وہ بار بار دہرا رہے تھے۔

”سینئرز کا بہت احترام ہوتا ہے میڈیکل سائنس میں، آپ کو لیچر لیچر دیں گے مگر سمجھائیں گے، ہم، ہماری مدد کے بغیر آپ پاس نہیں ہو سکتے، اس لیے ہم سے بنا کر رکھیے گا۔“

یہاں تک تو بات بالکل ٹھیک تھی۔ میڈیکل میں سینئرز کے بغیر جو نیر واقعی صفر ہوتے ہیں لیکن اس صفر کو اپنی حیثیت بڑھانے کے لیے سینئرز کی کیسی کیسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں یہ بے چارے جو نیرز ہی جانتے ہیں۔ ہال میں ہادی کے داخل ہوتے ہی خجستہ کی نگاہ اس پر گئی تھی۔
”بھائی میری فائل.....؟“

ہادی نے اس کے قریب ہوتے انجان بننے کی اداکاری کی تھی۔

”کون سی فائل.....؟“

خجستہ کے کان سننا گئے۔ ”وہ میرے اور بیکل ڈاکو منٹس..... وہاں گراؤنڈ میں آپ نے لی تھی.....“
وہ ابھی یاد کر رہی تھی۔ ہادی کی نگاہ فارلن باکس پر گئی جیسے وہ اسٹیل کا ڈیسک سمجھے کہیاں نکائے کھڑی تھی، اس نے اپنی شرارت کو کنٹرول کرتے بہت معصومیت سے کہا تھا۔

”اوہ اچھا وہ فائل..... وہ تو اس میں آ گئی۔“

اس نے بھنویں فارمن باکس کی جانب نچائی تھیں۔

”اس میں..... کیسے؟“ وہ بے یقین تھی۔
”آپ کو نہیں پتا..... ایم بی بی ایس میں سب سے پہلے میجک ہی سیکھا یا جاتا ہے، سیکل ہے یار.....“

وہ ایک کرسی کھنچ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ ”ورد آپ کے سر میں ہوتا ہے، ڈاکٹر عینک آنکھوں پر لگا دیتا ہے، ٹھیک ہو جاتا ہے نادر..... خراب پیٹ ہوتا ہے، ڈرپ آپ کے ہاتھ پر لگتی ہے..... بتاؤ غلط کہہ رہا ہوں۔ خون کا پریشر دل میں بڑھتا ہے اور بی بی آپ کے بازو سے چیک کیا جاتا ہے..... ہوتے ہیں ناڈاکٹر باگل۔“

سینئر ہسپی رو کے فرسٹ ایئر کو دیکھ رہے تھے اور فرسٹ ایئر پتھر جیسے سر ہاں میں ہلاتے رہے ہادی جیسے اسٹائل سے بیٹھا تھا ویسے ہی اٹھا اور ٹھوس انداز میں جخت سے بولا۔

”اسی جادو کے ذریعے آپ کی فائل اس میں آگئی ہے۔۔۔ اب ایسا ہے کہیاں ہٹا کر ڈراڈھلکن اٹھائیں اور فائل نکال لیں۔“

اس نے حمایتی نگاہ سب پر ڈالی تھی اور سینئر کی تائیدی نگاہیں اسے ڈھلکن اٹھانے کا کہہ رہی تھیں۔ ڈھلکن اس اکیلی سے تو اٹھنے سے رہا تھا جس طرح سے جمنا تھا۔ فرسٹ ایئر کے دو تین بچے اس کی مدد کو بڑھے تھے۔ اور پھر کیا تھا پورا ڈاکٹر سیکشن ہال فرسٹ ایئر کی دلی دلی چخوں سے گونج رہا تھا۔

بکس میں فارمن (محفوظ کرنے والا کیمیکل) میں بھیگا ایک انسانی ڈھانچہ رکھا ہوا تھا جس کا سارا جسم کسی سیاہ لکڑی کی مانند اکڑا ہوا خوف ناک لگتا تھا۔ سب لڑکیاں ایک دوسرے کے بازو تھامے قدم قدم پیچھے ہوئیں۔ ہادی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں ”ہائیں..... کیا ہوا..... چلو جخت! آپ آگے آؤ..... سلام کرو پھر یہ فائل دے دے گا۔“
”نہیں۔“ وہ مزید پیچھے ہو گئی۔

”بھی کیا نہیں نہیں..... فائل نہیں چاہیے۔“ وہ انکار میں سر ہلاتی رہی۔ ”سوچ لو..... پھر کالج والے نکال دیں گے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کس مشکل سے تو یہاں تک آئی تھی۔ گھر میں صرف درختی تھا مگر یہاں بہت سے لڑکے لڑکیاں اس کی بے بسی پر جس طرح مسکرا رہے تھے سب اسے درختی ہی لگے ☆☆☆

ان کا پہلا دن ویسا ہی گزرا تھا جیسا ہر ادارے میں نئے آنے والے جوئیرز کا گزرتا ہے، سینئرز کا حد سے زیادہ مذاق کرنا یہاں تک کہ جوئیرز رو دینے والے ہو جائیں مگر ان کے مذاق کی حد تمام حدود سے باہر تھی۔

جخت نے کئی بار سوچا تھا اس کا فیصلہ درست بھی تھا یا غلط، شاید وہ واپسی کا ارادہ کر ہی لیتی اگر ہادی کچھ دیر میں اس کی فائل واپس دینے نہ آتا۔

”یہ آپ کی فائل..... اب تو ایڈمن آفس بند ہو گیا ہے، کل فائن کے ساتھ سب مٹ کر وادینا۔“
”اچھا مذاق ہے۔“ جخت کو غصہ تو بہت آیا تھا اور جی کیا کھری کھری سنا دے لیکن اتنے گھنٹوں میں سب لوگ یہ باور کر چکے تھے ”اگر سینئرز سے بگڑ گئی سمجھو ایم بی بی ایس مشکل ہو گیا۔“

اور یہ بات غلط بھی نہیں ہے۔ میڈیکل میں اتنا استاد نہیں پڑھاتے جتنا سینئرز سمجھا دیتے ہیں، اور اگلے دن ہونے والی افتتاحی تقریب میں حلف کے بعد پرنسپل نے واضح الفاظ میں سمجھا دیا تھا۔

”ragging (مذاق) ہر یونیورسٹی اسکول کالج میں چلتی ہے، نیچرز منع کر دیں تب بھی لیکچر میڈیکل ایسا ادارہ ہے جہاں استاد خود چاہتے ہیں سینئر بچوں کے ساتھ خوب کھل مل جائیں تاکہ ان کا خوف ہر طرح کی جھجک چند دن میں نکل جائے۔ ہمیں ایک ہفتے کے اندر تیار بننے چاہیے ہوتے ہیں جو سب کے بچ میں اٹھ کر بلا جھجک ہر طرح کا سوال کر

سکیں..... یہ میڈیکل ہے، اس میں شرم و جھجک نہیں چلتی، gender (جنس) کو آپ ایک طرف رکھ دیں، آپ نے ساری باڈی پڑھنی ہے اور سب کے ساتھ پڑھنی ہے..... اس لیے سینئرز جو کچھ کہہ رہے ہیں مائنڈ مت کریں..... کلیئر۔“

دل سے تو شاید کسی کے بھی کچھ نہ نکلا ہو سوائے پھبتاؤں اور ایک دوسرے کو کہنی کے ٹھوکے مارنے کے مگر زبانیں خود ہی کہہ گئیں۔
”لیس کلیئر“

☆☆☆

شروع کے چند دن تو خیر بہت ہی جھجک رہی تھی لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ اس معمول کے عادی ہونے لگی۔ سینئرز کا رویہ بہت ہمدردانہ ہو چکا تھا اگر کوئی ہلکا پھلکا مذاق کر لیتے تو اس کے بعد ٹائیک کو سمجھانے میں پورے دل سے مدد کرتے تھے۔ کئی نے تو اپنی کتابیں تک جوئیرز کو دے دیں کتابوں کا بھی عجیب قسم تھا جب پہلی بار کھول کے دیکھیں آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ یہ تو پہلے ہی معلوم تھا میڈیکل کی بکس بہت بولی اور مشکل ہوتی ہیں لیکن اندر سے کیسی ہوتی ہیں یہ تو کھول کے پتا چلا تھا۔ پہلے ویک اینڈ کے بعد بے ردا آئی تھی بہت مزے لے کر کہہ رہی تھی۔

”یار! میرے بیگ کا پیرہ مجھ سے زیادہ میری اماں نے دیا تھا، کہیں میرے چھوٹے بہن بھائی کوئی بل نہ کھول لیں۔“
سب کے مشترکہ قہقہے میں بریرہ چپ رہے ہمارے۔

”اور میری دادی کی اچانک نظر پڑ گئی، یقین لے، استغفار پڑھتے ہوئے وضو کیا۔ دو نفل صلوٰۃ اللہ پڑھ ڈالی..... اور مجھے کہہ رہی تھیں، بریرہ صبح صام کلمہ ضرور پڑھ لیا کر، ڈاکٹر تو تو بن جائے گی اللہ جانے مسلمان رہے گی بھی یا نہیں، جیسی تیری کتابیں ہیں استغفر اللہ۔“

”اور میرے ابا کی سنو۔“ مریم چپکی۔ ”انہوں

نے جتنے فخر سے کتاب اٹھائی کہ میری بیٹی ڈاکٹر بن رہی ہے اتنی ہی کھساہٹ سے واپس رکھ دی، لاجول والا قوتہ اللہ پڑھتے کمرے سے نکل گئے ہا ہا ہا.....“
جخت کسی بات میں نہیں بولی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا.....؟“ بریرہ نے اسے کہنی سے ٹھوکا دیا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ ایک تو وہ پہلے ہی اپنے لباس، لب و لہجے سے مختلف لگتی تھی، اوپر سے اپنے خاندان کی سوچ کیا بتاتی، بریرہ سے تو صرف کلمہ پڑھنے کو کہا تھا اور اس کے باقاعدہ کلمے پڑھا دیے جائیں گے اگر درختی نے دیکھ لیں.....

اس کا ڈر سامنے آ گیا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر واقع گھر میں وہ تین ماہ بعد آئی تھی، حاجی تو اسے دیکھ دیکھ خوش ہو رہے تھے، سب نے خوب آؤ بھگت کی سوائے درختی کے، رات کو کسی وقت پڑھتے ہوئے رکھی گئی اناٹومی کی کتاب درختی کے ہاتھ لگی، وہ دیکھتے ہی بھڑک گیا۔ قریب ہی تھا وہ اس کی کتاب پھاڑ کر چولہے کی نذر کر دیتا کہ امروز خان اچانک سے آگئے۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم.....؟“
”بے شرمی کی باتیں جلاؤں گا نہیں تو اور کیا کروں گا..... یہ کچھ سیکھ رہی ہے یہ شہر میں۔“
امروز نے اس کے لال بھبھوکا چہرے کو نخوت سے دیکھا پھر اگلے دانت جما کر بولے تھے۔

”جو مسئلہ ہم اپنے باپ بھائی کو بھی بتاتے گھبراتے ہیں، وہ ڈاکٹر کو بتا دیتے ہیں..... کیوں؟ کیوں کہ ہمیں دوائی چاہیے ہوتی ہے، ڈاکٹر اگر یہ سب نہیں پڑھے گا تو علاج خاک کرے گا۔“
”پھر علاج کی باتیں پڑھے..... تصویروں سے کیا سیکھ رہی ہے۔“
”اوہ خوجہ!!“

امروز اسے گھورتے ہوئے آگے بڑھے تھے اور کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

پہلے شعلہ ابریل

”میں نے نقص نہیں نکالا، میں صرف اپنی کنفیوژن دور کرنا چاہ رہی تھی۔“

”اوہ!“ اس کے ہونٹ گولائی میں سکرے۔ ”مستقبل میں طبلے بجانے ہیں..... تم نے جان کے کیا ہے ایسا۔“

ڈی ایچ کی جانب بڑھتی بریرہ کے قدم ان کی آواز پر تھے، وہ واپس ان کی جانب پلٹی۔

”کیا بات ہے تجھ سے؟“

”کچھ نہیں.....“ تجھ وہاں سے ہٹا چاہ رہی تھی۔ اطہر بھی ہونہ میں گردن جھک کر بڑبڑایا۔

”آ جاتے ہیں پنڈ سے اٹھ کر میڈیکل کالج دیکھنے۔“

بریرہ فوراً ہی سمجھ گئی اور زور سے بولی ”زبان سنبھال کے بات کرو، مسٹر اطہر۔“

اطہر نے میکا کی انداز میں سر گھمایا تھا۔ ”تمہیں اپنا کیا کام خود نہیں آتا تھا۔ اس میں تجھ سے کیا تصور ہے..... اماں تمہاری ڈاکٹر، ابا تمہارے ڈاکٹر، بہن بھائی تمہارے میڈیکل کالجز میں بھرے پڑے ہیں۔ تنہا دوھیال سارا اسی سے منسلک..... ایک چھوٹی سی نروکانہیں پتا، سیم اون یو..... تم سے اچھی تو یہ پینڈو ہے جس نے سر تک کو حیران کر دیا۔“

”چلو چلتے ہیں۔“ تجھ نے بریرہ کو آگے کی جانب دھکیلنا چاہا مگر وہ ڈٹی رہی۔

”کیوں اس کے باپ کا کالج ہے۔“

”تم بچ میں مت آؤ۔“ اطہر نے اسے ٹوکا۔

”کیوں نہ آؤں..... میں جی۔ آر ہوں (girl representative) تم کلاس کی لڑکی کو ہراساں کرو، میں چپ رہوں۔“

ان کی بڑھتی آوازیں بیچ پر بیٹھے سیکنڈ ایئر کے ہادی تک گئیں، ہادی اطہر کا بڑا بھائی تھا وہ اٹھ کر فوراً ادھر آیا تھا۔

”فرسٹ ایئر! اپنی پرابلم.....؟“

”نو نو.....“ اطہر نے ایک تلخ نگاہ دونوں

لڑکیوں پر ڈالی، اور جانے لگا تھا مگر وہاں بریرہ موجود تھی جو بد تمیزی پر اتنی آسانی سے اسے بخشنے والی نہیں تھی۔

”کیا نو نو..... بتاؤ نا اپنے بھائی کو، اپنی پریزنٹیشن پر ایک پینڈو کے سوال کا جواب نہیں دے سکے، اب اس لیے اسے تڑپا لگا رہے ہو۔“

ہادی نے ان تینوں کو باری باری دیکھا تھا۔ اطہر کی کچکچاتی نگاہیں تجھ پر جمی تھیں جس کے گال گھبراہٹ سے مزید سرخ ہو رہے تھے جیسے ابھی لہو ٹپک پڑے گا۔

”بہت بری بات اطہر..... تم میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہو، یہ ایک ٹیم ایجوکیشن ہے، بڑ بھگڑ کر تو کچھ بھی سمجھ نہیں آئے گا..... چلو سوری کرو تجھ سے.....“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“

تجھ کے ماتھے پر وحشت کے بل تھے۔ اس نے بریرہ کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھتے سراپمگی سے کہا تھا۔ ”چلو بھی اب۔“

”رکو..... ابھی وہ سوری کرتا ہے۔“ بریرہ بڑبڑائی..... پھر اپنے ہاتھ اور آل میں ڈالتے ہوئے تجاہل عارفانہ سے کندھے اچکائے ”چلو اب جلدی کرو سوری، ہمیں کینٹین بھی جانا ہے۔ بی پی ہائی کر دیا میرا..... اب جوس شوس نکلیں جا کر۔“

”سوری اور میں، اس جنگلی سے..... مائی فٹ۔“

اس کے روپے پر ہادی نے سرزنش کی تھی۔

”اطہر۔“

”اطہر کی جانے بلاء وہ ناک بھنویں چڑھاتا اگلے دانت جما کر بریرہ کو کہہ گیا تھا۔

”دیکھ لوں گا تمہیں میں، اور تمہیں بھی۔“

دوسرا جملہ تجھ سے کہا۔ وہ اندر تک لرز گئی تھی۔

”دیکھا آپ نے اپنے بھائی کے روپے کو۔“

بریرہ کے شکایتی انداز پر وہ قدرے غصے سے

بولی۔ ”بس کر جاؤ بریرہ۔“ اسے اپنی آواز کا پتہ نہ تھا محسوس ہوئی وہ وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ بریرہ نے اسے روکا۔

”کہاں جا رہی ہو..... کینٹین چلتے ہیں۔“

”نہیں میں ہاسٹل جا رہی ہوں۔“

”زکیں پلیز..... آٹم سوری، میں سمجھاؤں گا اسے..... اور چلیں میں آپ کو کینٹین لے چلتا ہوں۔“

”نہیں شکریہ.....“ وہ اب پہلے سے بھی تیز قدموں سے ہاسٹل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ بریرہ اسے آوازیں لگاتی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

☆☆☆

امروز خان کو اس پر آج معمول سے زیادہ غصہ تھا۔ اس کے انتظار میں بہت دیر درتے ہی میں ٹھلکتے رہے۔ دو تین بار اس کے کمرے میں جھانک آئے۔ رات کے دس بجتے کو تھے مگر وہ ابھی تک گھر سے باہر تھا۔ اس کا بڑھتا لاہالی پن امروز خان کو تپا کر رکھ دیتا، آج صبح ہی وہ اسے سختی سے کہہ کر گیا تھا۔

”پہلے ٹائم ہی، زمین پر آ جائے.....“ مکی کے بیچ ڈالے جا رہے تھے۔ امروز خان کو کھاد کے سلسلے میں ایک شہر جانا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں، مزارعوں پر کوئی تو نظر رکھے، مگر درختی کی بلا سے۔ امروز کے گھر سے نکلتے ہی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر نکل گیا۔ رات ہونے کو آگئی تھی پر وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ امروز خان کتنی دیر بھل بھل کر اس کا انتظار کرتے رہے، رات کو تو اس سے ملاقات نہ ہو سکی مگر صبح ہوتے ہی اسے آڑے ہاتھوں لیتا تو وہ بھی اکڑ کر بولا۔

”ہم مرد کا بچہ ہے، شکار نہیں کرے گا تو دشمنوں کا مقابلہ کیسے کرے گا۔“

”کون سے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے تم نے.....“ امروز خان نے لٹاڑا تھا۔ ”خوچہ، اصل دشمن یہ پیٹ ہے، اس کا مقابلہ کرو۔“

امروز اسے کھانے کو دوڑا تھا، سیف خان گھر پر

نہیں تھے مگر خانی اور صفورا درمیان میں آ گئیں۔

”اسی لیے ہم کہتا تھا۔ اس کی شادی کر دو، ذمہ داری میں خود عمل آ جاتا ہے لیکن نہیں، تم نے تجھ سے شہر بھیجا ہے..... اب بھگتو۔“

امروز نے اگلے دانت جما کر نخوت سے اسے گھورا۔ ”تجھ سے شادی کرنی ہے، تو پہلے انسان کا بچہ بنے، ورنہ اس کا خیال دل سے نکال دے۔“

خانی اور صفورا دونوں نے حیرت سے امروز کو دیکھا تھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہا ہے۔ امروز خان..... ان کا بچپن کا رشتہ ہے، اور بچپن کا رشتہ مرتے دم تک چلتا ہے۔“

”اور کیا۔“ خانی بیگم نے صفورا کی تائید کی۔

”ہم کو نہیں اسے پڑھانا ڈھانا..... بلاؤ اسے اور شادی کرو ان کا۔“

ڈری ڈری زر بخت بھی دروازے میں کھڑی ساس اور ماں کی حمایتی لگ رہی تھی۔ امروز نے بے پارگی بھری نگاہ ان عورتوں پر ڈالی اور ایک بار پھر اسے انگلی اٹھا کے سے تنبیہ کی تھی۔

”آئندہ میں آوارہ پھرنا نہ دیکھوں..... ورنہ.....“ اس نے غصے سے گردن جھٹکی۔ ”شکر کرو تمہارے نام ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے، ورنہ تم جاہل کو.....“

آخری لفظ اسے گالی سے بھی زیادہ کاٹ دار لگا۔ اس کا دل کیا ایک قبر کھودے اور تجھ کو اس کی تمام کتابوں، ڈگریوں سمیت دفن دے۔

☆☆☆

کئی دن خاموشی سے سرک گئے تھے۔ ہادی نے اطہر کو سمجھایا تھا یا نہیں لیکن اس کا رویہ اب بالکل سرد سا تھا۔ اس کے رویے پر شروع کے کئی دن وہ اچھی خاصی ڈسٹرب رہی تھی، وہ لڑکا ہے، کچھ بھی غلط کر سکتا تھا، اسے رہ رہ کر بریرہ پر غصہ آ رہا تھا۔

”اگر تم چپ کر جاؤ تو اچھی بھلی بات ختم ہو

جاتی، مگر تم نے اس کے بھائی کو ضرور بتانا تھا.....
”کیوں چپ کر جاتے، گوشتے ہیں ہم.....؟“
بریرہ اس سے متفق نہیں تھی۔

”وہ لڑکا ہے بریرہ..... تم کیوں نہیں سمجھتیں۔“
”تو ہم لڑکیاں ہیں، وہ سمجھ جائے.....“ بریرہ
اسے جتا کر بولی لیکن جھستہ کی پریشانی دور نہیں ہوئی تھی
تب ہی اس نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔ ”لڑکوں کو
ان کی حد میں رکھو تو یہ ٹھیک رہتے ہیں، ورنہ انہیں دیر
نہیں لگتی اپنی اوقات بھولنے میں..... اور تمہیں
پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کچھ غلط
کرے گا تو اس کی ہڈیاں توڑ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا
دوں گی۔“

جس انداز میں اس نے کہا تھا کتاب پر جھکی
مریم ہنستی ہوئی دہری ہو گئی۔
”ویسے تمہارے ارادوں سے لگتا ہے یار، تم
آرتھو پیڈک ہی بنو گی۔“

ان دونوں کے قہقہوں میں جھستہ کا موڈ کچھ دیر کو
سہمی مگر بحال ہو گیا تھا اور پھر سب معمول کی طرح
چلتا رہا۔ چھوٹی موٹی بد مزعیاں اسٹوڈنٹس میں ہوتی
رہتی تھیں۔ پڑھائی میں کم ہو کر سب بھول جاتے
تھے۔ اطہر بھی یقیناً بھول چکا تھا، اس کا سر درویش
آہستہ آہستہ پھلا اور معمول پر آنے لگا، جھستہ بھی
بھول گئی۔

☆☆☆

مگر اطہر بھولا نہیں تھا بس اسے موقع نہیں مل رہا تھا کس
طرح بدلہ لے، پیپرز میں گنتی کے دن تھے اور ہاسٹلز
میں موت کا سانسنا، حالانکہ تعداد معمول سے زیادہ
تھی عموماً میڈیکل کالج میں اسی شہر کے بچے آتھ دس
نہ ہونے کے برابر ہی ہوتے ہیں اور پیپرز میں وہ بھی
ہاسٹل آ جاتے ہیں کیونکہ تنہا تو ایک ٹاپک بھی یاد نہیں
کیا جاسکتا۔ گروپس میں بیٹھ کر تیاری ہوتی ہے اور دو
دو دن مسلسل جاگ کر بھی بغیر چیٹنگ کے پورا پیپر کرنا سب سے

بے حد مشکل ہے۔ تمام طالب علم اپنی پوری تیاری
کے ساتھ آڈیٹوریم پہنچ چکے تھے اور ایک دوسرے کو
سمجھا رہے تھے۔ انہیں مزید سمجھانے کے لیے
سیکنڈ ایئر نے بھی چکر لگائے۔

”چیٹنگ کا کیا سوچا ہے.....؟“
فارہ کی بات سن کر سب ایک دوسرے کا منہ
تکتنے لگے۔ تو ہادی بول پڑا اتنا نیک یہاں کوئی نہیں
کہ چیٹنگ نہ ہو۔

ساری سیکنڈ ایئر نے نفی میں سر دھنتے اس کی
تائید کی ”ناممکن۔“

ہادی بتانے لگا۔ ”آپ سب ایک کلاس ہو
پوری کوشش کرنی ہے سارے ساتھی پاس ہو
جائیں، لیکن منہ سے بول کر نہیں خاموشی سے، کوڈز
میں، اور اگر بوٹیاں شوٹیاں ہیں تو یہاں ہی نکال دو،
پکڑے گئے تو میڈیکل سے باہر ہو جاؤ گے، وہ بھی
بے عزتی کے ساتھ..... بس مدد، مگر خاموش!“

کچھ مشورے سے خاموش کوڈز طے پا گئے تھے
اطہر نے سوالوں کا کوڈ جوتا بجانا بتایا تھا، یعنی جس نمبر
کا سوال نہیں آ رہا وہ اتنی بار اپنا پاؤں زمین سے
ٹکرائے گا۔ میڈیکل کا پیپر تقریباً معروضی ہوتا ہے،
چار آپشن سے ایک درست جواب کا کوڈ بریرہ نے بتایا
جسے جواب آتا ہو وہ درست آپشن پر کھائے گا، یعنی
آپشن اے تو ایک بار کھانسا ہے، بی تو دو بار، اسی
طرح ڈی تک۔

ہال میں پہنچتے ہی پیپر شروع ہوا۔ کچھ دیر
خاموشی سے پیپر ہوتا رہا پھر تو ہال کے ایک کونے سے
کبھی کھانسی ابھرتی، کبھی جوتے ٹکراتے، یو ایچ ایس
سے آئے ایگزامز کچھ دیر برداشت کرتے رہے پھر
اپنا ماضی بھلا کر گرجے۔

”آج سارے استھما اور مرگی کے مریض بھی
دے رہے ہیں، جو سانس نہیں آ رہا، ایڑیاں رگڑی
جاری ہیں..... خاموش ہو کر کام کرو ورنہ چین لوں
دو دن مسلسل جاگ کر بھی بغیر چیٹنگ کے پورا پیپر کرنا سب سے

پھر تو جس بیچارے کو سچ مچ کھانسی آرہی تھی اس
نے سانس بھی روک لیا۔ اطہر جھستہ سے ایک قطار کے
فاصلے پر تھا، اسے اندازہ ہوا کہ وہ خاموشی سے پیپر کر
رہی ہے یقیناً درست بھی، وہ چوتھے سوال پر بری
طرح اٹکا ہوا تھا۔ اس نے رک رک کر چار بار جوتا بجا
کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی، وہ ہوئی بھی لیکن
ایگزامز کے خوف سے کھانسا اسے محال لگ رہا تھا۔
اس نے دو بار اُسے مھنوں سے بھی اشارہ کیا کہ شاید
بتادے، آپشن بھی ڈی تھا چار بار کھانسا نفقہ! اس
نے کھانسنے کے بجائے ہتھیلی پر لکھ کر اس کے سامنے
کردی۔

”آپشن ڈی۔“
عین اسی وقت ایگزامز نے اسے ہتھیلی دکھاتے
دیکھ لیا۔ فوراً اس کے پاس آ گئے۔
”اسٹینڈ اپ۔“

دنیا کی تمام گھبراہٹ اس وقت جھستہ کے
چہرے پر تھی، منہ وحشت سے وا ہو گیا۔ ”کیا لکھا ہے
ہاتھ پر.....؟“

”کک کک نہیں سر۔“ اس نے مٹھی زور سے بند
کر لی، اطہر کی بھی سانس رک گئی تھی۔
”پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے، دکھائیں ادھر“ مٹھی
دیکھتے ہی وہ بھنا گئے۔

”کیا ہے یہ..... کیا بتا رہی تھیں اسے.....؟“
وہ نفی میں سر ہلاتی رہی۔ سر نے اطہر سے
استفسار کیا، لمحہ بھر تو وہ شپٹایا پھر سبھل کر بولا۔
”سر بتائیں رہیں، انچوٹی ایک سوال کی آپشن
پر یہ کنفیوژ تھیں۔ وہ پوچھ رہی ہیں ہے، مگر میں نے بتایا
نہیں۔“

اس کی بات سن کر جھستہ کی پھٹی آنکھوں میں
آنسو آ گئے۔ ”نو نو سر یہ جھوٹ بول رہے ہیں.....
انہوں نے۔“

”میں نے..... میں کیوں پوچھنے لگا تم سے
مجھے تو سب آتا ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر

زور زور سے بولنے لگا۔

”خاموش۔“ سر نے زور سے ڈپٹے ہوئے
دونوں کے پیپر اٹھا لیے تھے۔ ”ملک کی آبادی آپ
سے مروا کر کنٹرول نہیں کروائی، انڈر سٹینڈ..... اینڈ
آؤٹ۔“

دونوں کی منتوں کے باوجود ان کے پیپر پر
”چیٹنگ“ لکھ کر باہر نکال دیا گیا۔
☆☆☆

ایک ہفتے سے اس نے رورود کر اپنا برا حال کر لیا
تھا۔ سب نے اس کو ملامت کی، آخر لکھ کر پوچھنے کی
ضرورت کیا تھی، جوتا بجا لیتی، کم از کم اس حرکت کا
کوئی ثبوت تو نہیں ہوتا ناں، اپنی صفائی میں وہ کچھ
نہیں بولی تھی، بس چیٹنگ جیسی بدنامی کا بے حد دکھ
تھا۔ اس سے زیادہ دکھ اور حیرت اس کے ٹیچرز کو ہوئی
تھی جب ایک ماہ بعد رزلٹ آیا۔

بائیو کیمسٹری میں سوائے چند نالائق اسٹوڈنٹ
کے تمام کلاسیک پاس تھے۔ اطہر کی سلی آ جانا کوئی معافی
نہیں رکھتی تھی باقی دو سبجیکٹ میں بھی گزارے لائق
نمبر تھے، لیکن اُس میں جھستہ ٹیل.....!

وہ جھستہ جیو انومائی جیسے مشکل سبجیکٹ
اور فزیالوجی میں ڈسٹنکشن پر ہے، میڈیکل میں اسی
نصف نمبر پر ڈسٹنکشن لگ جانے کا مطلب بچہ اس
سبجیکٹ میں گولڈ میڈل کے لیے نامزد ہو چکا ہے،
بائیو کیمسٹری کے سر نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”جھستہ..... فیزیو، انومائی میں ڈسٹنکشن.....
باؤ کیم میں کیا ہو گیا تھا آپ کو.....؟ اس کے جواب
دینے کے بجائے پیچھے سے کسی کی گنگناہٹ سے
ہانک آئی تھی۔

”چی..... ٹنگ.....“
”اوہ نو.....! سر کے ہونٹ گولائی میں سکڑے،
جھستہ کے سارے بدن میں ایک لہری سنسنائی تھی۔
جبرے جم گئے۔
”بہت بری بات..... آپ لوگوں کو بریف

کرنے کے لیے ہم پانچ پانچ بجے تک کالج میں رہے ہیں، اچھا اوڈی تو آٹھ بجے آف کر رہے تھے، اگر کوئی کنفیوژن تھی تو — آپ ڈسکس کیوں نہیں کرتے..... چیئنگ کو کیوں پر تفر کرتے ہو..... بہر حال فورٹی ڈیز ہیں آپ کے پاس..... جس جس کی سلی ہے کلیم کر لے، نہیں تو ایم بی بی ایس آپ سے معافی چاہتا ہے۔“

سلی آجانے کے باوجود اطہر آج اتنا خوش ہوا تھا..... اسے لگا دونوں بار کا بدلہ ایک بار میں سود سمیت اتر۔

☆☆☆

رات کی سیاہی دن کی چاندی میں بدل کر سنہرا پن بکھیرتی رہی، سلی دونوں کی کلیمر ہو گئی تھی لیکن اس واقعے سے نجات نے ایک سبق سیکھ لیا تھا، دنیا میں سب لوگ اس جیسے نہیں ہیں، دوسرے کو پچھاڑنے کی ریس لگی ہے وہ یا تو اس دوڑ سے نکل کر ایک جانب کھڑی ہو جائے یا پھر بھاگے اور تیز بھاگے، اسے بھاگنا تھا مگر کسی کو گرائے بنا، پہلا سال مشکل تھا پھر دل پر لینا چھوڑا تو سب آسان لگنے لگا تھا۔ پہلے دو سالوں کی کلاسیں کالج میں ہوتی رہیں۔ اطہر نے زچ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ تیسرا کلینکل سال شروع ہوتے ہی پہلے پریڈ کے بعد اسٹیکسکوپ اور اوور آل تھاے فائل اٹھا ہاسپٹل چلے جاتے وہاں جا کر نیچر کے سینیئر کے ساتھ یونٹ بن گئے تھے۔ اطہر اور اس کا یونٹ الگ الگ تھا۔ کم کم سامنا ہوتا۔ پھر اکثر ٹاسنگ کا بھی فرق ہو جاتا، نجات کا یونٹ ہادی کے ساتھ تھا۔ اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ شکل و صورت میں تو بھائی جیسا لبا چوڑا خوبصورت سا تھا۔ کچھ تیسرے چوتھے سال میں جاتے ہی ڈاکٹر کی اتنی گرومنگ ہو جاتی ہے۔ عام سی شکل صورت والے بھی دلکش لگتے لگتے ہیں، لیکن وہ اطہر کے برخلاف اخلاق کا بھی دلکش تھا۔

نجات اس کے اخلاق سے متاثر بھی جب کہ وہ

پوری نجات سے متاثر ہو چکا تھا۔ باقی لڑکیوں سے مختلف اپنی ذات میں قید مگر ذہین نجات، اسے شروع میں ہی بہت اچھی لگی تھی۔ فری وقت میں ایک دوسرے سے ٹاپک ڈسکس کرتے ہوئے وہ اس کی ٹیلی کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا۔ یقیناً جاننے میں اسے دلچسپی بھی محسوس ہوتی تھی، اسے اس کے شوق اور ہمت پر حیرت تھی کہ کس علاقے کی ہو کر کتنی دلچسپی سے پڑھ رہی ہے، پھر سب کے بچ چلتے ہوئے مکمل اعتماد بھی۔

☆☆☆

درخزی کا مزاج بدلنا ناممکنات میں سے تھا، لیکن امروز اس پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ امروز کی سختی، ڈانٹ ڈپٹ پر سیف خان نے انہیں ہی سمجھایا تھا۔

”تم فکر مت کرو، شادی کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”داجی! آپ کو لگتا ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیوں تمہیں نہیں لگتا، ذمہ داری بڑے بڑے کو ٹھیک کر دیتی ہے۔“

”پتا نہیں داجی، مجھے نہیں لگتا..... نجات اور درخزی میں بہت فرق ہے، مجھے تو اس فیصلے پر افسوس ہوتا ہے۔“

”کس بات کا فرق امروز خان!“ سیف خان غصے سے اپنا صافہ جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اگر نجات چار لفظ پڑھ گئی ہے تو گھر کے بچے میں تمہیں نقص دکھائی دینے لگے..... ہم پہاڑی لوگوں کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، جیسے ہوئے..... چار کتابیں ہماری روایات نہیں بدل سکتیں۔“ سیف خان نخوت سے گردن جھٹک کر جاتے جاتے کہہ گئے۔ ”اس کو ڈاکٹر کی پوری ہونے والی ہے، شادی کے لیے کم میں جو مرثیہ کروانی ہیں شروع کروالو تم۔“

☆☆☆

چار سال تیزی سے گزر گئے، یہ ان دنوں آ بات تھی جب نجات پانچویں سال میں تھی اور ہادی

چھٹا ہاؤس جاب کا سال شروع ہو چکا تھا، ان کے یونٹس تبدیل ہوئے تھے، لسٹ میں نجات اور اطہر کا نام ایک یونٹ میں تھا، اور اس کا پورا دل تھا اپنا یونٹ کسی طرح تبدیل کروالے، بے شک اب ان کے درمیان کبھی کوئی ناخوش گوار بات نہیں ہوئی تھی، لیکن نجات کی غیر معمولی قابلیت نے اسے تمام ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس میں خوب نمایاں کر دیا تھا جو اطہر کے لیے اندرونی حسد کا سبب بن رہی تھی، وہ اس کا اظہار لفظوں کے بجائے انداز سے کرتا، اس کی ہنک آمیز نگاہیں، اور خاندانی پروفیشن کا رعب نجات کے سامنے زیادہ سرائے گا تھا۔

یونٹ تبدیل کروانے کے لیے اگر وہ اچھا اوڈی سے بات کرنی مسئلہ تب بھی حل ہو جاتا لیکن انہیں سمجھانے کے لیے کئی طرح کی وضاحتیں دینی پڑیں، ہاؤس جاب کے اسٹوڈنٹس کی ایسے معاملات میں بہت چلتی ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ ایمر جنسی میں بائیس بائیس گھنٹے کی ڈیوٹی ہے جو وہ اپنے سینیئر ڈاکٹرز کی جگہ دیتے ہیں اور ہادی سے کہتے ہوئے اسے زیادہ اچھا سمجھتا تھا۔ وہ ہادی ہی تھا جو بنا کہے کئی بار اس کے کام آچکا تھا، ایک بار تو فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا، خاصی پرانی بات تھی تب نجات کا سیکنڈ ایر ختم ہو رہا تھا۔ اسے ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کو پڑھنا تھا، اسی سلسلے میں وہ لیپ اسٹینڈنٹ کے پاس گئی۔ اسے ہادی کی ہڈی چاہیے تھی، لیپ میں اس وقت اس کے تین ماڈل اور ایک اصل رکھی تھی۔ اس کے اصلی مانگنے پر اسٹینڈنٹ نے کہا بھی تھا۔

”آپ بون کا ماڈل لے جائیں..... اور بجنل بون کہیں آگے پیچھے نہ ہو جائے۔“

”اتنی لا پرواہ نہیں ہوں میں سر..... دو تین دن میں واپس کر دوں گی، مجھے ضروری ڈائیگرام بنانی ہے۔“

تھوڑی پس و پیش کے بعد اسٹینڈنٹ نے اس کا

نام رجسٹر پر لکھ کر ایڈیٹ کر دی، اور اسی دن اچانک ہی دو تین دن کی چھٹی اتار دی ہوئی۔ دو ویک اینڈ کی مل گئیں، سب لوگوں نے گھر جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ نجات بھی گھر آگئی تھی، اس کے گھر آنے پر عید کا سا سماں ہوتا تھا۔ وہی گھر والے جو اس کے شہر جا کر پڑھنے پر پریشان تھے، اب سارے ملنے ملانے والوں کو گھر سے بتاتے تھے۔

”مڑے (ارے) نجات ڈاکٹر بن رہی ہے۔“

اس شام بھی وہ اپنی چیزیں لیے درتچے کے ایک کونے میں بیٹھ گئی، اس کے سامنے اچھا بک اور ایک کتاب کھلی تھی۔ ہاتھ میں بون پکڑے اس پر وین (رگوں) کی ڈائی گرام سمجھ رہی تھی

”نجات دریا خان کی بہو آئی ہے تم سے ملنے، مورے (ماں) کے کمرے میں بیٹھی ہے مل لو..... بلا رہی ہے۔“ نجات تخت آکر بولی۔

اسے پتا تھا وہ بیاریوں کی لمبی چوڑی فہرست لائی ہوگی، اگر نہ گئی تو ناراض..... بون کتاب پر رکھ کر وہ خالی بیگم کے کمرے میں گئی تھی، اس کے انداز سے کے مطابق دریا خان کی بہو اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی۔ اس کی بات تو اس نے جانے سی بھی پانچیں اس کی نگاہ کھڑکی سے دکھائی دیتے درخزی پر گئی جو بون اٹھا کر معائنہ کر رہا تھا، وہ فوراً باہر کی جانب پکی۔

”یہ ادھر دے دو۔“

درخزی نے تیوری چڑھائی ”یہ گھر ہے قبرستان نہیں، جہاں مردے لانے لگی ہو۔“

وہ کہہ کر باہر کی جانب بڑھا وہ پیچھے پیچھے مانگتی ہوئی میکا کی انداز میں اس پر چھٹی مگر اس نے دروازہ کھولتے ہی بہت دور تالے میں اچھا دی۔ نجات کی سانسیں رکیں۔

”یہ..... یہ کیا کیا تم نے درخزی..... کتنی مہنگی تھی وہ، جانتے بھی ہو کالج والے کیا کریں گے اب میرے ساتھ۔“

اس کی بے بسی بردہ زنی نے ٹھٹھا مارنا چاہا تھا مگر پانی سے بھری سبز آنکھیں تھمتھمتے میں کھلے منہ کو اگڑا گئیں، سبز پہاڑوں کو پہلی بار سیلاب میں بہتے دیکھا تھا، اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا تھا، کہا تو اس نے کچھ نہیں، اپنا سر جھٹک کر وہاں سے ہٹ گیا، ہاں ایک ملامت سی محسوس ہوئی تھی، جسے وہ ظاہر ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کا حال کیا بتاتا، اسے کس بات کا ڈر ہے۔ اگر وہ سچ سچ ڈاکٹر بن ہی گئی تو کیا پلٹ کر آئے گی؟ کبھی نہیں..... اور جنت کو وہ کھو دے ہنا ممکن۔

☆☆☆

خانی بیگم کو بھی اس کے پلٹنے کی فکر تھی۔ دائمی بھی بنیادوں کا درس دیتے۔ زربخت ایک ہی بات کر لی۔ ”امروز خان نے تمہاری ضمانت دی ہے، پناہ لکھ کر اس کے سر پر خاک نہ ڈالو“۔

امروز لالہ کی خاموش لگا ہیں اسے الٹا یہ لگتی تھیں اور جس کی خاطر اسے سب واپس لانا چاہتے تھے اس کی ہٹ دھرمی..... اسے اپنی قسمت پر رونا آتا تھا، اور اس دن وہ روئی بھی بہت، جب انینڈنٹ نے بون واپس مانگی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اطہر کو جیسے ہی اندازہ ہوا جنت بون لے گئی تھی اور واپس نہیں دے رہی، اس نے انینڈنٹ سے ہار ہار مانگی شروع کر دی۔

”مجھے پڑھنی ہے..... لیں اس سے، مجھے ضرورت ہے۔“ ہادی کو جی آر پر ہر لے تالا کہ کوئی حل ڈھونڈے تب اس نے انینڈنٹ سے بات بنائی۔

”سوری سر وہ تو مس جنت سے میں نے لے لی تھی۔“

جنت نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ہرے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بول کر انینڈنٹ کو مطمئن کر چکا تھا۔ پڑھ کر دو چار دن میں لوہہ دوں گا۔ کھلے ابد میں اس نے جنت کو لا پر والی پر، اطہر کو احوال پر لایا تھا

شرم کرو، تمہاری کلاس فیلو ہے۔ حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اور انینڈنٹ کو جانے کیسے فائن دے کر چپ کر دیا، مگر جنت کو پوری کلاس اور ٹیچرز کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ اور ایسے کتنے کام اس نے کیے تھے، پھر سچ تبدیل کروانا تو ایسا کوئی بڑا کام بھی نہیں تھا۔ صرف ہادی نے اتنا ضرور پوچھا تھا۔

”کیوں.....؟“

وہ چپ رہی۔ ہادی نے ساری پونٹ لسٹ جنک کی تقریباً اس میں ساری اس کی فرینڈز ہی تھیں۔ اطہر کے نام پر اس کی ابھی پیشانی یک دم سیدھی ہوئی، سکرے ہوٹ کھلے، اس نے اپنی عینک اتار کر ششے صاف کرتے ہوئے عام سے لہجے میں پوچھا تھا۔

”اطہر Irritate (جنگ کرنا) کرتا ہے آپ کو۔“

وہ چپ چاپ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ عینک پھر سے جماتے دھیمے لہجے میں بولا۔

”اچھے ملی گھر میں سب سے چھوٹا ہے، کچھ لاڈلا بھی بہر حال میں سمجھاؤں گا اسے..... اور پونٹ کا کوئی ایڈیٹور نہیں۔ ڈونٹ وری چیج ہو جائے گا۔“

وہ کہہ کر جا چکا تھا پشت سے اس کی ہموار چال کو دیکھتے جنت نے لو بھر سوچا تھا۔

”کتنے اچھے ہو تم ہادی لیکن.....“ اس نے خود کو فوراً سرزنش کی۔ ”تم اس کی اچھائی کیوں سوچ رہی ہو جنت.....؟“

☆☆☆

پونٹ تبدیل ہونے میں زیادہ دن نہیں گئے تھے۔ بہت آرام سے ہوا اور کام معمول پر ہوتا رہا تھا۔ وہ بھی ایک عام سادہ تھا، کلینکل شروع ہوتے ہی آپسی ایڈ ہاڈی کے بجائے مریضوں پر ہونے لگی تھی، آپسی کے سلسلے میں معلومات اکٹھی کرنے وہ اسٹاپ روم میں کچھ مریضوں کی فائل لیے بیٹھی تھی،

اکثر ہادی نائٹ ڈیوٹی کے بعد ہاسٹل کے لیے نکل رہا تھا۔ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر، کیٹین گیا جائے کے کپ لیے اور اس کے پاس آ بیٹھا۔ اپنی جانب بڑھتا کپ دیکھ کر وہ اپنی چادر درست کر کے مسکرائی۔

”تو کھینکس..... میں بریک فاسٹ لے چکی ہوں۔“

”لیکن یہ تو ڈاکٹر کا ایندھن ہے، پکڑیں۔“

شکر یہ میں سرخم کرتے اس نے کپ پکڑا۔

”کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟“

”آج آپسی ہے، کل فارما کا وائیو، میں نے سوچا پیسٹنٹ فائلز چیک کر لوں۔“

ہادی کو جتنی معلومات تھیں وہ اسے بتاتا رہا، پھر کچھ دیر بعد عام سے انداز میں پوچھا تھا۔

”آپ کا فائل ایئر کمپلیٹ ہو رہا ہے..... اس کے بعد کیا ارادہ ہے.....؟“

لحمہ بھر کو جنت کے چہرے پر سکون کی چمک آئی۔

”ہاؤس جاب.....!“

”وہ تو یقیناً..... میرا مطلب ہے آپ کی پرسنٹ ایج پر پلپ آفر ہے..... تو؟“

(پلپ، امریکن میڈیکل اسپیشلائزیشن اسکالر شپ) اس کی آنکھیں پھٹکی سی ہوئیں اور نفی میں سر ہلایا تھا۔

”وائے..... یہ تو آپ کا کریڈٹ ہے، اس سال صرف چار اسٹوڈنٹ اناؤنس ہوئے ہیں جن میں آپ شامل ہیں، اتنی بڑی اپرچونٹی آپ چھوڑ دیں گی۔“

سردناثر کے ساتھ وہ چپ تھی۔ اب کیسے بتاتی اس کے خاندان نے یہاں تک جانے کیسے پہنچا دیا۔

مریکہ اس کا خرچا کیا، اس کے سارے خاندان کا خرچا بھی اٹھانے کا کہے، تب بھی کوئی جانے نہ دے، ”انسان اپنے خواب خاندان سے بہت اونچے رکھے بھی کیوں۔“ ہادی نے بھی زیادہ نہیں کریدا۔ ”تجوں کی خاموشی کے بعد آہستگی سے پوچھا تھا۔

”ایک بات کرنا چاہتا ہوں آپ سے.....؟“

اس نے گردن اس کی جانب گھما کے سوالیہ نگاہ اٹھائی تھی۔ ہادی ہل بھر سبز آنکھوں کا سحر برداشت کر سکا، پھر سامنے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ کسی سے کمپلیڈ ہیں.....؟“

سبز آنکھیں تحیر سے پوری کھل گئیں۔ وہ فوراً سنبھلا۔ ”میرا مطلب ہے کہ۔“ اس نے اپنا چوڑی کمانی کا چشمہ اتار کر صاف کیا۔ ”میری ہاؤس جاب کمپلیٹ ہو رہی ہے، اور ہر ماں باپ کی طرح میرے والدین بھی چاہتے ہیں میری شادی کر دی جائے۔

ہماری ایجوکیشن تو تاحیات چلنے والی ہے، اسپیشلائزیشن پریکٹس کے ساتھ ہونی رہے گی..... اور میری خواہش یہ ہے کہ میری زندگی کا سفر آپ کے ساتھ گزرے۔“

اتنی جدید تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بھی جنت کے اندر کی پہاڑی لڑکی مری نہیں تھی۔ آہن واحد میں اس کے سپید گالوں پر سرخی لہرائی، گھٹی پلکیں لرز کر اٹھیں۔ وہ خالی کپ سیٹ پر رکھتے ہوئے کہہ گئی۔

”آئی ایم آل ریڈی انگیڈ۔“

ہادی کے لیے یہ بہت بڑا جھٹکا تھا، تقریباً اس کی ساری فیملی کو جان گیا تھا۔ لینے چھوڑنے کے دوران ان پانچ سالوں میں امروز لالہ سے بات چیت بھی ہوئی تھی، باقی سب کا ذکر بھی کئی بار کیا مگر منگیتر کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ اس نے بھنویں اچکا کر اسے جاتے ہوئے مایوسی سے دیکھا تھا۔

کورڈور کی جانب بڑھتے قدم جنت کو خود بھی تھکے تھکے لگے، جیسے اپنے کہے پر اسے خود بھی یقین نہ ہو۔ عین اسی لمحے اطہر ادھر سے گزرا تھا یقیناً پوری بات اس نے نہیں سنی ہوگی، صرف آخری جملے سے ہی اندازہ لگا لیا۔ کچھ آج کل اس کے دوست بھی کہہ رہے تھے۔

”تمہارا بھائی اور ڈاکٹر جنت آج کل بہت ساتھ ساتھ دکھائی دے رہے ہیں۔“

وہ ہادی کے قریب آنے کے بجائے تیز قدموں سے جھپٹنے کی جانب بڑھا۔ وہ کوریڈور کے آخری سرے پر تھی۔

”ایکسیکوزمی.....“ اس نے گردن موڑتے ہوئے استفہامیہ نظریں اٹھائیں۔

”کچھ عرصہ پہلے آپ کا پونٹ اچانک سے تبدیل ہوا تھا، جاننا یہ ہے وہ ہادی نے تبدیل کروایا تھا، یا ہادی کے لیے تبدیل کروایا گیا تھا۔“

”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔“ وہ سختی سے بولی تھی۔

”سمپل۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”اس پونٹ میں آخر مسئلہ کیا تھا؟“

”آپ.....“ اس کے ٹھوس انداز پر اطہر کی آنکھیں پھیل کر سکڑیں ”آپ مسئلہ تھے، میں آپ کے ساتھ پراپر کام نہ کر پاتی۔“

اطہر کے تو سارے بدن میں گرم لہر دوڑ گئی، چہا چہا کر بولا تھا۔ ”آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھ کو، ٹھہر ڈکلاس، آوارہ، نکلا..... میں اچھے اچھوں کو منہ نہیں لگاتا..... اور آپ کی اوقات ہی کیا ہے۔“ اس نے

گردن میں جھولتا اسٹیمو اسکوپ منہ پر لٹکا کر اتارا اور اوور آل کی پاکٹ میں اڑسا۔ ”اپنا میکی بیک گراؤنڈ بدلنے کے لیے میرے بھائی کو سیر می مت بتائیں، وہ بہت رحم دل ہے، بھولی صورتوں پر ترس آ جاتا ہے، اس کے ترس کو محبت مت سمجھیے گا..... رائٹ۔“

خجستہ نے سر سے پاؤں تک اسے ایک نظر دیکھا پھر استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

”اور کچھ کہیں گے آپ.....؟“

”کہہ ہی نہیں، میں بہت کچھ کر بھی سکتا ہوں۔“

”شوق سے۔“ وہ کہہ کر تیز قدموں سے ایک وارڈ میں داخل ہو گئی تھی، پیچھے وہ تھلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اطہر کے جیلے اتنے محسوس نہیں ہوئے تھے جتنا ہادی کا دھیمالوجہ اس پر کارگر ثابت ہوا، کتنے دن وہ

شعوری کوشش سے ہادی سے کتراتے رہی، مگر اندر کچھ کھلک رہا تھا، چاہتے ہوئے بھی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پاتی تھی۔ اس دن وہ ہاسپٹل کے گراؤنڈ میں بیچ پر کچھ پڑھنے کے لیے بیٹھی تھی، لیکن ذہن بے طرح منتشر ہو رہا تھا، تب ہی وہاں ہادی بھی آ بیٹھا، وہ اس کے بیٹھنے پر چونکی ضرور مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ بیچ پر آگے کو ہو کر بیٹھا۔ کچھ دیر بعد آہستگی سے بولا تھا۔

”مس خجستہ، غالباً آپ نے بتایا تھا آپ کے تایا کے دو بیٹے ہیں، ایک تو آپ کے بہنوئی ہیں امروز لالہ، دوسرے.....“ وہ رک کر ذمہ داری سے

دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”کیا وہ آپ کے.....؟“ خجستہ نے آنکھیں سختی سے بند کیں۔ اثبات میں سر ہلایا۔ ہادی کے ماتھے کی ناگواری لہجے میں درآئی۔

سال پہلے اسپورٹس گالا پر اس نے درخزنی کو تب دیکھا تھا جب وہ خجستہ کو گھر لے جانے آیا تھا۔ اس کی چال ڈھال، دیکھنے بولنے کا انداز ہادی کو بہت عجیب لگا تھا۔ خاص کر جب اس نے اسٹال پر کھڑی لڑکیوں کو

اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ بے فکری سے باتیں کرتے دیکھ کر نخوت سے ناک چڑھائی۔

”ماں باپ سمجھتے ہیں ڈاکٹر بن رہی ہیں۔ ادھر تو یاریاں چل رہی ہیں۔“

ہادی کا جی جا رہا تھا اس کا منہ توڑ دے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا چادر میں لپٹی خجستہ اپنی چیزیں اٹھائے اس کے پاس آکھڑی ہوئی، پھر پتا چلا تھا یہ اس کا کزن ہے۔

اس کے پیچھے چلتی خجستہ کو دیکھ کر وہ تاسف سے سوچتا رہ گیا۔ ”بیچہ کہتے ہیں گڈ بویوں میں بھی لعل ہوتے ہیں۔“

اس وقت خجستہ کا اقرار میں ہوتا سراسر پھر سے تپا گیا۔

”کیا آپ سمجھتی ہیں، یہ ایک پرفیکٹ بیچ ہے؟“

”ہمارے بیچ ہمارے بزرگ بناتے ہیں۔“

وہ جو — انہیں پرفیکٹ لگتا ہے۔“

”لازمی تو نہیں بزرگ ہر بار پرفیکٹ ہوں، انہیں سمجھایا جاسکتا ہے، قابل کیا جاسکتا ہے..... آپ پڑھی لکھی ہیں خجستہ، وہ کسی صورت بھی آپ کے قابل نہیں۔“

”ہمارے ہاں قابلیت کا معیار روایات ہیں..... اور پلیز۔“ وہ مزید بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ہادی آج بہت کچھ کہنے بیٹھا تھا۔

”آپ ایک ڈاکٹر ہیں، جو اپنے ساتھ سنسیر (مخلص) نہیں، وہ اس پیشے کے ساتھ کیسے سنسیر کی دکھا سکتا ہے.....“

اس نے اپنے لہجے کی نمی کو قابو کرتے اٹل انداز میں کہا تھا۔

”ڈاکٹر ہادی، ہم کوئی اور بات کر سکتے ہیں۔“

”بالکل کر سکتے ہیں خجستہ، میں آپ سے بہت محبت کرنے لگا ہوں..... اور آپ کو یوں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

خجستہ نے اسے میکانیکی انداز سے دیکھا۔

”پلیز سوچئے گا ضرور۔“ وہ کہہ کر چلا گیا تھا مگر اس کے دل کی دھڑکن بے حد بے ترتیب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ہادی نے ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی اپنے حلف کے مطابق گورنمنٹ جاب کے لیے اسی ہاسپٹل کو ترجیح دی تھی، خجستہ کی بھی ہاؤس جاب شروع ہو چکی تھی۔ جیسے ہی اس کے گھر والوں کو پتا چلا تھا

اس کا کورس پورا ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا ہے۔ خانی بیگم نے شادی کی تیاریاں تیز کر دی تھیں، اور

داجی نے جمال خان کے حصے کی زمین پر کلیٹک بنوانے کا کہا۔ درخزنی جو گھر کی مرمت اور پتھر کے فرش ڈلوانے میں بہت دلچسپی لے رہا تھا، کلیٹک کی

تعمیر پر اس کا ماتھانا گوار بلوں سے بھر گیا۔

”کیا مطلب ہے، شادی کے بعد بھی وہ باہر رہے گی..... رہنے دیں داجی، کچھ سالوں بعد دیکھیں گے یہ سب، پہلے گھر بار دیکھیے، بچے پالے۔ یہ بعد

میں ہو جائے گا۔“

امروز کو اس کی بات پر غصہ تو بہت آیا تھا، مگر داجی کی وجہ سے اپنا لہجہ قدرے نارمل رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”سب کام ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ وہ پڑھی لکھی ہے، سنبھال لے گی۔“

چادر کی ہٹل مارتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھا۔ ”لیکن شادی کے بعد میری مرضی۔“

اس کے الفاظ بیچ میں رہ گئے تھے، ہاتھ روم سے صفورا بیگم کی خطرناک چیخ سنائی دی تھی۔ ہاتھ روم میں سادہ فرش توڑ کر پتھر کی ٹاپلیں لگوائی گئی تھیں۔ صفورا کا یاؤں پھسلا، دونوں بیٹے بہت مشکل سے بھاری بھر کم ماں کو اٹھا کر باہر چارپائی تک

لائے، ان کے کراہنے میں کسی صورت کی نہیں آ رہی تھی۔ خدشہ تھا گھٹنے کی ہڈی ٹوٹی ہے۔ امروز خان جراح کو گھر لے آیا، جو عورت ٹوٹی والا برقع لے کر گھر سے نکلتی ہو وہ چارپائی پر جراح کے سامنے لیٹی تھی۔

اس نے پہلے اس کی ٹانگ کو ڈھکے ڈھکے ہی جانچا پھر ”گھٹنا ٹوٹ گیا ہے“ کہہ کر کچھ پھلیاں،

پٹیاں اپنے سامان سے نکالنے لگا۔ جب اس نے بوڑھی صفورا کی شلوار کا پائینچہ اوپر کو سرکایا تو درخزنی کا

چہرہ ایک لخت تپ گیا اس نے آنکھیں سختی سے پٹی اور وہاں سے ہٹ گیا، جتنی ماں کو تکلیف تھی اسے ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ چھوڑا بھی نہیں جاسکتا تھا، کسی مرد کے سامنے اپنی ماں کی برہنہ ٹانگ دیکھنا بھی مشکل تھا،

اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ عورتوں کے علاج کے لیے عورت معالج کا ہونا بھی ضروری ہے۔

صفورا چارپائی سے لگ گئی تھیں۔ جراح روز دیکھنے آتا تھا۔ خجستہ کو پتا چلا اس نے چھوٹے ہی کہا تھا۔

”کیا مطلب ہے۔ آپ لوگوں نے ایسے ہی ان کی ٹانگ بندھوا دی..... ان کا ایکسرے کرواتے پھر پتا چلتا..... آپ انہیں فوراً یہاں لے آئیں۔“

ایکسرے کا سن کر درخزنی کے کان مزید تپ گئے، یعنی اب تصویر بھی مرد سے اتروائیں، اور جانے کیا کیا

بھونٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہل آگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا چھوٹی چھوٹی دکانوں میں ملتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں سوہنی خریدنا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف - 150/- روپے ہے دوسرے شہروں کے لئے بھی آڈر بھیج کر جیٹر پارسل سے منگوائیں اور جیٹر سے منگوانے والے مٹی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے - 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے - 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے - 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارج شامل ہیں۔

منی آرڈر بھجوانے کے لئے ہمارا پتہ:

بھونٹی بکس، 53- اورنگیہ سمارکٹ، یکطرفہ طور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستخط خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں
بھونٹی بکس، 53- اورنگیہ سمارکٹ، یکطرفہ طور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

امروز خان بری طرح چونکے تھے وہاں وہ خود اس سے زیادہ چونکی اور پھر اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے زور زور سے روئی تھی۔

”کاش میں بھی زربخت جیسی ہوتی، ہر فیصلہ اپنی قسمت سمجھ کر شکر رہتی..... میرے اللہ! مجھے اپنی تقدیر کو خوش خوشی قبول کرنے کی طاقت دے دے..... ایک طرف میرا مستقبل ہے، ایک طرف میری روایات، میں نہیں چاہتی ان دونوں کے بیچ سزا دار میری تعلیم بن جائے۔“

آن واحد میں اس کی نگاہوں کے سامنے زمینوں پر کام کرتے اکرم چاچا کے میلے کچیلے بچے گھوم گئے، اس کا سر ٹرانس کی صورت نفی میں ہلا تھا۔ زربخت کی دو پیاری پیاری بیٹیاں اسے اپنے گرد کھڑی نظر آئیں۔ ترسی نگاہوں میں سوال لیے، اس نے اپنی آنکھیں پھیلی کی پشت سے رگڑ ڈالیں۔

”بخشت تو ان کے لیے رستہ بنانے نکلی تھی، اور دیوار بنانے میں لگ گئی، یہ سکھایا ہے تعلیم نے تجھے.....؟“

”بخشت، یعنی مبارک، خوش بخشتی پھر کیوں زربخت کی بیٹیوں کے لیے بد بخشتی کی علامت بننے لگی۔“

پانی پی کر اپنے بھرائے لہجے کو قابو کر کے اس نے امروز خان کو کال ملائی۔

”جی لالہ، سگنل نہیں آرہے..... میں نے آپ کو بتانا تھا کورس تو پورا ہونے والا ہے لیکن کچھ ٹائم لگ جائے گا، مجھے اپنی کیلینڈر کر دانی ہے، پھر اگلے مہینے کانفرنس ہے اس میں اسناد اور میڈیٹیشن ہے، بس یہی دو تین ماہ ہیں، پھر میں آ جاؤں گی۔“

☆☆☆

وہ اپنے دل کو مکمل طور پر سمجھا چکی تھی اور اس پر کاربند رہنے کے لیے ڈاکٹر ہادی سے جان کر گریز کرتی رہی، یہ اس رات کی بات ہے جب نائٹ ڈیوٹی دینے کے بعد دو گھنٹے کے لیے ملنے والے آرام کے بریک میں وہ اشاف روم میں رکھے لکڑی کے

میرا وہی کا انٹرسٹ آپ ہی رہیں۔“

”کب جارہے ہیں آپ.....؟“

اس کے یکسر الگ سوال پر وہ پھیکا سا ہنسا۔ ”چھ سات ماہ لگ جائیں گے اپروول میں..... لیکن یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔“

”ڈاکٹر ہادی، ہماری زندگیوں میں بہت سی باتوں کے جواب نہیں ہوتے۔“

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ وہ بولتے ہوئے ساتھ اٹھا تھا۔ ”لیکن مجھے اس بات کا چاہیے..... پلیز روایات کی بھینٹ اپنا فیوچر مت چڑھائیں، میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔“

اس کے چند جملے لاشعوری طور پر درخزنی اور ہادی کا موازنہ کرنے پر اکساتے، ان کی چال ڈھال، اخلاق، انداز، سوچ اور مستقبل۔ ہادی ہر بار آگے آکھڑا ہوتا، وہ سختی سے آنکھیں بند کر کے خود کو باور کرواتی تھی۔

”نہیں! میں کیوں کسی کو سوچنے لگی“ اپنے اندر چھڑی جنگ کا اندازہ اسے اس دن ہوا جب وہ عصر کی نماز پڑھ کر دعا مانگنے لگی ہی تھی کہ امروز لالہ کا فون آگیا جائے۔ نماز پر بیٹھے ہوئے اس نے فون اٹھایا۔

”تم بتا رہی تھیں، تمہارا کورس پورا ہونے والا ہے، پھر کب لینے آؤں تمہیں.....؟“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے لالہ، جب پورا ہوگا بتا دوں گی۔“

اس کے جواب میں وہ آرام سے بولے تھے۔ ”مجھے نہیں، درخزنی کو جلدی ہے شادی کی، سب تیاری ہوگئی ہے، بس تمہارا انتظار ہے۔“ سنتے ہی اس کے تن بدن کی گرمی لہجے میں اٹدی۔

”اسے کب جلدی نہیں تھی لالہ..... اس کی جلدی کی خاطر میں اپنی تعلیم تو داؤ پر نہیں لگا سکتی ناں۔“

ایک لخت اس کے فون بند کر دینے پر جہاں

ہوگا کیونکہ ایک مہینہ ہو گیا تھا جراح کے علاج سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا، اس نے بخشت سے فون پر کہا تھا۔

”کیا تم نہیں یہ سب کر سکتا..... مطلب مورے (ماں) کی مرہم بیٹی، تم بھی تو کب سے ڈاکٹر بن رہا ہے۔“ وہ پھیکا سا ہنسی تھی۔

”پہلی بات تو یہ، میں صرف ابھی ایم بی بی ایس ہوں، اسپیشلسٹ نہیں، دوسری بات ایکسرے کرنے کی پڑھائی شروع سے الگ ہے، وہ وہی کرتے ہیں جنہوں نے پڑھا ہو۔“

”نہیں، اب لڑکیاں بھی اس شعبے میں ہیں، شکر ہے کچھ لوگ ہیں، جنہیں اب سمجھ میں آنے لگا ہے، عورت کی ضرورت کس کس شعبہ زندگی میں ہے..... خیر تم چاچی کو یہاں لے آؤ..... ہو جائے گا۔“

منفورا کا علاج وہاں بہت اچھا ہوا تھا۔ کچھ مہینے پلاسٹر چڑھا پھر پہلے کی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی تھی، اس سب سے درخزنی میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ اس نے جمال چاچا کی زمین کے ساتھ اپنے حصے میں آنے والی زمین بھی اسپتال کی تعمیر میں شامل کر دی۔ اس کی نگرانی میں مزدور مستری تیزی سے کام کر رہے تھے۔

☆☆☆

آنکھوں کے کناروں پر تیرتا اس کا بچپن کا خواب جیسے جیسے تکمیل کی جانب بڑھ رہا تھا، اسے بے پناہ خوش ہونا چاہیے تھا لیکن کبھی بھی دل چاہتا تھا یہ کبھی مکمل ہی نہ ہو۔ دن میں کئی بار خود کو جھٹلاتی کہ وہ خوش ہے اور ہر بار جھٹلانے کے بعد اس کی ٹھکن سوا ہو جاتی۔ پانچوں سالوں میں ڈسٹنکشن (امتیازی گولڈ میڈل) لینے والی بخشت کو مشکل ترین پڑھائی نہیں تھکا سکی تھی، جتنا آنے والے لہجوں کی سوچ نے تھکا دیا تھا۔ جس دن ڈاکٹر ہادی نے کہا تھا۔

”ڈاکٹر! بخشت میرا لندن اسپتال نیشن کا اسکالر شپ آگیا ہے، اور میری شدت سے خواہش ہے،

سخت بیچ پر لیٹی تھی، اس کی آنکھ لگے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بریرہ کے رونے کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی، اسی وقت روم میں کئی سینئر ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے تھے جن میں ڈاکٹر ہادی بھی شامل تھا۔ سینئر ڈاکٹر بریرہ کو سمجھا رہے تھے۔

”ڈاکٹر بریرہ! اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے، ہمارا کلچر ہی ایسا ہے۔ پہلے تو گھر والے خود ڈاکٹر بننے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں، جب بات ہاتھ سے نکل جائے تو پشیمند ڈاکٹر کے سر لگانے لے آتے ہیں۔“

”سراوہ مر گیا، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں..... اس کی بیوی مجھے بد دعا میں دے رہی تھی، کہ ہمیں اپنی فیس سے غرض ہے، میری لاپرواہی سے اس کے میاں کی ڈ-تھ ہوئی۔“

ایچ او ڈی تاسف سے ہنکارا بھرتے آگے بڑھے۔ ”ڈاکٹر صرف وسیلہ ہے، اور وسیلوں کی سلامتی کی دعا کرنی چاہیے، لیکن نادان لوگ ہمیں خدا سمجھ لیتے ہیں..... کیا دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں کہیں نقصان نہیں ہوتا، انسان کی بنائی ہوئی مشین کو ٹھیک کرنے میں انسان غلطی کر جاتا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی مشین کس قدر پیچیدہ اور ہر ایک دوسرے سے بے حد مختلف، کیا یہاں انسان سے غلطی نہیں ہو سکتی..... دل کے مریض کو پمپ کرنے میں مریض کی چند ٹوٹی پسلیاں لوگوں کو دکھائی دے جاتی ہیں، جو زور لگانے میں ڈاکٹر کے کندھے اتر جاتے ہیں، وہ دکھائی نہیں دیتے، کیوں کہ داویلا کرنے والے ہمارے بیوی بچے پاس نہیں ہوتے.....

ہزاروں مریضوں میں کتنی کی چند ڈ-تھ ہماری فیس اور کوتاہی لگتی ہے، جو ہزاروں صحت یاب ہو کر گھروں کو جاتے ہیں، نیا جنم پاتے ہیں، تب ہماری نیند سے خالی آنکھیں دکھائی نہیں دیتیں.....

ڈاکٹر کے ہاتھ، دماغ آنکھیں دنیا کے قیمتی ترین ہاتھ، دماغ، آنکھیں ہیں، جو اللہ کی بنائی مخلوق کی بہتری میں بہر حال مصروف ضرور ہیں..... چلیں شاباش منہ ہاتھ دھوئیں اور چائے پیئیں..... ہمارے

لیے۔ اعزاز بہت ہے۔ لوگ بے شک ہمیں گالیاں دیں، لیکن ان کے دکھ تکلیف سننے کے لیے اللہ نے ہمیں چنا ہے، انہیں ٹھیک کرنے کا ہمارا عہدہ ہے، ہم پوری کوشش بھی کرتے ہیں۔“

باقی ڈاکٹر اس کے شانے تھپکتے ایک ایک کر کے چلے گئے مگر ڈاکٹر ہادی وہیں تھا، اس نے کن آنکھوں سے خستہ کی نیند سے ٹھکی ٹھکی گلابی آنکھیں دیکھ کر کہا۔ ”چلیں آئیں میں آپ کو چائے پلاتا ہوں۔“

”نہیں..... خستہ تو اٹھارہ گھنٹے بعد اب سوئی تھی، میری وجہ سے اٹھ گئی..... سو جائیں خستہ۔“ بریرہ شرمندہ ہوئی۔

اس نے اپنی پوری آنکھوں پر رکھتے ہوئے دبائیں۔ ”نہیں اب نیند نہیں آئے گی.....“

ہادی فوراً بولا ”چائے یہیں منگوا لیتے ہیں۔“

ہون کے چائے لاتے ہی بریرہ نے گرم گرم چائے حلق میں اٹھیلی اور بھاگی۔ ”مجھے تو وارڈ کا راونڈ لگانا ہے۔“

”لوگ ایک مریض کے ساتھ صرف ایک رات جاگ کر ظاہر کرتے ہیں، وہ تھک گئے، وہ پریشان ہیں..... ہم ہر روز ایسے ہی سوتے جاگتے ہیں، لیکن ہماری کوئی قدر نہیں۔“

ڈاکٹر ہادی کے متاسف لہجے پر خستہ مسکرا دی۔ ”کیا کہا جاسکتا ہے، ہم نے اپنی مرضی سے یہ شعبہ چنا ہے۔“

”بالکل..... لیکن کچھ قدر تو ہونی چاہیے..... چلیں کوئی نہ کرے۔ مگر ہمیں خود تو اپنی قدر کا احساس ہونا چاہیے.....؟“

اس کے سوالیہ رک جانے پر خستہ کچھ خفیف ہوئی۔ کچھ توقف کے بعد وہ کہہ رہا تھا۔

”مجھے آپ کے علاقے کا ایڈریس چاہیے..... میرے پیرئس ایک کوشش کرنا چاہتے ہیں۔“

☆☆☆

ہادی نے جب خستہ کا نام اپنے والدین کے آگے رکھا تو انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا صرف والد

نے اتنا پوچھا تھا۔ ”اٹھہر کی کلاس فیلو.....؟ جو ٹوٹلی اسٹکشن ہے۔“ ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”گولڈ میڈلسٹ ہماری بہو بنے ہمارے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔“

باپ کا سراہنا اٹھہر کو تپا گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس پینڈو کو ہادی کے دماغ سے مٹائے۔

”جی بالکل..... اس کے رشتہ داروں میں جہلاء کا پورا خاندان بھی شامل ہے، وہ بھی یاد رکھیے گا۔“

”اٹھہر.....“ اس کے باپ نے سرزنش کی۔

”زندگی ہادی نے گزارنی ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، تمہیں بھی نہیں ہونا چاہیے.....“ پھر ہادی سے کہا۔ ”تم ایڈریس لو، ہم ضرور جائیں گے۔“

اتنا تو اسے پتا تھا وہ انک کے قریبی علاقے سے ہے لیکن ایڈریس لینے کا موقع نہیں مل رہا تھا..... اب موقع ملے ہی اس نے مانگا، وہ خیر سے اسے دیکھتی رہی۔

”خستہ..... ابھی سر عارف کیا بتا کر گئے ہیں، ہمارے ہاتھ، دماغ، آنکھیں بہت قیمتی ہیں، یہ اتنے بے مول نہیں ہیں، ان کی کوئی قیمت نہ لگے، میں نے آپ کا کزن دیکھا ہے، وہ اس قابل نہیں کہ آپ کی قدر جان سکے۔ میں آپ کو آپ ہی کے ہاتھوں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز پلیز..... ایک کوشش کر لینے دیں، پھر جو ہماری تقدیر رنگ دکھائے، مجھے منظور ہے۔“

ہونٹ اندر کی جانب بھینچے وہ سکتے کی صورت اسے دیکھے گئی، پھر بنا کچھ بولے وہاں سے اٹھ کر وارڈ کی جانب بڑھنے لگی۔

”میں نے کچھ کہا ہے آپ سے۔“

”جب سوال کا جواب خاموشی ہو، تو سمجھ جانا چاہیے“ کہہ کر وہ رکی نہیں۔

☆☆☆

اس کے اندر کی تھی جنگ میں ایک بار پھر سے اس نے ہم گرایا تھا، جس سے وہ اچھی خاصی ڈسٹرب

ہوئی تھی، مگر کسی پر ظاہر ہونے نہیں دیا، یہاں تک کہ اس کی ابھی کیفیت پر کئی بار بریرہ نے کریدا، مگر ہنس کر ٹال گئی۔ گھر سے الگ فون آتے رہتے، مریضیں ہو گئیں، پینٹ ہو گئے، کس کے کپڑے آگئے، کس کے سہل گئے، اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی سوائے اس کے کہ وقت یہیں گم جائے،

انہی دنوں تعلیمی اداروں کے بارے میں عجیب سی خبریں آنے لگی تھیں ان میں صداقت تو کیا تھی البتہ جھٹلو نے اپنا پیٹ بھرنے کو خوب اچھالا تھا کہ تعلیمی ادارے خاص کر میڈیکل کالجز منشیات فروشی میں سرگرم ہیں یہ بات یہاں تک صحیح تھی کہ ڈاکٹر زکی رگوں میں خون سے زیادہ چائے کافی دوڑتی ہے، اسے نشہ کھا جائے یا ضرورت، جس طرح کی پڑھائی ہے، اس میں ایسا ہونا اتنا معیوب بھی نہیں۔ آخر انہوں نے بھی اپنے اعصاب پر سکون رکھنے ہیں۔ لیکن اسے منشیات سے ملا دینا سراسر غلط۔

کالج میں کانووکیشن کی تیاری عروج پر تھی، رپبل نے اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف میڈیکل کالجز کے ساتھ ایک مشترکہ کانفرنس بھی رکھ دی، جس کا مقصد اس شعبے کا تقدس، اور اعتماد کی پامالی کی مذمت تھا۔ فائل کے اسٹوڈنٹس کے لیے چھوٹے چھوٹے مقابلے ترتیب دیے گئے، تقاریر، کالم، چھوٹے سے خاکے، فرسٹ ایئر کی لڑکیوں نے اس ٹاپک پر پوسٹر تیار کیے تھے۔ خستہ کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی اس کی بریکٹیکل کاپی ہمیشہ سراہی گئی، ان اسٹوڈنٹس کو جانے کس نے مشورہ دیا تھا۔

”ڈاکٹر خستہ کو چیک کروالو۔“

اور خستہ اتنی نرم خوشی کہ کبھی کسی جوئیر کو اس سے کچھ بھی پوچھتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ اکثر ہی اسٹوڈنٹس کو آن لائن پچرز کی ویب سائٹ بھیجتی رہتی تھی، اسی لیے دولڑکیاں بلا جھجک اپنا پوسٹر لیے اس کے پاس آ گئیں۔

”ڈاکٹر خستہ! کیا یہ ہم نے صحیح بنایا ہے۔“

اس نے پوسٹر کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ لنگو (پچھڑوں) کا پوسٹر تھا ایک ڈرگ لینے کی وجہ سے سیاہی مال بیمار، دوسرا تازہ ہوا کے سبب تروتازہ گلابی سا۔ اس پر عام سی کوئیشن لکھ دی تھی۔ ”فیصلہ آپ کا“، ”خجستہ نے ایک دو جگہ سے ڈرائنگ صاف کر کے ٹھیک کی، بریرہ نے یک دم مشورہ دیا تھا۔“

”خجستہ! اگر ڈرگ والے میں ریل سگریٹ چکا دیں، پوسٹر کمال لگے گا۔“

اس نے تائیدی سر ہلاتے کہا۔ ”لیکن اس وقت سگریٹ کہاں سے آئیں گے، ہم ابھی تو آئے ہیں ہاسٹل سے، پہلے پتا ہوتا تو کہیں سے لے ہی آتے۔“

پانچ بجے کے بعد عام اسٹوڈنٹس کو وارڈن گیٹ سے باہر قدم نہ رکھنے دیتے سوائے باؤس جاب والوں کے، وہ آرام کرنے تو ہاسٹل آئی تھی، باہر جانے کے خیال سے بھی کوفت ہونے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹس نے فدا کیا تھا۔

”میم میں اپنے سی آر کو فون کروں..... شاید وہ لاوے۔“

خجستہ نے لمحہ بھر سوچا پھر اپنا فون اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ ”ڈاکٹر ہادی ہاسٹل میں تھے، ان سے پوچھتی ہوں، شاید دے جائیں۔“

ایک، دو، تین کتنی دفعہ نمبر ملایا مگر فون ریسپونڈ نہیں ہورہا تھا۔ ہوتا بھی کیسے وہ سینئر ڈاکٹرز کے ساتھ اولی (آپریشن تھیٹر) میں مصروف تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔

”چلیں آپ سی آر سے ہی کہہ دیں۔“

قسمت آج خجستہ پر مہربان نہیں تھی۔ شاید اسی لیے اس لڑکی کے موبائل میں بلیٹس نہ ہونے کے سبب اس نے خجستہ کا فون استعمال کیا تھا۔ سی آر سنتے ہی ہونق زدہ سا بولا۔

”سگریٹ..... تم لوگوں نے سگریٹ کیا کرنی ہے۔ گرلز ہوسٹل میں آخر ہونے کیا لگا ہے.....؟“

دماغ ٹھکانے ہے، صبح میڈ کون (میڈیکل کافرٹس) ہے، پرنسپل تمہارے پر نیچے اڑا دے گا۔“

”ادھو ہمیں چاہیے اور وہ بھی دو ڈیاں، کسی

بھی طرح، ابھی، اسی وقت۔“

سی آر کو پریشانی تھی۔ آخر انہیں بیٹھے بیٹھا سوچھی کیا سگریٹ پینے کی، خجستہ نے فون لے کر ان سب بتا ہی دیا۔ وہ فوراً ادب سے بولا تھا۔ ”جی ڈاکٹر خجستہ..... ہم کسی طرح ارجح کرتے ہیں۔“

رات کے اس پہر کیا، دن میں اجازت ہے لڑکے گرلز ہاسٹل میں قدم رکھیں۔ انہیں بھی میں نہ آتا کہ کس طرح سگریٹ ان تک پہنچاؤں اگر قدرتی طور پر ڈاکٹر اطہر ان کے پاس کچھ چیک کرنے نہ آئے ہوتے، خجستہ کے نام پر جو اور رک کر پوری بات سنی۔

”ہاں تو یہ کون سا مشکل ہے، لیکن تم لڑکے کام کے بدلے، کچھ رعب تو دکھاؤ..... چلو ان کو کہو، جس کے فون سے آرڈر ہوا ہے، وہ خود گیٹ لینے آئے۔“

فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہچکچا کر بولا۔ ”بھائی سینئر ہیں، ہم کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”جیسے اس نے آرڈر دیا ہے، کہو شاباش۔“

اور کون سا گیٹ سے باہر آتا ہے، صرف اندر۔ ریسپونڈ کرنا ہے۔“ اسٹوڈنٹ نے ڈرتے ڈرتے کہ خجستہ سن کر ہنس دی۔

”اچھا چلو، وہ لائیں تو سہی، میں جاتی ہوں۔“

☆ ☆ ☆

وہ موبائل پر کچھ ٹائپ کرتی ہوئی ہاسٹل گیٹ جانب بڑھ رہی تھی، گیٹ کیپر ایک بیک ہاتھ پکڑے گیٹ کے اندر کی سمت کھڑا تھا۔ فرسٹ کے لڑکے ایک کالج بیک اسے یہ کہہ کر پکڑا گئے تھے۔

”اے بلاک، روم نمبر نان کی ڈاکٹر خجستہ کا بیک کا میں رہ گیا تھا، یہ انہیں دینا ہے۔“

گیٹ کیپر نے کھول کر اوپر سے اندر جھاکیٹھسکوب، بی بی آپریشن اور آل، ایک دو کلا اس نے بیک بند کیا، تب ہی خجستہ سامنے سے دکھائی دی۔

”انکل میرا کچھ سامان آنا تھا؟ کیپر نے

اس کی جانب بڑھایا، وہ شکریہ ادا لے کر مڑی ہی تھی کہ اسی وقت ڈاکٹر ہادی کی کال آگئی۔ انہوں نے ہنسنے ہی پوچھا تھا۔

”آپ کال کر رہی تھیں خیریت.....؟“

”جی جی، وہ.....“ اس کی وضاحت بچ میں رہ گئی تھی کہ وارڈن تیز تیز اس کی جانب بڑھتے قدرے زور سے بولی تھی۔

”کیپر سے کیا لیا ہے آپ نے.....؟“

”میم! یہ بیک، ہاسٹل میں رہ گیا تھا۔“ اس نے فون نیچے کرتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”ادھر دکھائیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر بیک دم اس کے ہاتھ سے بیک کیخجستہ ”وہ وہ میم“ کرتی رہ گئی کہ ادھر ہادی پوچھ رہا تھا ”کیا ہوا“۔

وارڈن نے سیکنڈوں میں زپ کھول چیزیں نکالیں۔ اور آل کھینچتے ہی سگریٹ کی ڈیاں دھپ سے باہر گریں اس کی کوئی وضاحت سننے بنا وارڈن زور زور سے چلانے لگی ”کیا ہے یہ..... تم ڈرگ سپلائی کر رہی ہو ہاسٹل میں، پھر کہتے ہیں میڈیکل کے خلاف پروپیگنڈا ہوتا ہے..... ابھی پرنسپل سے بات کرتی ہوں۔“

”خدا کے لیے میڈم میری بات سنیں۔“ اس کے زور سے چلانے پر وہ اور زور سے بولی۔

”اب جو سننا سنا ہے، اپنے پرنسپل اور پولیس کو سنانا۔“ پولیس کے نام پر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں۔ اس کی کوئی بھی بات سننے بنا وارڈن پرنسپل کو کال کر چکی تھی اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ادھر ہادی پریشان تھا، ہوا کیا.....؟

گرلز ہوسٹل سے ڈرگ پکڑی جانا معمولی بات نہیں تھی۔ پرنسپل ہاسٹل سے خاصے فاصلے پر تھے۔ انہوں نے اسی وقت تین چار بجے اوڈی کو گرلز ہاسٹل بھیجا تھا۔ ڈاکٹر ہادی بھی ان کے ساتھ ہونے کے سبب آگئے، اُسے اطہر گیٹ سے کچھ فاصلے پر ملا تھا۔ اور استہزاء سے سرگوشی کی تھی۔

”سنا ہے تمہاری لور ڈرگ سپلائی کرتی پکڑی

گئی۔“ ہادی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

وہی تو اطہر کو کوئی اندر گھسنے نہ دیتا، بڑی عمر کے ڈاکٹر کی ٹیم کے ساتھ چلتے ہادی سے باتیں کرتے وہ بھی ساتھ ہولیا تھا، کیپر نے گیٹ کھولا ادب سے چلتا ہوا انہیں وارڈن آفس تک لے گیا۔

☆☆☆

خجستہ سر ہاتھوں میں گرائے خاموش بیٹھی تھی۔ باقی لڑکیاں وضاحتیں دے رہی تھیں۔ وارڈن ایسے بیٹھی تھی جیسے اسے سنا ہی نہ دیتا ہو۔ ڈاکٹر ز کے داخل ہوتے ہی یک دم سکوت سا چھایا۔

”اور کس کس کو اطلاع دی ہے، آپ نے.....؟“

نیورو کے ایچ او ڈی اتنی زور سے بولے تھے، وارڈن اگر کریسی کا بازو نہ پکڑتی تو نیچے ہی گرتی جس طرح وہ اچھلی تھی۔

”صرف پرنسپل کو۔“ آواز کپکپا گئی۔

”خجستہ میری اسٹوڈنٹ، پھر مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، کیا میرا نمبر نہیں ہے آپ کے پاس؟“ ان کا غصہ عروج پر تھا اور وارڈن کے بعد، جب خجستہ نے ساری بات بتائی تو ان کی گہری رنگت تانے کی مانند تھی۔ فرسٹ ایئر کے سی آر کو بھی فوراً تحقیق کے لیے ادھر بلوایا تھا۔

”لیکن اس کا کیا ثبوت ہے، وہ پوسٹر پر لگانی تھیں..... اور منگوانے سے پہلے مجھ سے اجازت نہیں لیتی چاہیے تھی کیا۔“

پہلے خجستہ کو پھر اپنے دفاع میں بولتی وارڈن کو ایچ او ڈی نے گھر کا تھا۔

”پہلے آپ بتائیں، آپ کو الہام ہوا تھا، بیک میں کچھ ہے؟“

”سرا مجھے کال آئی تھی۔“ وہ جلدی سے اپنے موبائل میں کال لاگڑ چیک کرنے لگی۔ سی آر جیسے ہی ڈیاں بیک میں ڈال کر باہر نکلا۔ اطہر نے اپنا نام لیے بنا وارڈن کو انفارم کیا تھا۔

ساری بات واضح ہو گئی تھی۔ ایچ او ڈی کو رہ رہ کر خجستہ پر غصہ آ رہا تھا۔

”پوسٹر فرسٹ لیئر کا ہے، آپ کیوں گئیں یہ لینے؟“
 خجستہ کے بولنے سے پہلے ہی فرسٹ لیئر کی لڑکی
 ہاتھ ملتے مستثنائی تھی۔ ”سراسی آر نے کہا تھا۔ جس
 نے آرڈر دیا وہ ہی وصول کرنے آئے۔“
 سنتے ہی سی آر کو کانوں سے دھواں نکلتا محسوس
 ہوا اور نگاہ ڈاکٹر اطہر کی جانب اٹھی۔ اطہر کو بھی امید
 نہیں تھی وہ اُس کا نام لے دے گا مگر اس وقت ایچ
 او ڈی کا غصہ قیامت کا سماں پھیلا رہا تھا، سب کو اپنی
 پڑی تھی۔

”ڈاکٹر اطہر کا مشورہ تھا۔“

سب کی میکانیکی انداز میں نظر اطہر پر اٹھی، سبز
 آنکھوں میں بے یقینی کا پانی اٹھ آیا۔ کیا کوئی اتنا بھی گر
 سکتا ہے۔ دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے اتنی بچ
 حرکت۔ آخر کلاس فیلوز تھے، ڈاکٹر ہادی کی مٹھی سختی
 سے بھینچ گئی، جس کی رگیں تن کر ابھر آئیں۔ ایچ او ڈی
 کی نگاہوں کی تندہی ہی کافی تھی، اطہر کی جان نکالنے
 کے لیے اس نے مکر سے ہونے والی آر کو ڈپٹا شروع کیا
 ہی تھا جب ایچ او ڈی نے وارڈن سے نمبر لے کر
 اپنے موبائل میں ڈالنا شروع کیا پہلے ہند سے
 ہی اطہر کا نام اسٹین ہوا۔ ہند سے پورے ہونے تک
 اسی کا نام رہ گیا تھا۔ جلدی میں اس سے یہی غلطی ہوئی
 تھی۔ اپنے ہی نمبر سے کال کر دی۔ ایچ او ڈی نے
 اس کے ساتھ جو کرنا تھا سو کرنا تھا البتہ کمرے سے
 نکلتے ہادی کا ہاتھ بے اختیار اٹھا۔ اس کے گال پر نشان
 چھوڑ گیا۔

”آئی ایم شیمڈ آف بینک یور برادر۔ (مجھے
 تمہارا بھائی ہونے پر شرم آرہی ہے)۔“
 خجستہ کو ایچ او ڈی نے اشارے سے باہر جانے کا
 کہا، سب بچے ایک ایک کر کے باہر نکل گئے تھے، پھر
 جو اطہر کی کلاس ایچ او ڈی نے لی، یہ وہ ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

وہ رات اُسے زندگی کی بہت سیاہ رات لگی تھی۔
 وہ جانتی تھی اس نے حیثیت سے بڑھ کے خواب دیکھ
 لیے تھے۔

لیکن خوابوں کی یوں پامالی، اتنا بڑا الزام پہلے
 چیٹنگ جیسا، اب ڈرگ سپلائی، یہ حیثیت دی خاندانی
 ڈگری ہولڈر نے، کل ہونے والی تقریب کی ساری
 خوشی آنسوؤں میں بہتی محسوس ہوئی۔ وہ کمرے سے نکل کر
 کوریڈور میں آئی تھی۔ رات کے سنانے کو چیرتی
 جھینگروں کی آوازوں میں کئی دن پہلے ہونے والی
 داعی کی نیلی فونک گفتگو آج سنا کر دے رہی تھی۔
 ”خجستہ بچے، جب تم آئے گا، حیران ہو جائے
 گا۔۔۔۔۔ بڑا کام کیا ہے تم نے یہاں۔“

”ایسا کیا کر دیا داعی۔۔۔۔۔؟“
 ”اس پانچل کے بچے کو سیدھا کر دیا ہے۔۔۔۔۔ صبح
 ہی نکل جاتا ہے، پہاڑ سے پچھلی زمین پر، رات کو
 بلب، لائٹنیں جلا کر کام پورا کروا رہا ہے۔۔۔۔۔ اب بھی
 دیکھو، دس بج گئے ہیں، ابھی تک نہیں آیا۔ مزدور
 اُسے گالیاں دیتا ہوگا۔۔۔۔۔ ہاہاہا۔“

پھر ان کا اونچا قہقہہ تھا۔ اس وقت تو وہ قہقہہ
 اپنے مستقبل کا مذاق اڑاتا لگا، لیکن اس وقت شیشے کی
 دندو کے پار دکھائی دیتی سیاہی میں ایک نو تعمیر عمارت
 کا ڈھانچہ نظر آیا، جس میں کہیں کہیں زرد بلب جل
 رہے تھے۔ سرخ اناری گالوں پر بستے پانی کی دھار
 اس نے دونوں ہاتھوں کی تھیلیوں سے پوچھی۔ اپنے
 موبائل سے ایک کال کر کے واپس اپنے کمرے میں
 آ کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

عام سادہ دن بہت خاص بن گیا تھا۔ پورا کالج
 ایسے جگمگا رہا تھا جیسے اس علاقے میں عید کا اعلان ہوا
 ہو۔ گراؤنڈز میں میڈیسنز اور آلات جراحی کی پیشتر
 کمپنیوں نے جا بجا اسٹال لگا رکھے تھے۔ حفظان
 صحت، وائرس سے بچاؤ، صاف پانی پر بڑے بڑے
 بینرز کے بیچ کالج کا آفیشیئل جمنڈا لہرا رہا تھا، چہار
 اطراف سفید کوٹ میں ملبوس تیز قدموں کی آواز نے
 ایسا سماں باندھا تھا کہ چھوٹا سا بچہ بھی دیکھ لے تو اس
 ماحول کا حصہ بننے کی اسی دن سے تمنا کرے۔ سیدھی
 کمر، گردن اٹھائے سفید کوٹ والوں سے آڈیٹوریم

بھرتے ہی پر وقار تقریب کا آغاز ہوا، چھوٹے
 چھوٹے مقابلوں کے بیچ جب ڈگریوں کی تقسیم پر
 اعلان شروع ہوئے۔ پہلا نام جو مائیک میں گونجا تھا
 نہ صرف پرنسپل کا سر فخر سے اٹھا، بلکہ پورا یو ایچ ایس
 کا وفد اعزازی تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ اعلان بار
 بار ہو رہا تھا۔

”ڈاکٹر خجستہ جمال خان۔۔۔۔۔ ڈاکٹر خجستہ جمال
 خان۔۔۔۔۔ پلیز کم آن دی اسٹیج۔۔۔۔۔ پلیز۔“
 گونج کے جواب میں کوئی چاب نہیں ابھری
 تھی۔ متلاشی نگاہوں کے ساتھ گردنیں بھی ادھر ادھر
 گھومیں۔ ایک سال میں ڈسٹنکشن لینے والوں کے
 دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی۔ کب ہمارے میڈل کا
 اعلان ہوگا، کب ہم ایچ پر جائیں اور جو پانچوں سال
 ڈسٹنکشن لے، جس کے لیے مہمان خصوصی خود انعام
 لے کر بیٹھا ہو، وہ تقریب سے غیر حاضر۔؟

وہ نہ تو کسی کو ہرانے آئی تھی نہ ہی جیتنے، بس
 اسے تو سنگٹا پتھروں پر مر رہا تھا، اس تقریب
 کی ساری خوشی رات لگے بے بنیاد الزام میں کافور
 ہوئی، خود پر بچنے والی ہر تالی نے دل میں ہی دم توڑ دیا
 تھا۔ میڈلز اور ڈگری تو بعد میں آفس سے بھی لی جاسکتی
 تھی پھر اس تقریب میں خود پر تالیاں بجوا کر کیا مل
 جاتا۔ وہ اس میں سرے سے آئی ہی نہیں، حاضرین کی
 بے چینی، چہ گولیاں روکنے کے لیے اسپیکر سے
 دوسرے نام گونجنے لگے۔ ڈاکٹر ہادی کچھ سوچتے
 ہوئے خاموشی سے اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھا۔
 فون پر مسلسل نکل جا رہی تھی مگر ریسپونڈ نہیں کیا
 جا رہا تھا۔ ہادی کی جھنجھلاہٹ میں پریشانی گل گئی،
 اس کے قدم خود بخود گرلڑ ہاسٹل کی جانب تیزی سے
 بڑھنے لگے وہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا جب سیاہ چادر میں
 لٹی خجستہ ہینڈ بیک کہنی میں ڈالے، اپنا ٹرائی بیک
 کھینٹتے ہوئے کالج کے ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب بڑھ
 رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

”کہاں جا رہی ہیں آپ۔۔۔۔۔!“
 ”جہاں سے آئی تھی، وہاں۔“ وہ ہنار کے بولی۔

”سب بیچ میں چھوڑ کر، ایسے کیسے جاسکتی
 ہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب وہ کانویکشن۔۔۔۔۔؟“
 وہ رکی، مڑی اور ٹھوس لہجے میں بولی۔ ”جس
 مقصد کے لیے آئی تھی وہ پورا ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ ڈگری
 میں لے لوں گی، نو براہیم۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“ اُس کے لہجے میں کوئی التجا سی
 ابھری۔ ”کل جو کچھ ہوا میں اس کی معذرت کرتا ہوں،
 بہت مین حرکت کی اطہر نے۔۔۔۔۔ لیکن ایک کی سزا
 دوسرے کو کیسے دے سکتی ہیں آپ، ڈاکٹر خجستہ۔۔۔۔۔؟“
 اس نے ٹرائی بیک کا ہینڈل چھوڑ کر بازو سینے پر
 لیٹے پھر اٹل انداز میں بولی۔

”دیکھیں ڈاکٹر ہادی! میں ایک پہاڑی لڑکی
 ہوں، وہ پہاڑ جو زمین کی میٹھیں ہیں۔ یہ پہاڑ اپنے
 سلسلوں میں گڑے رہیں تو قیمتی رہتے ہیں۔ سلسلوں
 سے ہٹی پہاڑیاں، لوگوں کے لیے ایک تفریحی مقام
 سے زیادہ کچھ نہیں۔۔۔۔۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں،
 تفریحی مقام پر گنڈ ڈالنا بھی ہمارا ایک چر ہے۔“
 بازو دکھول کر اس نے اپنے بیک کا ہینڈل تھاما،
 چادر ماتھے کی جانب سرکائی۔ ”اور رہی بات ڈاکٹر
 اطہر کی، تو ان کا شکریہ ادا کر دیجیے گا، فیصلہ کرنے میں
 انہوں نے آسانی کر دی۔۔۔۔۔ آپ جیسے قابل ڈاکٹر کو
 بہت سی خجستہ مل جائیں گی، لیکن ان پہاڑوں پر رہ
 جانے والی ہر خجستہ کے آگے میرا خود غرض فیصلہ دیوار
 چن دے گا۔۔۔۔۔ مجھے اپنی نسل کے آگے دیوار نہیں
 چینی۔۔۔۔۔ سو پلیز۔“

وہ بیک میٹھی تیز تیز آگے بڑھی، پیہوں کی رگڑ
 ہادی کو اپنے دل پر محسوس ہوئی تھی۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر
 امروز لالہ اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ وہ رات کو
 ہی انہیں آنے کا کہہ چکی تھی۔ ہادی کا جی چاہا وہ آگے
 بڑھے، لالہ سے ان کے گھر کا ایڈریس پوچھے، اپنا
 بتائے مگر پاؤں زمین سے چپکے سے گئے تھے۔ وہ
 خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا اور ٹیکسی گرد اڑاتی
 نگاہوں سے دور بہت دور بھاگتی چلی گئی۔

☆

امیر خالہ قادیانہ لکھنؤ

”تو کھینچ میری فوٹو تو کھینچ میری فوٹو تو کھینچ میری فوٹو

پیا۔“ فل والیوم میں بجتے گانے یہ ماہی اپنے گرد پوش سے بے خبر تھرنے میں محو تھی۔ نوین بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ دراصل یہ گل کی تقریب کے لیے کی جانے والی خصوصی تیاری کا حصہ تھا۔ جس کی پریشانی پچھلے دو دنوں سے بڑی شدت سے جاری تھی۔ ”ماہی کے فوٹو کھینچنے کا اشارہ دیتے ہاتھ تھم گئے۔ کیونکہ کسی نے سی ڈی پلیئر آف کر دیا تھا۔ ماہی نے ہنسی بھرا کر مڑ کر دیکھا تو تیوریوں پر ہل ہی نہیں چڑھ بھی ہوئے ڈگری کا زاویہ بنانے لگا۔

”کیا مصیبت ہے تمہیں؟“ ماہی نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کڑے تیوروں سے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ”دونوں سے تمہاری دہائیاں سن رہا ہوں سوچا آج تمہاری یہ دیرینہ خواہش پوری کر دی دوں۔ یہ لو۔“ سنی نے بڑی پھرتی کے ساتھ ہاتھ میں پکڑے ڈیجیٹل کیمرے کی مدد سے ماہی کی دو تین زاویوں سے تصویریں اتار لیں۔ ماہی ہکا بکا سی کھڑی سنی کی اس کارروائی پر کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکی۔

”ہاؤ ڈیر یو۔“ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ رخمی سیرنی کی مانند اس پر پل پڑی بلکہ کیمرے پہ پل بی۔

”ارے۔ ارے۔ ارے اتنی اتالی کیوں ہو رہی ہو۔ لو میں خود دکھاتا ہوں تمہارے شاہکار۔“ سنی نے اس سے اپنا کیمرہ بچانے کے لیے اپنا کیمرے والا ہاتھ اندر کر لیا تھا اور محض پارچ فٹ دواچ کے قد کی حامل ماہی سے چھ فٹ سے بھی نکلے ہوئے قامت رکھنے والے کا

مقابلہ کیسے کر پاتی سو دل مسوس کر رہ گئی۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے کیمرے میں ماہی کو اس کی تازہ بہ تازہ تصویریں دکھائیں۔ پسینے میں شرابور ڈوپٹا برائے نام کندھے پر جھولتا ہوا دورنگ کے کپڑوں میں ملبوس ڈالس کے دوران سر کو مسلسل دائیں بائیں جنبش دینے کی باعث بالوں کا قبلہ بھی مختلف سمتوں میں بٹ گیا تھا۔ مجموعی طور پر اس کا حلیہ اس وقت ان کے گھر کے کاموں پر مامور ماسی سروری سے مشابہہ تھا۔

سنی جانتا تھا کہ ماہی تصویروں کے معاملے میں کتنی حساس تھی۔ وہ کبھی بھی سوتے جاگتے برش کرتے اور پکین میں کام کرتے ہوئے فضول سی تصویریں کھینچوانے کی قائل نہیں تھی۔ ہمیشہ تک سک سے تیار اور اگر تیار نہ بھی ہو تو کم از کم حلیہ اتنا معقول ضرور ہو کہ کسی کو دکھانے میں شرمندگی محسوس نہ ہو جب کہ سنی کی اس وقت کھینچی گئی تصاویر میں کھلے منہ اور بند آنکھوں کے ساتھ وہ اتنی ہونق تو ضرور لگ رہی تھی کہ دیکھنے والے کی ہنسی پھوٹ جائے۔

”سنی! بد تمیز انسان! فوراً ڈیلیٹ کرو اسے ورنہ میں تمہارا حشر خراب کر دوں گی۔“ ماہی کا غصے سے برا حال تھا۔

”ڈیلیٹ۔؟ ارے پاگل! میں تو اسے خاندان کے چیدہ چیدہ افراد کو وائس ایپ کروں گا۔“ وہ دل جلانے والا قہقہہ لگا کر بولا اور اس سے پہلے کہ ماہی کیمرے پر جھپٹتی وہ کیمرہ لے کر یہ جاوہ جا۔

”دیکھا تم نے اپنے بھائی کو؟ اول درجے کا کمینہ

شخص۔“ ماہی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا چبا جائے۔

”روز ہی دیکھتی ہوں تمہارے اور ان کے تماشے۔“ نوین نے بے زاری سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ اب کہاں کی پریشانی اور کیسی تیاری وہ بھی واش روم میں گھس گئی ہاتھ لینے۔

اوپر والے پورٹن میں تیا جی کے بڑے صاحبزادے عبداللہ کی شادی تھی۔ گل ماہیوں کی تقریب تھی اور چونکہ گھر میں پہلی شادی تھی لہذا خاندان بھر کی لڑکیاں یکجا ہو کر خوب غل غپاڑہ مچائے ہوئے تھیں۔ شادی بیاہ کے گانوں کی بھرپور سہرسل کی جارہی تھی۔ ماہی اور شمسہ پچھو کی صاحبزادی ماریہ دونوں ہر گیت کی ٹانگ توڑنے پر مصر تھیں۔ جس پر احتجاجاً ”نوین

صاحبہ ڈھولک کو ایک جانب بیٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور کمرے سے نکلنے کے لیے دروازے کی چٹخنی گرا کر جوں ہی دروازہ کھولا چار لڑکوں پر مشتمل ٹولہ سرعت سے اندر داخل ہو گیا اور اس ٹولے کی رہنمائی کرنے والا سنی کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

چونکہ یہ خالصتاً ”زنانہ محفل“ تھی اسی لیے ان تمام لڑکیوں نے کمرے میں لڑکوں کا داخلہ ممنوع قرار دے کر دروازہ اندر سے مقفل کر رکھا تھا۔ حالانکہ سنی نے

اپنے ہی بھائی کی ماہیوں اور رستہ جمعے کی محلے یوں دودھ میں سے گھسی کی طرح نکالے جانے کے گھر کی خواتین کا ناطقہ بند کر رکھا تھا مگر سونے قسمت کہ اسی اور چچی جان وغیرہ سب ہی ان ظالم کزنز کی ہمنوا ہو گئیں مگر بھلا ہو نوین کا جس نے عین اس موقع پر دروازہ کھولا جب سنی اپنے تینوں کزنز کے ہمراہ دروازے کی تاپ پر طبع آزمائی کر رہا تھا۔

”اے۔۔۔ تم لوگ کیا مکھی بن کر دروازے سے چپک گئے تھے جو دروازہ کھلتے ہی اندر گھس آئے۔“ ماہی نے خشکیں نظروں سے چاروں کو گھورا۔

”شرم نہیں آتی اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں کے بیچ یوں



گھسے جلے آئے، چلو نکلو پتلی گلی سے۔" مانی نے ان سب کو انگلی کے اشارے سے باہر کاراستہ دکھایا۔

"پہلے آپ یہاں سے پتلی گلی دریافت کر کے دکھائیں۔ ہم ابھی چلے جائیں گے۔" سنی کا خالہ زاد عمیر دوبارہ مانی گھسے سے مل کھا کر رہ گئی۔

"چلو بھئی لڑکوں! شروع ہو جاؤ۔" سنی نے ڈھولک اٹھائی اور تینوں لڑکوں کے ہمراہ ایک کونے میں اپنی محفل جملا۔

"میرے اگتے میں تمہارا کیا کام ہے جو ہے نام والا وہی تو بدنام ہے۔" سنی نے تان اٹھائی تو وہ تینوں بھی اس کے ہم آواز ہو گئے۔

"جس کی بیوی موٹی اس کا بھی بڑا نام ہے۔" سنی نے اپنی خالہ زاد ارم کی جانب اشارہ کیا جو قدرے فربہ تھی۔

"بستر لٹاؤ گدے کا کیا کام ہے۔" ارم کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔

"جس کی بیوی دہلی اس کا بھی بڑا نام ہے، جس کی بیوی سوہی۔" سنی نے اب کے مانی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تک بندی کی۔

"ارے جس کی بیوی دہلی اس کا بھی بڑا نام ہے، جھاڑو میں لگاؤ، تنکے کا کیا کام ہے۔" سنی کی اس تک بندی پر جہاں لڑکے اش اش کراٹھے وہیں لڑکیاں بھی منہ پر ہاتھ رکھے کھی کھی کرنے لگیں۔ مانی ہنسنے پھلائے خوشخوار انداز میں اس کی جانب بڑھی اور سنی سے ڈھولک جھپٹ کر لے آئی۔

سنی کا ایک کزن لپک کر باہر گیا اور کچن سے آنے کا تسلا لے آیا۔ جوں ہی لڑکیوں نے گانے کے لیے اشارت لیا تو لڑکوں نے بے ہنگم انداز میں تسلا بجانا شروع کر دیا۔ تسلے پر جب مردانہ ہاتھ بڑے تو اس کے بلند ہوتے شور میں ان کی ڈھولک کی ٹھاپ دب کر رہ گئی۔

"گڑ بڑ گڑ بڑ، ہاں گڑ بڑ گڑ بڑ۔" سنی نے شسمیتا سین کے گلے "دلبر دلبر" پر مٹائی ہوئی سکندر صنم کی مشہور زمانہ پیروڈی گائی شروع کر دی۔ لڑکوں کی بے سری

آازیں اور تسلے کا بے ہنگم شور لڑکیوں کو اپنے کانوں پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کر دیا۔

"گڑ بڑ گڑ بڑ گڑ بڑ، ہاں گڑ بڑ گڑ بڑ۔" مانی نے ہماری ہاسی وال کھلائی

جب سے کھائی پیٹ میں ہو گئی گڑ بڑ ہاں ہو گئی گڑ بڑ۔

مانی اس کی اس خود ساختہ ترمیم پر جی جان سے کھول اٹھی۔ اس نے ایک نظر لوٹ لوٹ ہوئی غدار کزنز پر ڈالی اور تن فن کرتی وہاں سے نکل گئی۔

یہ کوئی آج کی بات نہ تھی۔ دونوں کے پورشنز اوپر نیچے ہونے کے باعث ان کی یہ خانہ جنگی بچپن سے ہی چلی آ رہی تھی۔ دونوں کا آپس میں "ٹام اینڈ جیری" والا پیر تھا اور اب اس میں کون "ٹام" تھا اور کون "جیری" یہ تو آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔

عبداللہ کی شادی کا ہنگامہ سرد ہوا تو معمول کی زندگی پھر سے رواں دواں ہو گئی۔ وہی کلج وہی گھریلو کام کلج اور وہی ٹام اینڈ جیری مطلب کہ مانی اور سنی کی جھڑپیں۔ اور اسی دوران گھر میں اچانک ایک نیا شوشا چھوٹا۔ جی وہی شوشا۔

دو لڑتے ہوئے پریموں کو ہمیشہ کے لیے لڑنے کا قانونی اجازت نامہ عنایت کرنے کا۔ مانی نے سنا تو اپنا سر پکڑ لیا اور سیدھی ماں کے حضور جا پہنچی۔

"اماں! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ آپ میرا رشتہ اس اسٹوپڈ اور ال مینڈو شخص سے طے کر رہی ہیں۔"

"ہاں تم نے بالکل صحیح سنا ہے اور یہ ذرا اپنی زبان کو لگام دو۔" اماں نے چشمے کو ناک کی پھنگ پر رکھ کر اس کے پیچھے سے گھورا۔

"اماں! آپ جانتی ہیں میری بچپن سے آج تک کبھی نہیں بنی سنی سے پھر بھی۔" بولتے بولتے اس کا گلہ بندھ گیا۔

"ارے پاگل! ایسا ہی ہوتا ہے۔ پہلے نفرت، لڑائیاں۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔" اماں

نے سمجھایا۔

ان کے اس تجزیے پر وہ کھول اٹھی۔

"افسانوں اور ناولوں میں ایسا ہوتا ہو گا میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی سن لیں آپ۔" مانی پیر پختی کرے سے نکل گئی۔

مانی ہاون دستے میں مسالاجات کو سنی سمجھ کر شدید سے کوٹنے میں مصروف تھی۔ ساتھ ہی سوچوں کا لاتماہی سلسلہ بھی جاری و ساری تھا۔ اسے رہ رہ کے سنی کے پروپونل پر تاؤ آ رہا تھا اور اپنے خاندان کے بزرگوں پر بھی۔

ارے کیا ضروری ہے کہ جہاں خاندان میں دو دشمن پائے جاتے ہوں؟ نہیں پکڑ کر یکجا کر دیا جائے۔ یہ تو طے تھا کہ اماں کا بیان کردہ قدم کلیہ اسے ہر حال میں ناکام بنانا تھا۔ "مگر کیسے؟" یہ ہی سوچ سوچ کر اس کا سر پھٹا جا رہا تھا اور وہ اول درجے کا واپس اتارنے کے لیے رشتہ لانے دیا اپنے ماں باپ کو گھٹنا میسنا کیس کا۔

"مانی! مری او مانی! ہم بخت، مسالا کوٹ رہی ہے یا پورا گھر مسمار کر رہی ہے۔ اتنی زور زور سے ضربیں لگا رہی ہے مانو سر پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔" اماں محن میں دیکھے تخت پر لیٹے سے اٹھ بیٹھیں۔

"اماں! آپ بھی نہیں! جب دھیرے دھیرے کوٹوں تو کیس گی ناشتا نہیں کرتی کیا؟ جان نہیں ہاتھوں میں؟ اب جان لگا رہی ہوں تو وہ بھی برداشت نہیں۔" مانی نے غصے سے ہاون دستے کو پرے کھسکایا۔

"ہاں تو ہر کام اعتدال کے دائرے میں کیا جائے تو ہی بستر انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ کل ہی میں ایک ناول پڑھ رہی تھی یہ ہی بات مصنف نے اپنے ناول کے ذریعے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ کیا نام تھا بھلا۔" اماں نے رائٹر کا نام دیکھنے کے لیے نیچے نیچے باڈا انجسٹ کھینچ کر نکالا۔

"اماں! آپ آج بھی کوئی دلچسپی نہیں ان نام نہاد رائٹرز کے نام جاننے میں ان ہی کی بدولت آپ کے دلغ میں وہ فارمولے والا خناس سما گیا ہے۔ نفرت + جھگڑے = محبت۔ اونہ، مائی فٹ۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چھ! بس زیادہ رڑ کر کے ضرورت نہیں۔ یہ سب سمیٹ کر رکھ اور چھت سے سوکھے کپڑے اتار کر الماری میں سلیقے سے جمادے۔ توبہ، پیر کا درد صحیح کرنے لیتی تھی کٹنا سر میں بھی درد ہو گیا اس لڑکی کی ٹھو کاٹھا کی ہے۔" اماں بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ محو استراحت ہو گئیں۔

"ہے تو آپ ہی کو شوق اس ٹھو کاٹھو کی کا ورنہ اس چور گرا سنڈر کے دور میں کون پوچھتا ہے ہاون دستے کو۔" مانی نے تلملا کر کہا۔

"پھر شروع ہو گئی۔" اماں نے لیٹے لیٹے ہی جھک کر اپنی چپل اٹھائی۔ اس سے پہلے کہ اماں کی چپل میزائل کی طرح اڑتی ہوئی اس کے سر پر لگ کر اس کے خیالات کا تیا ناچہ کرتی وہ پھرتی سے چھت کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ چھت پر پہنچی تو سنی کو بوتروں کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"لوگ کتنے گھنے، مہسنے ہوتے ہیں مجھے اب پتا چلا۔" مانی نے الگنی سے کپڑوں کو بے دردی سے کھینچ کر اتارتے ہوئے کہا۔

سنی نے مڑ کر اسے دیکھا اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "چھا! مگر مجھے تو بہت پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔"

"تم نے سوچا بھی کیسے کہ میں تم جیسے کو تر باز سے شادی کر لوں گی۔" اب کہ مانی نے صاف صاف اس سے بات کرنے کی ٹھالی۔

"اور تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تم جیسی سوکھی کا کڑی اور کالی بندریا سے شادی کر لوں گا۔" اس نے مانی کے اسمارٹنس اور سلوٹے، پُرکشش روپ پر چوٹ کی۔

"چھا! آ آ۔ تو پھر اپنے ماں باپ کو رشتہ لے کر

139 2018

138 2018

بیچنے کا تمہارا مقصد؟" ماہی نے کپڑوں کا ڈھیر پلنگ پر بٹھا اور اس کے دویدو ہو کر بولی۔

"ویسے تو تمہیں میرے ماں باپ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ تم جیسی معمولی شکل و صورت والی کے لیے اپنے اتنے ہینڈ سم سپوٹ کا رشتہ دیا ہے تم لوگوں کو مگر تم سے ایسی امید کہاں؟" اونٹنہ کھسیانی ملی کھبانو چہ۔ "سنی نے طنز بھری مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی۔

"اوہیلو مسٹر ثناء اللہ!" ماہی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ جانتی تھی کہ اسے اپنے اس بزرگانہ سے نام سے کتنی چڑھتی تھی۔ اسی لیے اس نے اپنا نام مختصر کر کے سنی رکھ لیا تھا اور ماہی اس کی اس کمزوری سے کوئی نکر نہ فائدہ اٹھاتی۔

"شٹ اپ! برا ہوں تم سے، کچھ اوب لحاظ کر لیا کرو، مگر نہ جی، جب بد لحاظی کھٹی میں پڑی ہو تو چاہے اخلاقیات کے جتنے سبق رٹو لو کتنے گھڑے کی طرح سب پھسل جاتے ہیں۔" سنی لڑا کا عورتوں کی طرح ہاتھ نچانچا کر بولا۔

"اوہو! تم نے تو جیسے اخلاقیات میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے؟" ماہی دویدو بولی۔ "اور سنو یہ سیاسی لیڈروں والی حرکتیں ترک کرو سمجھو، ایک طرف تو مجھ سے چھتیس کا آکر ایاں رکھا ہے اور دوسری جانب اپنے والدین کو میرے رشتے کے لیے بھیجتے ہو، حد ہوتی ہے منافقت کی بھی۔"

"او میڈم! خوش فہمیوں کی جنت سے باہر آ جاؤ۔ میرے اماں نے میری مرضی جانے بغیر یہ قدم اٹھایا ہے جس کا خمیازہ وہ خود بھگتیں گے اور تمہیں سوچ بھی کیسے لیا کہ میں۔ یعنی کہ میں۔" اس نے "میں" کو خوب چبا کر اور شہادت کی انگلی اپنے سینے پر ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "میں بھیجوں گا اپنے ماں باپ کو تمہارے گھر؟ تم سے شادی کرنے سے تو اچھا ہے کہ میں سامنے والی رقیہ سے شادی کر لوں، لاکھ درجے بہتر ہے تم سے۔"

سنی کی بات پر ماہی کا منہ صدمے سے کھلا کا کھلا رہا۔

گیلا۔ سامنے کھر میں رہنے والی رقیہ۔ جس کے سامنے کے چار دانت منہ بند کرنے پر بھی نچلے ہونٹ پر دھرے رہتے تھے۔ سر پر کتنی کے بال اور رنگ کو سے شرط لگا تاہوا۔

"اوہ اچھا آ آ۔" وہ اس کے دار سے سنبھل کر بولی۔ "چلو اچھا ہوا، تم نے اپنے جوڑ کی لڑکی خود ہی ڈھونڈ لی واہ بھی! پر فیکٹ میچ ہے۔ میں ابھی تالی ملال کو جا کر بتاتی ہوں کہ آپ غلط جگہ رشتہ لے کر آ گئی ہیں، آپ کا بیٹا تو اپنے جیسی لڑکی رقیہ کے فراق میں مارا جا رہا ہے۔" ماہی کے لیے گئے کاری وار پر سنی کو پتہ نہ بہت لگے مگر وہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ملو کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی تو وہ پیچھے سے ہانک لگا کر بولا۔

"ہاں ہاں۔ بتا دینا اور یاد رکھنا، میں مرتے دم تک لڑوں گا، اس شادی کو روکنے کے لیے، سمجھیں۔ یہ شادی کبھی نہیں ہوگی۔ لکھ کر رکھ لیتا۔"

"آمین آمین۔" ماہی بلند آواز سے کہہ کر نیچے اتر گئی۔

"تالی امی کے پورشن میں دو دن سے ٹینشن نے ڈیرہ جمار کھا تھا۔ باپ بیٹے میں عجیب رسہ کشی جاری تھی۔ باپ نے جانے کن وقتوں میں بالا ہی بالا اپنے بھائی سے عہد و پیمان باندھ لیے تھے۔ کچھ روز پہلے کیے گئے اس انکشاف نے سنی کا سکون تہہ و بالا کر ڈالا تھا اور تب سے ہی تالی اماں چکی کے دوپاٹوں کی مانند باپ بیٹے کے درمیان پس رہی تھیں۔ تالی اماں کو تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ گھر کی بچی تھی، سکھیز بھی تھی، بس یہ کہ اس کی سنی سے بالکل نہیں بنتی تھی۔

باپ کی ہٹ دھرم طبیعت کے آگے سنی کی دال گل کرنے دے رہی تھی۔ وہ ہر جہہ آزما رہا تھا۔ دو دن قبل اس نے گھر چھوڑ دینے کی دھمکی دی تو تالی ابا بڑے آرام سے بولے۔

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی، جاؤ شوق سے جاؤ، کوئی نہیں روکے گا تمہیں۔ انٹر کی واجبی سی ڈگر

لے کر ڈگر ڈگر گھومو گے تو چار دن میں ہی تالی یاد آ جائے گی۔ کیونکہ سیر اسٹور جو میں نے تمہیں کھلو کر دیا ہے وہاں تو میں تمہیں بیٹھنے دوں گا نہیں۔ جو کرنا اپنے بل بوتے پر کرنا اور ہاں ساری زندگی پلٹ کر مت آنا۔ اگر ایک بار گھر سے باہر قدم نکالو گے تو میرے جنازے کو کندھا دینے بھی نہیں آؤ گے، سمجھو۔"

جیسے مگر سرد لہجے میں کہتے ہوئے تالی ابا اس لمحے بڑے شفاک لگے۔

سنی کا گھر چھوڑنے کا ارادہ پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس سے اگلے دن اس نے خود کشی کی دھمکی دی تو فرما نے لگے۔

"کیا لا کر دوں صاحب زادے کو؟ کیا کھانا یا پینا پسند فرمائیں گے؟ زہر، تالی فون یا پھر کافور کی گولیاں؟ سنا ہے کافور کی گولیوں کا سفوف بنا کر بھانکنا بڑا مجرب ہے۔ انسان لمحوں میں عالم بالا پہنچ جاتا ہے۔ جاں کنی کے عذاب سے بچ جاتا ہے۔ ویسے سنا تو یہ بھی ہے کہ حرام موت مرنے والے کی بخشش نہیں ہوتی اور وہ اقامت اسی طرح اپنے آپ کو مار مارتا ہے جس طرح دنیا میں اس نے خود کو ختم کیا تھا۔ پھر بھی تمہیں یہ سب کر کے اپنے رب کو خفا کرنا ہے، اپنی آخرت برباد کرنی ہے تو تمہاری مرضی، سب کو اپنی اپنی قبر میں جانا ہے اور اپنے اپنے اعمال کا خود جواب دینا ہے۔"

تالی ابا کے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کھینچے گئے نقشے سے سنی کو تھر تھری لگ گئی۔ یہ نہیں تھا کہ تالی ابا کو اپنے بیٹے کی زندگی عزیز نہیں تھی، تب ہی وہ یوں لا تعلقی برت رہے تھے۔ بس ان کا سمجھانے کا انداز بڑا بد آگاہ تھا۔ نہ بحث، نہ مٹیں، نہ کسی قسم کی کوئی تاویل، سیدھی سلنگ، دو ٹوک بات، جو سیدھی ان کی اولادوں کے بیچے میں داخل ہو کر اپنا آپ منوا کر ہی دم لیتی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ سنی کے مزاحمت کے سارے ارادے ریت کی دیوار ثابت ہوتے چلے گئے اور اس نے سابقہ تمام ارادوں کی طرح اس ارادے پر بھی فاتحہ پڑھالی۔

اوڈیڈی کول کول کول
میرا بیٹا فول فول فول
او بڑے دل شہزادے کم عمر کی دوسن لاؤں گا
شادی ہے بریلوی یہ نعرے میں لگوادوں گا
باپ ہوں منڈے تیرا، تجھے گھوڑی پہ چڑھاؤں گا
نہیں چڑھوں گا گھوڑی میں سولی پہ چڑھ جاؤں گا
نویں کیبل پر چلنے والے شاہ رخ کے اس گانے سے اپنے گھر کی صورت حال کے حساب سے لطف لے رہی تھی اور مسکراہٹ دبائے گا ہے بگا ہے بھائی اور باپ پر نظر ڈال رہی تھی۔ سنی نے بھی دزدیدہ نظروں سے باپ کو دیکھا۔ تالی ابا نے جڑبڑ ہو کر اخبار ایک جانب بٹھا اور بلند آواز میں دہاڑے۔

"بند کرونی وی، ہر وقت گانے غلامیں۔ نماز، روزہ تو ہوتا نہیں تم لوگوں سے، نی وی چوبیس گھنٹے دکھالو، تانہ جار کہیں گے۔" تالی ابا تن فون کرتے تباہر نکل گئے۔

نویں نے برا سامنہ بنا کر نی وی بند کر دیا اور سنی کے نزدیک آکر بیٹھ گئی۔ "بھائی! اچھوڑ دو نا بے جا ضد، دیکھو نا گھر کا ماحول کیسا کشیدہ رہنے لگا ہے۔ ہماری فقط چار ماہ پرانی بھابھی، بھی کتنی ہراساں ہو رہی ہیں، اس تمام صورت حال سے۔ کتنے ارمان تھے میرے کہ اپنے آخری بھائی کی شادی پر اتنا ہنگامہ کروں گی کہ وہ لمحے ہمیشہ کے لیے امر ہو جائیں گے۔ مگر یہاں تو دو لہا ہی ساری دنیا سے ناراض بیٹھا ہے۔ شادی میں کیا خاک انجوائے منٹ ہوگی۔"

"تمہیں انجوائے منٹ کی پڑی ہے؟ اور یہاں میری پوری زندگی برباد ہونے جا رہی ہے۔ واہ اچھی بسن ہو تم۔" اس نے خفگی سے بسن کو دیکھا۔

"ارے خدا! درخواست کیوں برباد ہونے جا رہی ہے آپ کی زندگی؟ ایسی بھی کیا برائی ہے ماہ رخ میں؟ جانے کیوں آپ دونوں نے بیرپال رکھا ہے ایک دوسرے سے، کوئی وجہ بھی تو ہو نا پسندیدگی کی، ایویں بچوں کی طرح لڑتے رہتے ہیں۔ اچھا ایک بات بتائیں۔" نویں نے سنی کے ہاتھ تھام کر کہا۔

"کیا بتاؤں؟" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

”اپنے تمام جھگڑے لڑائیاں سب ایک طرف رکھ دیں اور پوری دیانت داری سے جواب دیں کہ کیا خاخی ہے ماہ رخ میں۔ پُرکشش نہیں ہے گھریلو معاملات میں طاق نہیں ہے۔ سب کا خیال تنہی سے نہیں کرتی یا باکردار نہیں ہے۔“ نوین نے بھائی کے چہرے کو ٹٹولا۔

”باکردار نہیں؟“ سنی نے اس کی آخری بات پر چونک کر کہا۔ ”تم نے یہ بات منہ سے نکالی بھی کیسے؟ اس کا کردار تو کھلی کتاب ہے۔ بالکل شفاف چشمے کے پانی کی مانند۔“ سنی نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر؟“ نوین نے ابرو اچکا کر کہا۔

”بھئی وہ میری عزت نہیں کرتی نا۔ دیکھا نہیں تم نے؟ وہ کس طرح مخاطب ہوتی ہے مجھ سے۔“ وہ واپس اپنی جون میں لوٹ آیا۔

”چھا! اور آپ کیسے مخاطب ہوتے ہیں اس سے؟“ کبھی غور کیا آپ نے اپنے رویے پر؟ آپ اس سے پیار محبت سے بات کریں تو وہ کیوں خوشخوار ملی کی مانند پیچھے جھاڑ کر آپ کے پیچھے پڑے۔ تلی دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے۔ گیو اینڈ ٹیک، دنیا کچھ لو کچھ دو کے اصولوں پر ہی چلتی ہے۔ جیسا رویہ آپ کسی سے روا رکھیں گے ریٹرن بھی آپ کو یقیناً ”ویسائی ملے گا۔“ نوین نے تھوڑا توقف کیا اور پھر گویا ہوئی۔ ”تو پھر میرے پیارے بھائی! یہ فضول کی ضد چھوڑیں۔ اس سے آپ لباچی کو کیا خاک پریشاں کریں گے۔ الٹا لباچی آپ کا ہر وار ناکام بنا رہے ہیں۔ اب یہ ہی دیکھ لیں آپ نے ایڑی چولی کا زور لگا لیا کہ یہ شادی نہ ہو اور انہوں نے بجائے آپ کی بات پر کان دھرنے کے سال بھر بعد ملے ہونے والی شادی کو دو ماہ کی قلیل مدت میں ملے کر دیا ہے۔“ اس نے شرارت بھری ہنسی کے ساتھ سنی کے بال بگاڑ دیے اور سنی کو سوچ کی ایک نئی راہ دکھا کر امی کی پکار پر نیچے چلی گئی۔

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ جوں ہی دروازہ کھول کر جگہ عروسی کے اندر داخل ہونا چاہا۔ کرسٹل کا نازک سا شوپیس اس کے قدموں میں آکر جام شادی

نوش فرما گیا۔ وہ چونک کر اس انوکھے استقبال کی وجہ دریافت کرنے ہی لگا تھا اور سوچ کے گھوڑے بہ مشکل دو قدم ہی چلے ہوں گے کہ دودھ سے بھرا گلاس کے سر پر اینڈیل دیا گیا۔

دودھو نماؤ، تو تو پھلو کا مقولہ تو اس نے بارہا سن رکھا تھا۔ مگر آج اس کی عملی تفسیر بھی دیکھ لی۔ سنی نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر دروازے سے باہر دیکھا کہ اس کی اس عزت افزائی کو کوئی انجوائے تو نہیں کر رہا، مگر وہاں مکمل سکوت دیکھ کر اس کے منہ سے ایک طمانیت بھری سانس خارج ہوئی اور پھر جلدی سے دروازہ بند کر کے اس بھری شیرینی کو دیکھا جواب ہاتھ میں تھامی مٹھائی کی پلیٹ کو گندے اینڈے اور نمائز سمجھ کر اس پر پھینکنے کی تیاری کر رہی تھی۔ مگر سنی کی بروقت پھرتی نے دلہن بنی مہمان کی اس کارروائی کو ناکام بنا دیا۔

”یہ کیا پاگل پن ہے مہمان؟“ سنی آواز میں ذرا رعب و دبدبہ پیدا کرتے ہوئے دھاڑا۔

”پاگل پن تم نے ابھی دیکھا کہاں ہے میرا۔ ذرا روکو تو۔“ اس نے چیل کی طرح جھپٹ کر اس کی بھیگی شیر دانی کے گریبان پر حملہ کیا۔

سنی کو واقعتاً ”اب تب چڑھنے لگی تھیں۔ اس نے مہمان کے دونوں ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لے کر اس کی خوشخوار آنکھوں میں جھانکا۔

”دلغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ بالکل جاہل، اجڈ لگ رہی ہو اس طرح بیہوش کرتے ہوئے۔ سیدھی ہو جاؤ ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا میں۔“ سنی کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

”اس سے زیادہ کیا برا کرو گے تم میرے ساتھ؟ تم نے کہا تھا کہ مرتے دم تک اس شادی کو ہونے سے روکو گے۔ میں مطمئن ہو گئی کہ چلو اب مجھے زیادہ ہاتھ پیر نہیں مارنے پڑیں گے۔ معاملہ تم خود ہی سنہل لو گے۔ میں آخر تک اسی دھوکے میں رہی کہ تم کوئی نہ کوئی تدبیر لڑالو گے۔ مگر نہیں۔ تم تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔ تم نے سوچا ہو گا کہ شادی کر کے تم مجھے اپنا محکوم بنا لو گے۔ مجھے زیر کر کے سارے حساب چکا

کرو گے۔“ بولتے بولتے اس کا تنفس بے حال ہو گیا۔ سنی سینے پر ہاتھ باندھے بناٹو کے آرام سے اس کی گفتگو سنتا رہا۔

”بولو نا! رک کیوں گئیں؟ میں بھی تو دیکھوں تمہاری قیاس آرائیاں اور کس حد تک جاسکتی ہیں اور کون سے پرانے حساب ہیں تمہاری طرفہ جو میں چکتا کروں گا۔“ اس نے ایک نظر مہمان کو دیکھا جو دلہن بنی قیامت ڈھا رہی تھی اور اضطرابی حالت میں نظریں دیوار پر جمائے پچلا ہونٹ بری طرح کچل رہی تھی۔

”میں نہیں جانتا تھا کہ مذاق ہی مذاق میں کی گئی وہ چھوٹی مولی سی نوک جھونک، تمہیں اتنا متغیر کر دیں گی مجھ سے کہ اتنا شدید رد عمل سامنے آئے گا تمہارا“ ٹھیک ہے ان معمولی باتوں پر ہونے والی جھڑپوں کے باعث میں خود بھی برکشتہ تھا اس رشتے سے، مگر ٹھنڈے دماغ سے سوچنے پر مجھے اپنے برہوں کے اس فیصلے سے انحراف کی کوئی ٹھوس وجہ نہ مل سکی۔ سوا اپنی پوری مرضی اور آمادگی کے ساتھ میں نے تمہیں اپنی زندگی میں شامل کیا ہے۔“ سنی نے اپنی باتوں کا رد عمل اس کے صبح چہرے پر تلاشنا چاہا جواب سیاٹ سے تاثرات لیے اپنے حتمی ہاتھوں میں بھری چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ سنی کی وضاحت نے مہمان کے دل میں بھڑکتے الاؤ پرانی کے چھینٹوں کا سا کام کیا تھا۔

”کچھ کہو گی نہیں۔“ سنی نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم سے شادی سے انکار کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔“ آخر کار اس نے لب کشائی کی تو بقدرے پر سکون تھی۔

”پھر کیا وجہ تھی۔“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”نہی ایک وجہ بس، میں نے خود سے ایک عہد کیا تھا اور میں اس عہد کی پاسداری نہیں کر سکی، جس کا ملال مجھے عمر بھر رہے گا۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”کیسا عہد؟“ اس کی مبہم سی بات پر سنی نے الجھتے ہوئے اسے دیکھا۔

”اماں کی ڈانچسٹ والی رائٹرز کا فارمولا نفرت جمع“

لڑائی، انجام کار محبت کو ناکام بنانے کا۔“ مہمان اسی سلاہ ٹون میں بولی۔

سنی کی رتی بھر بھی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور جب اس نے ساری بات سمجھائی تو سنی چند ٹانہ سے تک تو اس کی شکل فکر ٹکڑ دیکھے گیا اور پھر جو — قہقہہ لگا کر لوٹ پوٹ ہوا تو پھر اس کے لیے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔ مہمان اس کے یوں مضحکہ اڑانے پر کھول کر رہ گئی۔

”تم اتنی سی بات پر زندگی کا فیصلہ کرنے چلی تھیں، اتنی ٹان سیریس ہو تم۔ حد ہو گئی بھئی۔“ سنی نے تاسف سے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔

”میری جگہ تم ہوتے نا اور تمہاری اماں دن رات میں تمہیں ستر مرتبہ یہ ہی بات باور کروا تیں تو پھر میں تم سے پوچھتی کہ تمہیں بھی اس نام نہاد فارمولے سے چڑھتی یا نہیں۔“ مہمان نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”نام نہاد؟ ابھی بھی تم نام نہاد ہی کہہ رہی ہو۔ جبکہ یہ کلیہ ہم پر کلی طور پر لاگو ہو چکا ہے اور ایک اور بات۔“ سنی نے بیڈ پر گھنٹیوں کے بل نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ جو رائٹرز ہوتے ہیں نا یہ ہمارے ارد گرد رونما ہونے والے حادثات و واقعات کا مشاہدہ کر کے ہی اپنی تحریریں وجود میں لاتے ہیں اس کی زندہ مثال میری اور تمہاری صورت سامنے ہے۔ میں نے لاکھ سرچنا، تم نے ہزار تاویلیں گھڑیں، مگر وہ لڑنے والوں کو ایک ہونا تھا، سو ہو کر رہے۔ کیونکہ اکثریت کا غالب گمان یہ ہی ہے کہ لڑائی جھگڑے دراصل محبت کی سیڑھی پر پہلا قدم ہے، جوں جوں یہ قدم اوپر کی جانب سفر طے کرتے لگتے ہیں۔ تمام فاصلہ بتدریج پانتے ہوئے آخری سیڑھی پر کھڑی محبت سے جاتے ہیں۔ تو ثابت ہوا کہ لڑائی دراصل محبت کی ایک شکل ہے۔ مگر شادی سے پہلے والی ہاں۔“ سنی نے بات کے آخری حصے تک پہنچ کر شادی کی انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کرتے ہوئے دیکھا۔

”واہ! تجزیہ تو تم ایسے کر رہے ہو جیسے بہت پڑھ رکھا

Beautify your skin, naturally

English

Neem

Soap Bar

100% Natural
actives

الصنابون بار



facebook.com/sinn

”دیکھو سنی! تمہارے پوں نزدیک آنے سے تمہارے اندر سے اٹھتی ”مسموم کن خوشبو“ مجھے دیوانہ بنا رہی ہے۔ لہذا تم جتنی جلدی ہو سکتے اس ”دل فریب ممک“ کو خود سے دور کر لو ورنہ میں ہوش و خرد سے بے گانہ ہو جاؤں گی۔“ مامی نے چکرانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اسے برے دھکیلا۔

اس نے؟ ”یہ ڈانٹلا گزرتو سرا سر دو لہا یعنی کہ میرے ہونے چاہئیں۔ یہ مامی کی بچی اتنی بے شری سے کیوں بول رہی ہے سنی نے سر جھباتے ہوئے سوچا پر جب نگاہ مامی پر پڑی تو اس کے چہرے کے تاثرات اس کے مکالموں کے برعکس دکھائی دیے، بے انتہا ناگواریت کا تاثر لیے ہوئے۔ تب اس نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا۔ ”اوہ“ وہ اب سمجھا۔ دودھ میں بھیگ جانے سے اس کے کپڑوں سے ناگواری سی بواٹھ رہی تھی۔ مامی کا اشارہ اسی جانب تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”بہت ہی عجیب ہو تم یار! سیدھی بات بھی الٹے پیرائے میں کرتی ہو۔“

”چھا مسٹر ثناء اللہ! اب آپ اپنا حلیہ درست فرمائیں گے یا نہیں۔“ مامی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کے سراپے کی جانب اشارہ کیا۔

”اوکے مسز ثناء اللہ!“ کدورتوں کے بدل کیا چھٹے اسے اپنا نام بھی معتبر لگنے لگا۔

”یار اچھے بھلے رومائس کے بیچ یہ فضول کا بریک آگیا۔“ کمرے سے ملحقہ واش روم کی جانب بڑھتا سنی پلٹ کر اس کی جانب آیا تو مامی نے اسے کندھوں سے نچڑ کر اس کا رخ دوبارہ واش روم کی جانب کیا اور پوری قوت سے آگے دھکیل دیا۔ وہ مسکراتا، اپنے ہاتھ چہرے پر پھیرتا، دھمکتا ہوا واش روم میں گھس گیا۔

ایک طمانیت بھر اسانس خارج کر کے وہ آرام سے بند پر بیٹھ گئی۔ ”مامی ڈیر لہاں جان! آپ اور آپ کی ڈائجسٹ والی رائٹرز کا بیان کروہ کلیہ کامیاب ٹھہرا۔“ وہ چشم تصور میں امل کو مخاطب کر کے بولی اور نظریں سامنے کھلی کھڑکی سے جھانکتے چاند پر نکا دیں۔ جس کی چاندنی میں وہ پور پور نہا رہی تھی۔

ہے تم نے ان رائٹرز کو۔“ مامی نے وہی پرانا انداز اپناتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو پڑھ رکھا ہے تب ہی اتنے وثوق سے کہہ بھی رہا ہوں۔ ابن انشاء، سعادت حسن منٹو وغیرہ میرے پسندیدہ ترین مصنف ہیں مگر تم کیا جانو۔ تم تو کورس کی کتاب ہی سال میں ایک بار امتحان کے دنوں میں کھول کر دیکھتی تھیں۔ تمہیں ادبی شخصیات کے بارے میں کہاں کوئی علم ہوگا۔“ سنی نے استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

وہ دونوں نامحسوس طریقے سے پھر پٹری سے اتر گئے۔ سنی جس نے نکاح سے پہلے تک ہزار بار عہد کیا تھا کہ اب وہ اس کو ہرگز تنگ نہیں کرے گا ایک دن بھی اپنی بات پر قائم نہ رہ سکا۔

”دو کتابیں کیا پڑھ لیں زیادہ ہی اکثر دکھا رہے ہو حالانکہ اکڑنے کی ضرورت نہیں ہے وہ تو تم پہلے ہی اکڑ رہے ہو شیروانی سمیت دودھ میں نہا کر ہالہا۔“ مامی نے اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پہ مارا اور اپنی ہی بات کا مزہ لیا۔

”زیادہ دانت نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شرم آتی چاہیے تمہیں اپنے مجازی خدا کے ساتھ ایسی گھٹیا حرکت کرتے ہوئے۔ بہت ہی جہالت کا ثبوت دیا ہے تم نے۔“ سنی نے دودھ میں اکڑی شیروانی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ جاہل کس کو کہا تم نے؟ مائنڈ بورلہنگوٹج مسٹر ثناء اللہ!“ مامی نے پھر اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا۔

”سنی مائی نیم از سنی۔“ سنی نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

”میں تو ثناء اللہ ہی کہوں گی، بلکہ۔ رانا ثناء اللہ ٹھیک رہے گا۔“ مامی نے چٹکی بجا کر کہا۔

”تم۔“ سنی غصے سے اس کی جانب لپکا تو وہ نیچے منہ کر کے اپنی ہنسی ضبط کرنے لگی۔ مامی کی اس شرارت بھری مسکان کا بھید جان کر وہ قدرے ڈھیلا پڑ گیا اور اس کے چوڑیوں سے سجے خوب صورت ہاتھوں کو تھام کر اس کے نزدیک آگیا۔

سکوی سیف الشریط

سہری سہری

دعا کی والدہ کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں، ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کہنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔ ریاض احمد کے دو بیٹے غیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ عمیر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے، جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جب کہ عمر ایک بگڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔ الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد ہتھیانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایکسٹرنٹ میں معذور ہوتا ہے اور اس کی بیوی مرجانی ہے، وہ وحشی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

مکمل ناول



انعم اور احسن ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن ٹائیسٹ کرواتا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے، احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر ملام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازٹیو آتی ہیں، وہ بالکل وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا زورس بڑیک ڈاؤن جاتا ہے۔ مگر اس میں ہوتی ہے۔

الیاس احمد بنیادی طور پر لاپچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا کھڑا رہتا ہے۔ اپنے بچے عمیر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکاتا ہے۔

عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بہن بھائی دعا کو اس کی ماں کے غم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بہن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھائی، وہ اسے ہر وقت ذلیل کرتا رہتا ہے۔

دعا کو دیکھ کر الیاس احمد کا لاپچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔ الیاس احمد، عمر کے کہنے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتے ہیں، جسے ریاض احمد سختی سے رد کر دیتے ہیں۔ عمران سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔

تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر ہمیشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بناتا ہے اور عمر کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ عمر کا رویہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہو جاتا ہے۔ رابعہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، کیوں کہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمر اور دعا کی شادی ہوگئی تو باپ، مٹے کے درمیان فاصلے کم ہو جائیں گے۔

ریاض احمد، عمر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں، مگر رابعہ، دعا کا عمر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کا تعلق سب کی نظر میں آ جاتا ہے۔ ریاض احمد کو کھیل سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ وہ عمر کو اسلام آباد راج کا چارج دے دیتے ہیں۔

عمیر کو دعا کا شادی سے انکار اور عمر سے تعلق کا رویہ الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ دعا بھی ممانی کی نیت کا فتور سمجھ جاتی ہے، مگر کم ہمتی اور کوئی اور ٹھکانہ ہونے کے سبب خاموش رہتی ہے۔

منصوبے کے مطابق الیاس احمد بیمار ہو کر ریاض احمد کے گھر جاتے ہیں، جہاں دعا، عمر کے کمرے سے برآمد ہوتی ہے۔ عمر گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ رابعہ کو اس سارے ڈرامے کے باوجود دعا کی پاک دامنی پر یقین ہوتا ہے، وہ عمر کو ڈانٹتی ہیں۔ ریاض احمد صدمے سے بیمار ہو کر اسپتال پہنچ جاتے ہیں اور دعا کو الیاس احمد اپنے گھر لے آتے ہیں، جہاں مریم اسے خوب لعن طعن کرتی ہے۔ دعا اپنی پاک دامنی ثابت نہیں کر پاتی، اس کے باوجود عمیر کا دل اسے قصور وار نہیں مانتا۔ الیاس احمد، مریم کے معذور بھائی کے لیے دعا کا نام پیش کرتے ہیں۔

الیاس احمد اپنی لچھے دار باتوں سے مریم اور رابعہ احمد کو دعا کی آصف سے شادی پر راضی کر لیتے ہیں۔ ریاض احمد اور

نوال کے کہنے پر عمیر، دعا کو اس کی شادی سے ایک روز قبل الیاس کے چنگل سے چھڑا لیتا ہے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اس کے سوتیلے بھائی کے دروازے پر چھوڑ آتا ہے۔

اس کا سوتیلہ بھائی ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ دعا گھر فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمر نے عمیر کو فونی مار دی ہے۔ نوکسانی اسے کہیں اور جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ بہت بری حالت میں دعا اپنی دوست انعم کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اسے اپنے حالات بتاتی ہے۔

دعا کے متعلق رابعہ کے اصل خیالات اور عمر کے کروت جان کر ریاض احمد ان سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ آصف خودکشی کر لیتا ہے۔

انعم، دعا کو اپنے گھر میں پناہ دے دیتی ہے۔ انعم کی ساس کینڈا اسے ملنے آتی ہیں۔ انہیں بات پسند نہیں آتی۔ وہ انعم

اور دعا کا موازنہ کرتی ہیں۔ یہ بات دعا کو الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ وہ انعم کو اس کی بے اولادی کا احساس دلاتی ہیں۔ عمیر کا تھانہ حملے میں بچ جاتا ہے۔ ریاض احمد، عمیر اور نوال کی بے رحمی، رابعہ احمد کو اپنی غلطیاں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عمر نشے کی حالت میں ماں سے بھی بدتمیزی کرتا ہے اور الیاس احمد سے بھی پیسوں کا تقاضا کرتا ہے اور سارا بچ مریم کے سامنے اگل دیتا ہے۔ دونوں کا جھگڑا ہو جاتا ہے اور عمر، الیاس احمد پر فائر کھول دیتا ہے۔ عمیر، الیاس احمد کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مریم، عمیر کو عمر اور الیاس احمد کے گٹھ جوڑ اور سازش کا بتاتی ہے۔ عمر کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ تھانے میں اس پر تشدد ہوتا ہے۔ عمیر اور ریاض احمد تھانے جاتے ہیں جہاں سے رہائی پانے کی خاطر عمر انہیں بچ بچتا دیتا ہے۔

تبریز احمد، مریم کو اس کے جیسے کی جائیداد دے کر بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ مریم کو ان کی بے رحمی بہت کھلتی ہے۔ وہ الیاس احمد سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ الیاس احمد اپنی جگہ شرمندہ ہوتا ہے۔

احسن اپنی ماں اور بیوی کو ہر ممکن روکنے کی کوشش کرتا ہے، مگر ناکام رہتا ہے۔ اس کی دعا سے شادی ہو جاتی ہے۔ وہ دعا کو اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے، دعا اس نئے رشتے سے خوش ہے۔ جب کہ انعم متضاد کیفیات کا شکار ہے۔

رابعہ احمد کو عمر بہت یاد آتا ہے۔ وہ عمیر سے معافی مانگتی ہیں۔ عمیر نہ چاہتے ہوئے بھی ماں کی ہر خطا کو معاف کر دیتا ہے۔

الیاس احمد کی کوششوں سے عمر رہا ہو کر گھر آ جاتا ہے۔ اس کی ندامت پر سب اسے معاف کر دیتے ہیں۔ الیاس احمد اپنے اور مریم کے درمیان جاری سرد جنگ کو ختم کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

انعم، دعا اور احسن کو کھلنے کھلنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور ذرا سی بات کا افسانہ بنا کر احسن کے ہاتھوں دعا کو ذلیل کر دیتی ہے۔ انعم، دل آرا کو بھی دعا سے بات کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ دل آرا، احسن کو معاملہ بھی سے کام لینے کا مشورہ دیتی ہیں۔ اپنی بے عزتی پر دعا کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔

کیا وہیں قسط

انعم دن میں کئی بار احسن کو کال کیا کرتی۔ کبھی بلاوجہ، جب بور ہو رہی ہوتی یا پھر اسے احسن کی یاد ستانے لگتی تب اسے کال کرتا، اس کی روٹین کا حصہ بن چکا تھا۔ اس وقت وہ بیٹھی اس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ یوں بھی وہ جس تکلیف میں مبتلا تھی۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت اس سے شیر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا نمبر معروف جا رہا تھا۔ ایسا بھی کبھار ہو جاتا تھا۔

”وہ دعا سے بات کر رہا ہوگا۔“ اس نے خود سے فرض کر لیا۔ اس کے دل میں شک سر اٹھانے لگا۔ اس کا دھیان دعا سے احسن تک میں اٹک گیا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی خوش تھی اسے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اگر احسن اتنا خوش اور اتنا دلا نہ ہوتا تو وہ بھی اس خوشی کو ضرور تسلیم کر لیتی۔ اسے

لگتا کہ دعا بہت جلد کوئی ڈھونگ رچائے گی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد پھر سے نمبر ڈائل کیا، اب کے تیسری بیل پر کال ریسپونڈ کر لی گئی۔ ”السلام علیکم؟“ احسن کی بٹاش آواز اسے سنائی دی۔

”کس کے ساتھ بڑی تھے؟“ خاصی سنجیدگی سے پوچھا گیا۔ ”کچھ کاروباری معاملات تھے۔ تم سناؤ، فون کیا ہے کوئی خاص بات؟“ وہ اس کے لہجے کی جھنجھٹ کو نوٹ نہ کر پایا۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں احسن۔“ یہ جملہ اس نے زندگی میں پہلی بار بولا تھا۔ وہ حق و دق رہ گیا۔ ”نہیں میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ وہ ٹھنکا۔ پچھلے دنوں انعم کا رویہ اتنا اچھا تھا اور

پھر اتنی بڑی خوشی، وہ اس کی پڑمردگی اور اداسی نوٹ ہی نہ کر پایا۔
 ”تمہیں بس یونہی۔“ وہ جلد ہی سنبھل گئی۔
 ”کیا کر رہی ہو؟“ وہ بھی بات کا بھٹکنا نہیں بنانا چاہتا تھا۔

”اپنے بیڈروم میں لیٹی ہوں۔ کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔“
 اس کے روم روم میں تھکن اتری ہوئی تھی۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔
 ”تم یہاں اکیلی ہو، ادھر دعا اکیلی ہوگی، تم اس کے پاس چلی جاؤ، گپ شپ کرو، اس کا دل بہلے گا، تمہاری بھی بوریت دور ہوگی، اگر خدا نخواستہ اس کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تو..... تمہیں خبر بھی نہیں ہوگی۔“

اس کا حلقہ لہجہ بہت سی فکریں لیے ہوئے تھا۔
 ”بہت ٹینشن ہو رہی ہے تمہیں اس کی۔“ انم کو اچھا نہیں لگتا تھا۔
 ”ٹینشن تمہیں بھی ہونی چاہیے، اتنے عرصے بعد ہمارے گھر خوشی آئی ہے، ہمیں اس خوشی کو احتیاط سے سنبھال کے رکھنا ہے۔ کسی نازک آئینے کی طرح اس کا خیال رکھو، جاؤ اسے چیک کرو، اس نے کچھ کھایا یا بھی ہے کہ نہیں، اسے جوس اور میڈیسن وغیرہ تم خود دیا کرو، تمہاری رسپونسیبلٹی ہے کہ.....“

”خدا حافظ احسن، مجھے پیاس لگی ہے۔“
 بودا سا بہانا بنا کر اس کی سنے بغیر اس نے کال منقطع کر دی۔ اس نے اپنی پریشانی ٹالنے کے لیے کال کی تھی مگر اس کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمکین پانی جمع ہونے لگا۔

☆☆☆
 ناہید دعا کے لیے چائے کے ساتھ سینڈویچ بنا کر لائی تھی۔ اس نے صبح بھی احسن کے بے حد اصرار پر صرف جوس لیا تھا۔
 ”بی بی جی..... انھیں تھوڑا سا کھالیں۔“ ناہید

ٹرے درمیانی میز پر رکھ کے پردے ہٹانے لگی۔
 ”ناہید آ پاپلیز پردے مت ہٹائیں۔ تیز روشنی سے میرا سر اور آنکھیں دکھتی ہیں۔“ دعا نے احتجاج کیا۔

”کچھ نہیں ہوتا بی بی! آپ نے تو یونہی دل چھوڑ دیا ہے۔ تھوڑی ہمت سے کام لیں، انھیں منہ ہاتھ دھوئیں، کچھ کھائیں، عین دل کو کسی کام میں لگائیں گی تو لگے گا۔“ ناہید نے اسے نرمی سے سمجھایا۔
 ”میرا سر بہت بھاری ہو رہا ہے۔“ اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے سر کو ہاتھوں سے تھام لیا۔
 ”ہو جاتا ہے ایسا بھی بی بی جی! آپ چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لے لیں، چلیں انھیں۔“
 وہ جو پھر لیٹ چکی تھی۔ ناہید نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے اٹھنے میں مدد دی۔

”میں واش روم خود ہی چلی جاتی ہوں، آپ پلیز، یہ پردے برابر کر دیں اور میرے لیے چائے بنائیں۔“

اس نے سستی سے چپل پیروں میں اڑتے ہوئے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ تیز روشنی اس کی آنکھوں میں مٹی جا رہی تھی۔
 ”جی وہ میں کر دیتی ہوں، لیکن میں آپ کو خالی چائے نہیں پینے دوں گی، ساتھ میں سینڈویچ بھی لازمی کھانے پڑیں گے۔“ پردے برابر کرنی ناہید نے واش روم کی طرف دیکھ کر کہا۔ دعا اتنی تکلیف میں بھی اس کی محبت پر مسکرا دی۔

☆☆☆
 احسن آفس سے پورے وقت پر اٹھ آتا پھر آدھا گھنٹہ ٹیبل، وہ خالی ہاتھ کبھی نہیں آتا تھا، فروس، جوسز کے ڈبے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔

انم کافی خاموش سی ہو گئی تھی وہ دل آرا سے پہلے کی طرح شکایت نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی دعا اور احسن کے ساتھ جھگڑا۔ اس لیے چپ سادہ لی گئی تھی۔ لیکن یہ چپ یقیناً کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ

تھی۔
 ”انم..... دعا..... دعا.....“
 اندر داخل ہوتے ہی اس نے حسب معمول آواز لگائی۔ مگر اب اس پکار میں ”دعا“ نام کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جو انم کے بول پر چھٹی کی طرح لگتا تھا۔
 ”جی.....“ انم کی دعا کمرے سے نکلی۔
 ”کیسی ہو؟“ انم دروازہ کھول کے، بیچ چوکھٹ

میں کھڑی ہو گئی۔
 ”ٹھیک ہوں، آپ سنائیں۔“ دعا نقاہت کے باوجود مسکرا رہی تھی۔
 ”یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“ اس کی آواز پر جوش تھی۔ اس کے ہاتھ میں بلیک ویلوٹ کیس تھا۔

”کیا ہے؟“
 ”میکس.....!“
 احسن نے میکس کیس سے نکالا۔
 ”میرے لیے.....“ دعا حیرت زدہ رہ گئی۔
 انم کی جان لیوں تک آ گئی۔ اس نے اپنے کرتے وجود کو سنبھالنے کے لیے چوکھٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”ہاں تمہارے لیے لایا ہوں کئی دنوں سے مارکیٹ جانے کا سوچ رہا تھا۔“ اس نے میکس اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”بہت..... بہت خوب صورت ہے۔“
 اس کا چہرہ خوشی سے گلزار ہو گیا۔ وہ پہلی بار اس کے لیے کچھ لایا تھا۔

”دو میں پہنا دوں۔“ اس نے میکس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔
 انم کی آنکھیں ساکت اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہانچے تھے۔ کاش وہ یہ منظر دیکھنے سے پہلے مر جاتی۔
 ”بہت مہنگا ہے احسن۔“ دعا نے اپنے بال آگے کیے۔

”جو خوشی تم نے مجھے دی ہے، وہ بہت قیمتی اور

انمول ہے۔ میں سوچ رہا تھا پتا نہیں تمہیں پسند بھی آئے گا کہ نہیں۔“ وہ اس کے گلے میں میکس پہنانے کے سامنے سے آ کے دیکھنے لگا۔
 ”آپ پہلی دفعہ کوئی چیز لائے ہیں، مجھے بھلا پسند کیوں نہیں آئے گی۔“ اس نے لاکٹ ہاتھ میں لے لیا۔

”تھینک یو۔“ احسن نے سر کو ذرا سا خم دیا۔
 ”آپ بیٹھیں میں ناہید کو چائے کا کہتی ہوں۔“
 دعا شرمیلی سی مسکان لیوں پر سجائے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ انم نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

☆☆☆
 عمر موبائل کی میموری چیک کرتا سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ رابعہ اور ریاض احمد لاؤنج میں بیٹھے تھے۔
 ”عمر بیٹا! ذرا اوپر سے عمر کو تو بلا کے لے آؤ۔“
 وہ شوہر کا دائیں بازو دبار ہی تھیں۔
 ”وہ آفس ورک کر رہا ہے، اسے تھوڑی دیر لگ جائے گی اگر کوئی ضروری کام ہے تو مجھے بتادیں۔“
 وہ موبائل جیب میں ڈال کے ان کے قریب آ گیا۔

”تمہارے پاپا جان کی میڈیسن ختم ہو گئی ہیں، وہ منگوانی تھیں۔“ انہوں نے نسخہ ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اس نے باپ کو بغور دیکھتے نسخہ پکڑ لیا ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار واضح تھے۔

”پاپا جان! زیادہ پین تو نہیں ہو رہا۔“ ریاض احمد نے جواب دینے کے بجائے رخ پھیر لیا۔

”انہیں تو درد کی پروا نہیں لیکن میرا دل ڈر رہا ہے کہ کہیں کوئی نقصان نہ ہو جائے۔“

رابعہ احمد جلدی سے بول پڑیں تاکہ عمر کا دل برا نہ ہو۔

”میری زندگی کا سب سے بڑا نقصان تو ہو چکا اب مجھے کسی نقصان کا خوف نہیں رہا۔“
 ریاض احمد کے لہجے میں جی ٹھنک گئی۔ عمر کا سر

جھک گیا، راجہ احمد شوہر کو دیکھتی رہ گئیں۔

”اچھا آپ یہ مجھے دیں، میں میڈیسن لادیتا ہوں۔“ وہ ماں کے ہاتھ سے نسخہ پکڑ باہر کی طرف بڑھ گیا۔

”چلیں میں آپ کو بیڈ روم میں لے جاؤں۔“ انہوں نے دائیں بازو سے تھام کے شوہر کو اٹھایا۔

ان کا خیال تھا کہ اگر عمر سید حارثہ پکڑ چکا ہے۔ تو ہمیں اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، تاکہ اس کی ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو دہرایا جاتا رہے لیکن وہ یہ سب ریاض احمد کو سمجھانے کی جرات نہیں کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

”کیا آج کوئی بات ہوئی ہے؟“ احسن نے دعا سے استفسار کیا۔

وہ شام کو بھی انہم کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ منہ پر تکیہ رکھے گہری نیند سو رہی تھی وہ چونکا۔ یہ وقت اس کی واپسی کا تھا اور انہم اس وقت بھی نہیں آرام کرتی تھی۔

”احسن صاحب! وہ کہہ رہی ہیں کہ انہیں بھوک نہیں، وہ نہیں آئیں گی۔“ ناہید نے پیغام پہنچا دیا۔ اس کے اثبات میں سر ہلانے پر ناہید چل دی۔

”تم کھانا شروع کرو۔“ اس نے اپنی خالی پلیٹ پیچھے کر دی۔

”آپ نہیں کھائیں گے۔“ دعا کا دل بچھ گیا۔

”نہیں، میں انہم کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گا، تم لوٹنا، میں اسے دیکھتا ہوں۔“ وہ اس کی پلیٹ میں سالن ڈالنے لگا۔

”پلیز احسن! میں اتنا زیادہ نہیں کھاؤں گی۔“ دعا نے اس کا ہاتھ روک دیا۔

”کھانے یہ کوئی کپڑا مائز نہیں ہوگا، کھانا تمہارے اور بچے کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔“ اس نے پلیٹ میں روٹی رکھی۔

”یہ تم نے پوری ختم کرنی ہے۔“ وہ اب پانی کا گلاس بھر رہا تھا۔ دعا نے بے دلی سے لقمہ توڑا۔ احسن کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔

انہم کا کمرہ خالی تھا اس نے واش روم کے دروازے پر زور ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ کمرے سے نکل کے پچھلے لان میں گیا۔ وہ آخری سیڑھی پر بیٹھی مل گئی۔ یہ اس کی پسند چکے تھی۔

”انہم۔“ وہ پکارتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھا گیا۔

”میں تمہیں ڈھونڈ رہا تھا، تم یہاں کیوں بیٹھ ہو؟“ وہ اس کے چہرے پر چھایا حزن و ملال دیکھ رہا تھا۔

”تم کیوں مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔“ اس پر مردگی سے پوچھا۔

”تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا، ساری شام بھی سوتی رہی ہو، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔“ اس کی حالت دیکھ کر اس کے دل پر بوجھ سا گرا۔

”میں سو نہیں رہی تھی، سوتی بن رہی تھی۔“ اس سے اپنی کیفیت چھپا نہیں پائی تھی۔ اس کا د بہت بھرا ہوا تھا۔

”کیوں؟“ اس نے پوچھا جبکہ وہ اس کا سہا جانتا تھا۔

”آپ دعا کے لیے ڈائمنڈ کا میکس لا۔“ اس نے بے اختیار بول دیا۔ یہ جلدی وہ آریا دعا کے سامنے نہیں نکال سکتی تھی۔

”ہاں، پہلی بار اس کے لیے کچھ لایا ہوں۔“ اس نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

”خوشی بھی تو پہلی بار ملی ہے ناں۔“ وہ دعا بولی۔

”کیا میں تمہارے لیے کبھی کچھ نہیں لایا۔“ اس نے تنگی سے بچنے کے لیے ہلکا پلکا انداز اختیار کیا۔

”میں.....“ وہ رکی پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”میں..... میں تو آپ کی محبت ہوں۔“ محبت پر زور دیا گیا۔

”دوست ہوں، کزن ہوں..... اور وہ۔“ وہ ٹھہر گئی۔ چہرے پر کرب چھایا تھا۔

”وہ میری بیوی تو ہے ناں۔“ وہ اس کا ذہن بنانا چاہتا تھا۔

”اب بچے کی ماں بھی.....“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”تم بھی سب سوچ کے خود کو بیمار کر لو گی، یونو ویل انو، پہلے بھی تم کتنے لمبے ٹریٹمنٹ کے بعد سنبھلی ہو، اب پھر سے الٹا سیدھا وہم کرنے لگی ہو۔“ اسے اس کی سوچ پر دکھ ہوا تھا، وہ اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں کوئی وہم نہیں پال رہی احسن! حالات کے ساتھ ساتھ، آپ بھی بدلتے جا رہے ہیں۔“ وہ اپنی سوچ سے ہٹ نہیں سکتی تھی۔

”کیا وہ میری ذمہ داری نہیں.....“ وہ زچ ہوئے بغیر بولا۔

”صرف ذمہ داری نہیں احسن! اب وہ آپ کے بچے کی ماں.....“

”اسٹاپ اٹ انو، تم..... تم مجھے اتنا چیپ سمجھتی ہو۔“ اس نے قہر سے کہا۔ وہ حتی الامکان برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”پلیز آپ خود کو برا بھلا مت کہیے۔“ انہم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ..... میری دلی کیفیت نہیں سمجھتے۔“ وہ دہینے کو تھی۔

”خود کو سنبھالو انو، بڑی ہو تو اپنا ظرف بھی وسیع کر لو، دعا کی بھی اتنی جرات نہیں ہوگی کہ وہ تمہارے سامنے اف تک بھی کر جائے۔ مگر تم خود کو تو بیلنس رکھو۔“

وہ اسے محبت سے سمجھا رہا تھا۔ دل آزاری نہ ہو جائے۔

دعا تو کسی گنتی میں ہی نہیں تھی۔ تکلیف تو تب شروع ہوتی تھی جب احسن کا جھکاؤ اس کی طرف ہوتا۔ یہ وہ محل کے اس سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس شادی کے لیے اصرار بھی تو اس نے ہی کیا تھا۔

”جائیں وہ آپ کا انتظار کر رہی ہوگی۔“ اس نے خود پر پھر سے خول چڑھ لیا۔

”میرا انتظار وہ نہیں بلکہ تم میرے آنے اور مٹانے کا انتظار کر رہی تھیں۔“ احسن نے اس کی چوری پکڑ لی۔

”جی نہیں.....“ اس نے سر جھکا کے کمزوری آواز میں انکار کیا۔

”اچھا جلدی سے اٹھو شاباش، میں بھلا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ٹاؤٹر

زرد موم راحت جنیں 1000/-

حساب دل رہنے دو نبیلہ عزیز 400/-

محبت من محرم میرا حمید 400/-

ایک تھی مثال رخسانہ نگار عدنان 500/-

یہ گلیاں یہ چوہارے فائزہ انوار 400/-

دست میما نگہت سیما 400/-

گل کھسار فرح بخاری 400/-

تمہارے بغیر کچھ کھا سکتا ہوں مجھے صحت ہوگی۔
اٹھ جاؤ، میں تمہارے لیے کھانا گرم کروں گا۔
احسن نے اسے پیار سے پکارنے پر اسے
ہاتھ سے پکڑ کر اٹھالیا۔ اس کی ناراضی دم توڑ گئی۔ وہ
آنسو طق سے نیچے اتارنے پر اسے اٹھ گیا۔

☆☆☆

عمیر نے لیپ ٹاپ پر فٹ لائن کر کے، کمری
سے پشت نکالنے آگئیں سوئے ہیں، وہ اسے
پوزیشن میں بٹھا رہا، آنکھوں کی پلکیاں جھپک رہی
تھیں۔ انگلی اور انگوٹھے سے آنکھوں کو دھو رہا ہے۔
کھولتے، وہ کافی کام پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کمری کی
سلائڈ ہٹا کے اس نے باہر دیکھا۔ لائن میں کھانا
اندھیرا تھا۔ اس کی آنکھیں زرد آنکھوں میں بہت سے
مناظر گھوم گئے۔ اس کے آگے دعا اور پشت پر لال
تھی۔ وہ دعا کو پکڑنے کی کوشش میں تھی۔ دعا ہر
پچائی ہوئی عمیر سے مدد مانگ رہی تھی۔ عمیر
نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تھے۔

اسی لائن میں وہ کمرے کی طرف گئے۔ دعا کو لپٹ
سے پیٹ بھی نہیں پکڑا آتا تھا، لال اس کا ہاتھ
لگاتی، وہ کمرے کے دروازے پر کس کے الٹا ہاتھ
جانی۔ عمیر ہاؤسنگ کر داتا، اس لائن میں لے گیا اور
سفیدے کے درخت ان دونوں لے لے لے لے لے لے لے لے
ساتار کا بوٹا بہت محبت سے پیٹا گیا تھا۔ اس نے اسے
کہاں کہاں تلاش نہیں کیا تھا۔ اپنے ایس لی دوسٹ
کی مدد سے اس نے ان جھپکوں پر کسی تلاش کیا تھا
جہاں کا نام لینا گالی تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا
کہ وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ کہیں سے بھی کوئی کھانا
سا سراغ بھی نہیں ملتا تھا۔ سب کے سامنے وہ بظاہر
مطمئن نظر آتا لیکن تنہائیوں میں اس کا دل ہوتا تھا وہ
لڑکی اس کی رگ و جاں میں سرانیت کر چکی تھی اس کو
بھلا کے وہ جی سکتا تھا۔

”میں تمہیں کہاں دھوڑوں دعا تم کہاں مل
گئی ہو، پلیز لوٹ آؤ یا مجھے پکار لو پلیز دعا۔“

اس کی آواز میں نمی کھلنے لگی۔ اس نے سر کو زور
سے لی میں جھٹکا۔

☆☆☆

احسن اس رات انعم کے پاس ہی سو رہا تھا۔ وہ
داخل میں بہت اداں تھی، رات گئے تک اس کے کندھے
پر سر رکھے اپنے خدشات شکوے گلے اور محبتیں سناتی
رہی۔ احسن کو اسے سننا اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے اپنی
ہر ہول اور بے اعتنائی جو اس نے کی ہی نہیں تھی معافی
مانگ لی۔

انعم جو کہہ رہی تھی وہ اس کے نزدیک بچکانہ
ملہ رہے اور قیاس آرائی تھی لیکن وہ خاموشی سے ہر
بات بغور سنتا رہا، وہ اس کے اندر کا غبار نکالنا چاہتا
تھا۔

تمام گلے شکوے کر کے وہ ہلکی پھلکی ہو کے سوئی
تھی۔ صبح فریش سی انعم ناشتے کی تیاری کے لیے کچن
میں پہنچی۔

احسن دعا کے کمرے میں آ گیا۔ وہ ابھی تک سو
رہی تھی۔ اس نے دعا کے پاس بیٹھ کے آہستہ سے
بازو ہلایا۔

”دعا.....“ اس کی پکار میں نرمی تھی۔
”جی.....“ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول
دیں۔

”تم جاگ رہی تھیں۔“ احسن نے اسے بیٹھنے
میں سہارا دیا۔
”نہیں ابھی آنکھ لگی تھی، ساری رات میں ٹھیک
سے سو نہیں پائی۔“ اس نے وجہ بتائی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ناں۔“ اس
نے دعا کی نقاہت زدہ آواز اور چہرے کی پیلاہٹ
سے اندازہ لگایا۔

”میرا رات بالکل کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ
رہا تھا۔ میں نے صرف آپ کی تسلی کے لیے کھالیا،
ساری رات میری طبیعت خراب رہی، پل بھر بھی میں

سو نہیں پائی۔“

وہ اپنی حالت زار بتاتے رو دی۔
انعم ناشتے کے لوازمات میز پر سجا کے کھڑی رہی
جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا وہ غصے بھر اسانس
خارج کرتی، دعا کے بڈروم کی طرف بڑھی۔ وہ احسن
کو اس طرف جاتا دیکھ چکی تھی۔

”سوری دعا، ہم نے میرے فورس کرنے پر اتنی
تکلیف برداشت کی۔“

احسن نے دعا کا سراپے کندھے سے لگا لیا۔
اس کی کمر کے گرد بازو لپیٹے اسے پھینکے لگا۔
”تم مجھے ریفرز کر دیتیں یا پھر کچھ لائٹ سا کھا
لیتیں۔ اب بھوکے پیٹ بھی.....“

تب ہی انعم نے بغیر دستک دیے دروازہ کھول
دیا۔ اندر کا منظر اس پر بجلی گرا گیا۔

احسن کے کندھے پر دعا کا سر تھا۔ ایک بازو کمر
کے گرد لپیٹا، دوسرے ہاتھ سے وہ دعا کا گال تھپکتے کچھ
کہہ رہا تھا۔ دونوں نے ایک دم اسے دیکھا۔

انعم کے چہرے پر حیرت کے بعد غصہ عود کر آیا۔
دعا گھبرا کر احسن سے دور ہوئی۔ احسن کے تاثرات
نازل تھے۔

”لیٹ جاؤ دعا.....!“ اس نے دعا کو خود پکڑ کر
لٹایا۔

”میں ناشتہ کر لوں، ناہید کو کہتا ہوں کہ تمہارے
لیے بھی کچھ لائٹ سا بنا دے، شام کو تمہاری ڈاکٹر سے
اپائنٹمنٹ بھی لیتا ہوں..... تم آرام کرو۔“

انعم اپنی جگہ پر جی کھڑی یہ چونچلے دیکھ رہی تھی۔
دعا نے پھر سے سرسری سی بھی ہوئی نگاہ غصے سے بھری
کھڑی انعم پر ڈالی۔

”ناشتہ لگا دیا ہے۔“ وہ انعم کی طرف مڑا۔
”آپ کو اس چپیتی کے نازخڑے اٹھانے سے
فرصت مل جائے تو ٹیبل تک آجائیے گا۔“ انعم طنز
کہتی باہر نکل گئی۔

وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی تھی۔ احسن ناشتہ
کرنے لگا۔ اس کے پاس انعم کو منانے کا وقت نہیں تھا۔

☆☆☆

اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ وہ مسلسل صحن
گھیریاں کھا رہی تھی۔ اس کے اندر غصے کا الاؤ دیک
رہا تھا۔ احسن کی گاڑی کا ہارن سنتے ہی وہ باہر نکل آئی
اور دعا پر دھاوا بول دیا۔

”تم مجھتی کیا ہو خود کو.....؟ کیا تم اپنی اوقات،
اس گھر میں حیثیت اور اس شادی کا مقصد بھول گئی
ہو۔“ وہ چلا رہی تھی۔

دعا جو آنکھیں موندے بڑی تھی اٹھ بیٹھی، وہ
انعم کے اس اچانک اور غیر متوقع ری ایکشن پر سہم
گئی۔

ناہید بھی شورن کے دوڑی آئی۔
”مم..... میں نے کیا کیا ہے؟“ دعا کے حلق
سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ ساری رات اس نے
تکلیف میں کائی تھی اب خود کو کافی کمزور محسوس کر رہی
تھی۔ انعم کا شور شرابا۔

”جسٹ شٹ اپ، مکار عورت، تمہاری احسن
سے شادی صرف بچے کی خاطر کی گئی تھی، تم تو اس پر
ڈورے ڈالنے لگیں اس کی محبت سے نکلنے کو دل ہی.....“
”نی ہیو یور سیلف انعم.....“ وہ اپنی ساری
توانائی جمع کر کے چیخ پڑی۔

”وہ میرا شوہر ہے۔ کوئی بوائے فرینڈ نہیں کہ
میں اس پر ڈورے ڈالوں۔“ دعا نے لمبی سانس کھینچتے
ہوئے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”تم ہمیشہ بھول جاتی ہو۔ کہ وہ تم سے پہلے میرا
شوہر اور محبوب ہے اور تم اس محبت کا صدقہ ہو، تم اس
کے بچے کی ماں بن کے، اسے اپنی طرف راغب کر لو
گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ میرا ہے اور صرف میرا
ہی رہے گا۔“

وہ ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی تھی۔ اس کا
اپنے اعصاب پر کنٹرول نہیں تھا۔ ناہید تنفر سی کبھی
غصہ کرتی انعم اور بھی زور پڑتی دعا کو دیکھتی۔

”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے انعم، میں تو صرف
بیوی ہوں، محبت تم ہو اس کی۔“ وہ اسے یقین دلانے

لیے بھی کہہ سکتی تھی۔ وہ اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتا۔
 ”تو پھر تم کیوں اس کے دماغ پر سوار رہتی ہو، سامنٹر پڑھ کے پھونکا ہے کہ اسے تمہارے علاوہ طرہ ہی نہیں آتا۔ ہر بل تمہاری فکر میں یلکان جاتا ہے۔ چھین رہی ہو تم اسے مجھ سے، تمہیں بہت مہنگا پڑے گا دعا، کیپ ان مائنڈ۔“ وہ سے باز پرس کرتی چلا رہی تھی۔
 ”انم بی بی! آپ کیوں اپنی طبیعت خراب کر رہی ہیں، چھوڑیں سب اور چلیں اپنے کمرے۔۔۔۔۔“
 ناہید اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے جانے لگی۔ طبیعت پہلے سے زیادہ بوجھل ہو گئی۔ اس نے اسرہاتھوں میں تھام لیا۔
 ☆☆☆
 رابعہ احمد، مریم کے گھر آئی تھیں۔ مریم صوفے پر بازو ٹکائے گم صم بیٹھی تھی۔ انہوں نے کے وسط میں رک کے اس کے کھوئے پن کو الیاس احمد کے ساتھ مریم کے تعلقات اسی چل رہے تھے۔ وہ الیاس احمد کے سب کام لیکن وہ محبت اور تعلق ختم ہو چکا تھا۔ اس دن سے اس نے اپنا بیڈروم بھی علیحدہ کر لیا تھا۔ وہ کے ساتھ ان کے کمرے میں سوئی تھی۔
 ”مریم۔۔۔۔۔!“ انہوں نے نزدیک آ کے اس پر ہاتھ دھرا۔ وہ بری طرح چونک گئی۔
 ”کیا ہوا مریم طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“
 نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی رنگت بدل گئی تھی۔
 ”جی بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بیٹھے۔۔۔۔۔“ اس برستی مسکرا نے کی کوشش کی۔
 ”کیا کرتی رہتی ہو دن بھر، کافی دنوں سے طرف بھی نہیں آئیں۔“ ان کا لہجہ سرسری تھا۔
 ”کبھی اس کے پاس صرف فراغت اور کپ واکر کرتی تھی۔“

”کچن کی ذمہ داری مکمل طور پر، میں نے سنبھال لی ہے۔ عروہ اور زین کے ٹیوٹر کو بھی فارغ کر دیا ہے۔ شام میں خود انہیں ٹیوشن پڑھاتی ہوں، وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔“ اس نے اپنی مصروفیت بتائی۔
 ”میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔“ مریم کہہ کر فوراً اٹھ گئی۔
 رابعہ احمد نے اسے حیرت سے جاتے دیکھا۔ کیونکہ مریم جانتی تھی کہ وہ صرف ناشتے کے بعد شام کو ہی چائے پیتی ہیں، پھر وہ کیسے بھول گئی تھی۔
 ☆☆☆
 شام کو وہ خوب بچی سنوری تھی۔ نیوی بلیو کمر کی ساڑھی میں اس کا گورا رنگ دمک رہا تھا احسن آیا تو وہ اس کے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑی تھی۔
 ”السلام علیکم!“ اس نے احسن کے ہاتھ سے بیک پکڑ لیا۔
 ”وعلیکم السلام چشم بدور، آج تو غضب ڈھارہی ہو۔۔۔۔۔ کہیں جانا ہے کیا؟“
 ”میرا دل چاہ رہا تھا، آپ کے لیے سجنے کو۔“
 اس نے ایک ادا سے کہا۔
 ”اچھا، میں سمجھا شاید آج کچھ اسپیشل ہے۔“ اس نے چھیڑا۔
 ”میں نے آپ کے کپڑے نکال دیے ہیں، آپ فریش ہو جائیں، میں چائے بناتی ہوں۔“ اس نے احسن کو کمرے کی طرف دھکیلا۔ وہ مصنوعی ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔
 ”میں پہلے دعا کو دیکھ لوں۔“ وہ شرٹ کے کف الٹا بڑا لیا تھا۔
 انم کا سارا وجود کان بن گیا۔
 ”دعا سو رہی ہے۔ آپ پہلے چائے پی لیں۔“ اس نے روانی سے جھوٹ بولا۔
 وہ آج دعا کو احسن سے دور رکھنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔
 ”چلو تم پھر چائے لگاؤ، میں فریش ہو کے آتا

ہوں۔“ وہ جلد ہی مان گیا۔ انم نے شکر کی سانس لی۔
 چائے پینے کے دوران وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔
 ”کھانے میں کیا بناؤں۔“ اس نے خالی کپ نیبل پھر ا۔
 ”کھانا تم بناؤ گی۔“ اس نے ابرو اچکائے۔
 ”جی بالکل جناب! وہ بھی آپ کی پسند کا۔“
 آج وہ کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے الگ نہیں ہو رہی تھی۔
 ”چلو تم کھانا بناؤ، میں دعا کے پاس جا رہا ہوں۔“
 وہ پھر سے جانے کے لیے اٹھ گیا۔
 ”وہ سو رہی ہو گی احسن۔“ اس نے دوبارہ الجھایا۔
 ”تو کیا ہوا؟ میں اسے جگالوں گا۔“ وہ ابھی بھی اس کی جالا کی سمجھ نہ پایا تھا۔
 ”گن احسن اینڈ پلیز ڈونٹ مائنڈ، تمہاری اس شادی اور تعلق کا مقصد صرف بچہ تھا جو حاصل ہو گیا ہے۔ اب تمہیں اس کی فکر کرنے اور بھاگ بھاگ کر اس کے پاس جانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ اس نے اپنے دل میں پلٹنا سورا پھوڑا۔
 کتنی بڑی بات اس نے بڑے عام سے لب و لہجے میں کہہ دی تھی۔
 ”صاف صاف کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔“ اس کے اعصاب تن گئے۔
 ”وہی جو آپ جان کر سمجھنا نہیں چاہتے۔ آپ کا دعا کے کمرے میں سونا، آئی مین اسے بلانا، بات چیت کرنا۔۔۔۔۔“ وہ انک انک کر کہہ پارہی تھی۔
 ”اس کا خیال رکھنا چھوڑ دیں اب۔“ وہ رک گئی۔
 ”واٹ ریش انو، تمہارا مطلب یہ ہے کہ میرا اس سے تعلق صرف بچہ تک کا تھا۔ اب میں اس سے منہ پھیر لوں، تو یہ بھی تمہاری اور ماما جان کی پلاننگ کی پٹی اینڈنگ، مجھے شرم آ رہی ہے تمہاری سوچ پر انم۔“

وہ بمشکل اپنے غصے اور حواسوں پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا ایک پھٹر لگا دے۔
 ”مجھے بھی شرم آتی ہے تمہارے وہ عہد و پیمان سوچ کر، تمہارے وہ محبت بھرے دعوے، ایک عورت کی خاطر تم سب کچھ بھول گئے ہو۔ میری محبت کھوکھلی اور بنجر ہے۔ میں ادھوری ہوں ناں۔“ وہ ہچکیاں لینے لگی تھی۔ اس کا ہتھیار صرف محبت تھا۔
 ”کچھ بھی نہیں بھولا میں، محبت بھی بھلا کوئی بھولنے والی چیز ہے، جبکہ تم مجسم موجود ہو۔“ وہ کمزور پڑ گیا۔
 اس کے آنسو بھلا برداشت کر سکتا تھا۔
 ”تمہارا اعتبار متزلزل ہو گیا ہے انو! تم اپنی اس خامی کا ذمہ دار مجھے مت ٹھہراؤ، میری دعا سے لو میرج نہیں ہے۔ یہ سب کیا دھرا تمہارا اور ماما جان کا ہے، تم ڈیکے کی چوٹ پر محبت وصولی ہو اور وہ حق مانگنے کی مستحق نہیں۔“
 اس نے نرم اور آسان الفاظ میں اسے بہت کچھ باور کروانے کی کوشش کی تھی۔ انم کا سارا زور رونے پر تھا۔ اسے صرف اپنے نقصان اور شراکت کی فکر تھی۔
 ”اب تم اسے میری برابری کرواؤ گے۔“ وہ آنکھوں کو گڑ گڑھٹائی سے بولی۔
 ”بالکل، حقوق وہ تمہارے برابر ہی لے گی، تم اچھی طرح سے جانتی ہو تکلیف میں تو میں ملی کے بچے کو نہیں دیکھ سکتا، وہ تو پھر میرے ہونے والے بچے کی ماں ہے۔“
 اس نے بنا تکلف سب صاف کہہ ڈالا۔
 زیادہ نرمی دکھا کے وہ اسے غلط فہمی میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دعا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا انم بچٹی نگاہوں سے اس کی پشت کو گھور رہی تھی۔
 ☆☆☆
 ناہید، دعا کے سر ہانے پڑے لیے کھڑی تھی۔ دعا کی شکل پر بے زاری طاری تھی۔

”لے جائیں آپا! میرا قطعاً دل نہیں چاہ رہا۔“
 س نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔
 رات بھر بھی وہ تکلیف میں رہی، انعم کی بدتمیزی نے اس کا بلڈ پریشر ہائی کر دیا تھا۔
 اندر آتے احسن کو دیکھ کر وہ سیدھی ہو گئی۔
 ”السلام علیکم!“ تاثرات نارمل رکھتے اس نے سلام میں پہل کی۔ ناہید دھیرے سے مسکرا دی۔
 سے کھانا کھلانے کا کام احسن ہی اچھے طریقے سے انجام دیتا تھا۔
 ”وعلیکم السلام، کیسی طبیعت ہے اب اس کی، کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں۔“
 اس نے دعا کے بجائے ناہید سے استفسار کیا۔
 ”صبح لائٹ سا کھایا تھا۔“ ناہید کچھ بھی خود سے پینے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ ساری دوپہر وہ روتی سی تھی۔ ناہید نے اسے بہت سے دلا سے اور تسلیاں دے دے کر چپ کروایا تھا۔
 ”کیا ہوا طبیعت کھلی نہیں۔“ اس نے دعا کے ال پر ہاتھ لگایا۔ اس کا گال سرخ اور تپ رہا تھا۔
 ”تمہیں تو نمپر پچر ہے۔“ وہ تشویش سے بولا۔
 وہ سر جھکا کر رہ گئی، اسے اپنے جذبات پر اختیار نہیں رہا تھا۔
 ”تم روتی رہی ہو دعا۔۔۔۔۔“ اس نے ٹھوڑی ہو کے چہرہ اوپر اٹھایا۔
 ”درد ہو رہا ہے یا کسی نے کچھ کہا ہے۔“ اسے گہرا۔
 ”نہیں کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔“ اس کے اندر کرب برپا تھا۔ ناہید کا دل بھی دکھ سے بھر گیا۔
 ”کہاں درد ہو رہا ہے۔“ اس کا دل اچھل پڑا۔
 مانے بتانے کے بجائے گھٹنوں میں سر دے لیا۔
 ”شاید ان کا بی بی ہائی ہے، صبح سے کوئی ٹھوس ای بھی نہیں لی، آپ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں وہ میڈیسن دے گا تو یہ کھایا پیا ہضم کرنے میں کی۔“

ناہید نے اپنے تئیں درست مشورہ دیا۔ اسے واقعی انرجی کی ضرورت تھی۔
 ”آپ یہ بڑے مجھے پکڑا دیں اور جائیں ڈاکٹر مارہ کو کال کر کے ٹائم لیں۔“ اس نے بڑے لے لی۔
 جس میں چائے کے ساتھ مکین بسکٹ، ایک اور سینڈویچ رکھے تھے۔
 ”احسن! میرا جی۔۔۔۔۔“ اس نے احتجاج کرتے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔
 ”میرے ہاتھ سے کھاؤ گی تو نہیں خراب ہوگا، جلدی بولو، کیا لوگی۔“
 اس نے ایک ہاتھ میں بسکٹ دوسرے میں ایک پکڑ رکھا تھا۔
 ”بسکٹ۔۔۔۔۔ لیکن صرف دو۔“ وہ رو دینے کو تھی۔
 ”چلو ٹھیک ہے تم یہ کھا کے، کپڑے چینج کر دو، میں تمہیں خود ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔“
 اس نے بسکٹ چائے میں ڈبو کے اس کے منہ میں ڈالا۔ دعا منہ کے مختلف زاویے بنا رہی تھی۔
 ”شاباش۔۔۔۔۔“ احسن نے مسکراتے ہوئے اسے اتنا برا منہ بنانے پر شاباش دی تھی۔
 ☆☆☆
 وہ روز رات کو بچوں اور شوہر کو دودھ کا گلاس لازماً دیتی تھیں ریاض احمد نے انہیں اندر آتے دیکھا تو ناک شوبند کر دیا۔
 ”یہ لیں دودھ، میڈیسنز کھالی ہیں۔“ وہ کچن سمیٹ کے سب سے آخر میں دودھ لے کر آئی تھیں۔
 ”ہاں، کھالی ہیں۔“ انہوں نے گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔
 ”مجھے آپ سے ضروری مشورہ کرنا ہے۔“ انہوں نے چند لمحے کے توقف کے بعد بات کا آغاز کیا۔
 ”کہتے۔۔۔۔۔“ ریاض احمد نے خود کو طفر کرنے سے باز رکھا۔
 ”میں سوچ رہی تھی کہ عمیر کی شادی کر دیں۔“ ان کے دل میں یہی دھن سا گئی تھی۔ وہ بڑی بے

قراری سے رات ہونے کا انتظار کر رہی تھیں تاکہ ان سے بات کر سکیں۔ انہوں نے بڑا سا گھونٹ بھر کے دودھ ختم کیا۔ دل میں ایک کک سی اٹھی۔
 ”یہ خیال بھلا کیوں آ گیا۔“ وہ بخیدگی اختیار کر گئے۔
 ”کیا اس کی شادی نہیں کرنی، چار سال ہو گئے ہیں اسے آپ کے ساتھ بزنس سنبھالے، اگلے سال وہ پورے اثیس کا ہو جائے گا، پھر خاندان میں بھی دو، تین اچھی لڑکیاں ہیں۔ اگر آپ رضا مند ہوں تو معاملہ آگے بڑھاؤں۔“ رابعہ احمد کو ان کی اجازت درکار تھی کیونکہ عمیر اپنے ہر فیصلے میں باپ کی اجازت شامل رکھتا تھا۔
 ”بہتر ہوگا کہ ایک بار عمیر سے بھی پوچھ لیا جائے۔“ انہوں نے بے دلی سے معنی خیز سا جواب دے دیا۔
 ”صبح ہی پوچھ لوں گی، ہمارا اتنا نیک اور سعادت مند بیٹا، اب منہ سے ٹھوڑی کہے گا ہمیں ہی خیال کرنا چاہیے۔“
 وہ خوش ہو گئیں۔ عمیر کو منانا مشکل نہیں لگ رہا تھا۔
 ”لائٹ آف کر دو۔“ ریاض احمد دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئے، ان کا دل بچھ سا گیا۔ اس بیٹے کی دلہن کے روپ میں ہمیشہ دعا کو دیکھا تھا۔
 رابعہ احمد اپنی دھن میں نیکی پر سر رکھے، خاندان بھر کی کنواری لڑکیوں کو ذہن میں دہرا رہی تھیں۔
 ☆☆☆
 انعم موبائل پر نمبر ڈائل کرتی صوفے پر آ بیٹھی۔
 چوتھی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔
 ”السلام علیکم ماما جی۔“ اس نے ٹانگیں صوفے پر رکھیں۔
 ”وعلیکم السلام میری جان! میری بیٹی کیسی ہے؟“ دل آرا اس کی آواز سن کے نہال ہو گئیں۔ وہ نولیہ اسٹینڈ پر ڈال کے بیڈ پر آ بیٹھیں۔ ان کا چہرہ اندرونی خوشی سے منور ہو گیا۔
 ”ایم فائن، کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں ماما جی۔۔۔۔۔“ اس نے یہی پوچھنے کے لیے کال کی تھی۔ اس

روزی بدتمیزی کے بعد دل آرا نے خود سے اسے یاد نہیں کیا تھا۔ وہ بھی اپنی خود ساختہ الجھنوں میں محسوس نہ کر پاتی۔
 ”بہت جلد احساس ہو گیا کہ میں ناراض ہوں۔“ ان کا لہجہ نارمل تھا لیکن انعم خفت زدہ ہو گئی۔
 وہ ماں تھیں وہ اکثر ان سے ناراض ہو جاتی مگر اپنی غلطی کا احساس ہو جانے پر جلد ہی معافی بھی مانگ لیتی۔ اس بار تو کافی روز گزر گئے تھے۔
 ”سوری ماما جی۔۔۔۔۔ میں وہ سب آپ کو سو فٹ بی ہیویر میں بھی کہہ سکتی تھی۔ لیکن میں بہت۔۔۔۔۔ بہت اب سیٹ تھی، میں نے احسن کو اتنا زیادہ خوش دیکھا، وہ بھی کسی دوسری عورت کے لیے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔
 دل آرا زندگی آواز سے سمجھ گئیں کہ آج پھر کوئی مسئلہ پیش ہونے والا ہے۔
 ”میری چند! میری صرف اتنی سی غلطی ہے کہ میں نے دعا کے آگے پیچھے کوئی نہ پا کر، احسن سے اس کی شادی کا فیصلہ کر لیا، اس فیصلے میں میری غرض اور تمہاری رضامندی بھی تو شامل تھی، اب اس برسوں پرانی دوست میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے۔“
 وہ دل مسوس کے رہ گئیں وہ دوبارہ اتنی جلدی پاکستان نہیں آ سکتی تھیں۔ دل کو ہر پل دھڑکا لگا رہتا تھا انعم نے اپنی اتنا اور ہٹ دھرمی سے اسے بھی ڈپٹی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہوگا۔
 ”شاید خرابی اس میں نہیں، مجھ میں ہے۔“
 ”نہیں میری بیٹی! تم میں کوئی خرابی نہیں۔“ وہ سمجھیں شاید وہ اسے بانجھ پن کا ذکر کر رہی ہے۔
 ”نہیں ماما! مجھے اعتراف کرنے دیں، کہ میں حاسد بن گئی ہوں، مجھ سے میری محبت، میری زندگی، میرا احسن شیر نہیں کیا جا رہا۔ مجھ میں حوصلہ ہی نہیں کہ میں اسے اپنے علاوہ کسی اور کا ہوتے کسی اور کا ذکر کرتے یا کسی اور کے ساتھ ہنستے بولتے برداشت کروں، آپ بھی نہیں سمجھیں گی ماما، جب میں ان دنوں اسے دعا کی کیئر کرتے، اس کی چھوٹی چھوٹی

ضرورتوں کا خیال رکھتے، اس کے ساتھ جتنے بولتے دیکھتی ہوں تو میرے دل پر کیا پیتی ہے۔" وہ اپنا دکھ، کرب اور اندر پلٹا ناسور الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر تھی۔

دل آرا کی زبان حرکت نہ کر پائی۔ وہ سن ہو گئیں، انہیں شروع سے اندازہ تھا کہ وہ احسن سے محبت میں شدید ہے اسی لیے وہ ڈر گئی تھیں انہوں نے اس کی احسن کے ساتھ شادی میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی حالانکہ ان کا خیال تھا کہ وہ احسن کے لیے ہمارے کوئی لڑکی لائیں اور انہم کی شادی بھی غیروں میں طے پائے تاکہ ان کی رشتے داری بھی آگے بڑھے۔

ان کا سسرال اور میکہ گاؤں میں ملے گا۔ وہ جنید آفندی کے کاروبار کی وجہ سے ان کے ساتھ قریہ قریہ گھومتی تھیں۔ پھر احسن کے بعد ان کے گھر کوئی اولاد بھی پیدا نہ ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے یتیم و یتیم کو سینے سے لگا کر پالا تھا۔

"آپ جانتی ہیں وہ ان دنوں کس طرح مجھے بھول چکا ہے۔ اس کی صبح دعا کا نام لے کر اور شام بھی اس کے ساتھ گزرتی ہے۔ وہ ایسا جان بوجھ کر نہیں کر رہا، لا شعوری طور پر، وہ خوش ہی اتنا ہے۔ اسے دعا کے علاوہ اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ میں کہیں بھی نہیں رہی ماما جی، میں جو اس گھر کا سب کچھ ہی اب صرف ایک فرد بن کے رہ گئی ہوں، ایک بچہ جو ابھی اس دنیا میں آیا بھی نہیں اس کے لیے جیتے جاگتے انسان کو اتنی تکلیف میں ڈال دینا، کہاں کا انصاف ہے، آپ صرف میری ماں تو نہیں، احسن کی بھی ہیں۔ میں آپ کو منصف کے کٹہرے میں کھڑا نہیں کروں گی لیکن ماما جی مجھے لگتا ہے کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔"

"بس چپ کر جاؤ انو۔۔۔ تم اس قدر اذیت میں ہو کہ اپنی موت کا سوچنے لگی ہو۔"

دل آرا کا دل کٹ سا گیا۔ انہیں انہم سے اتنی شدت کی امید نہیں تھی۔ وہ کیوں بھول گئیں کہ جس نے آج تک صرف محبت ہی سمیٹی ہے۔ وہ محبتوں کا بٹوارہ کیسے برداشت کرے گی۔

"میں بہت۔۔۔ بہت اپ سیٹ ہوں، آپ نے اتنی دور رہ کر بھی میرا درد محسوس کر لیا ہے پھر وہ کیا ہوا انجان بن گیا ہے، اگر میں آج آپ سے یہ سب سیز نہ کرتی تو مجھے کچھ ہو جاتا، میں بہت تنہا ہو گئی ہوں ماما، پلیز۔۔۔ پلیز آپ لوٹ آئیں، جتنی جلدی ممکن ہو، میں اکیلی ہوں، جی نہیں پاؤں گی، گھٹ گھٹ کے مر رہی ہوں۔"

اس نے روتے ہوئے موبائل والا ہاتھ نیچے کر لیا۔ دل آرا کی آنکھیں بھی بھر آئیں وہ بیٹی کی تکلیف پر اذیت میں مبتلا ہو گئی تھیں۔

☆☆☆
ریاض احمد فائل کے ورق اٹھتے جا رہے تھے ان کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ فائل بنا کر کے، انہوں نے ریسور اٹھا لیا۔

"جی سر۔" سیکرٹری بڑا مودب پوچھ رہی تھی۔
"مگر کوئی ریسورجیو۔" کہہ کر فون رکھ دیا گیا۔

چند لمحوں بعد وہ حاضر تھا۔
"سے آئی کم ان سر۔" وہ چوکھٹ پر رکھا تھا۔
"لیس کم ان۔" وہ اتنی کھروری اجازت چوک گیا۔

"جی سر۔" وہ ٹیبل کے سامنے رک گیا۔
"یہ دیکھو کتنی غلطیاں ہیں اس میں۔" انہوں نے فائل اٹھا کے زور سے پھینک دی۔
"سوری سر، میں ابھی درست کر دیتا ہوں۔" اس نے سر جھکا لیا۔

وہ سارے ایمپلائرز میں سے صرف اس کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔
"اب تو تم ٹھیک کر رہی لو گے اور جو وقت کا حرج ہوگا، آج کا کام صرف آج کی ڈیٹ میں ہی کمپلیٹ کرنا ہے۔"

انہوں نے قطعیت سے کہہ کر، دوسری فائل کے۔۔۔ اپنے آگے کر لی یعنی اب وہ جاسکتا تھا۔ دل موس کے رہ گیا۔ "آج پھر بچ بیک بند تھا۔" اس نے دل میں حساب لگاتے فائل اٹھا لی۔

☆☆☆

وہ کمرے سے باہر آئی تو اسے حیرت ناک منظر دیکھنے کو ملا۔ ناشتہ ٹیبل پر لگا تھا۔ احسن سیب کی قاشیں کاٹ کے اسے کھلا رہا تھا۔

"پلیز احسن! میں خود ہی کھا لوں گی۔"

دعا کے چہرے پر بے زاری تھی۔
"نہیں، مجھے تم پہ بالکل یقین نہیں، یہ سیب ختم کر کے، دودھ کا گلاس بھی پینا ہے۔ ڈاکٹر مارٹرہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں کہ میں تمہاری کیئر نہیں کرتا۔" اس نے خود اس کے منہ میں قاش ڈالی تھی۔ انہم کے پیروں تلے سے زمین کھینچنے کے لیے یہ منظر کافی تھا۔ اس کے ذہن میں ماضی گھوم گیا۔

جب اسے ماں نہ بن سکنے کی خبر ملی تھی تو وہ کتنا بیمار رہنے لگی تھی اس نے اپنی کی کو اعصاب پر سوار کر لیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح گھنٹوں ایک جگہ پر بیٹھی رہتی۔ احسن خود اس کے منہ میں نوالے ڈالتا، ناہید کے سر پر کھڑا ہو کر اس کے سارے کام کر داتا، کئی روز وہ آفس نہ جا پایا۔ دل آرا تین ماہ اس کے پاس آ کر رہیں۔

"میں خود ہی کھا لوں گی احسن! میں بچی تھوڑی ہوں۔" وہ چڑی ہوئی تھی۔

"بچی ہی ہو، جو سارا دن بھوکی پڑی رہتی ہو۔ ناہید کے تو تم قابو میں نہیں آتیں۔ مجھے اچھا لگتا ہے تمہارے کام کرنا۔" احسن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"آپ بھی ایک دن مجھ سے اکتا جائیں گے۔" وہ کھوٹی گئی وہ ہر وقت ٹکیٹو سوچتی رہتی تھی۔
"ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا انو! جس روز یہ ہوا وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ تم ہی میری اولین چاہت اور زندگی ہو، ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھر رہے اور نا کھل سکتے۔"

اس کا یہ محبت بھرا رویہ ہی تھا جو اس کے زخموں سے چور بدن پر مرہم رکھتا تھا اسے پھر سے زندگی کا آسرا دیتا تھا۔
"تم بدل تو نہیں جاؤ گے احسن! تمہاری یہ محبت صرف لفظوں تک مقید تو نہیں ہو کر رہ جائے گی۔"

یہی ڈر اس کے دل کو کھینچنے کی مانند جکڑے ہوئے تھا۔

"کتنا فضول سوچ رہی ہو تم انو، کیا بچپن سے لے کر آج تک میں تم سے کسی غرض سے محبت کرتا آیا ہوں، میری محبت بے ریا اور بے لوٹ ہے۔ اس میں اولاد کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔"

اس نے بالکل یہی کہا تھا۔ انہم نے من و عن مان لیا تھا۔ کیونکہ احسن کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

"بس کر دیں احسن! میرا جی بھر گیا ہے۔" دعا نے ہاتھ سے پلیٹ پرے کر دی۔ انہم اس آواز پر حواسوں میں واپس لوٹی۔

"اچھا اب جلدی سے دودھ ختم کرو، بغیر کوئی شور مچائے۔" احسن نے دودھ کا گلاس بھر لیا۔
"اول ہوں۔"

انہم نے گلا کھنکار کے انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ دونوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔ وہ احسن کے برابر والی کرسی پر آ بیٹھی۔

"گڈ مارننگ۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔
"گڈ مارننگ۔۔۔ کیسی ہو؟" احسن مسکرایا۔

وہ رات والی ہر بات بھلا کر مسکرا رہا تھا۔ وہ اس سے ناراض ہو کر، اسے مزید وہموں میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا وہ اسے خود سے بدظن نہیں کر سکتا تھا۔

"ایم فائن، مجھے کیا ہوتا ہے، البتہ دعا ٹھیک نہیں لگ رہی۔" انہم نے اسے گھورا۔ دعا کی جان چھلی پر آ گئی۔

"خدا کا شکر ہے۔ میں اسے رات کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ انہوں نے کچھ ضروری ٹیسٹ کروانے کا کہا ہے۔ میں شام کو لے جاؤں۔۔۔"

انہم نے درمیان میں بات اچک لی۔
"میں اسے خود لے جاتی ہوں۔" بڑی سنجیدگی سے خدمات پیش کی گئیں۔

دعا نے احسن کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے کر پینا شروع کر دیا۔

"ناہید آ یا! انو کے لیے فریش جوس بنا کر

GARMILKO THAND KARA



لائیں۔" انہم میز کی سطح کمرچنے لگی۔ احسن اس کے لیے ڈبل روٹی کے سلاکس پر جیم لگانے لگا۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر مائرہ نے کچھ ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے جن کے لیے دعا کا کلینک کے بجائے ہاسٹل جانا ضروری تھا۔ یہ ذمہ داری انہم نے اٹھالی تھی۔ وہ رستہ بھر خاموش کمر کی سے باہر دیکھتی رہی، دعا نے بھی اس کی خاموشی کو غنیمت جانا۔

وہ اوپر آل بازو پر ڈالے ڈاکٹر اعجاز ڈاکر کے کمرے سے نکل کر سیدھے کوریڈور میں جا رہی تھی جب اچانک سے اس کی نگاہ چند کوس دور ڈاکٹر مائرہ کے کمرے سے نکلتی دعا اور انہم پر پڑی۔ وہ دائیں طرف مڑ گئیں اب ان کی نوال کی طرف پشت تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی، باتیں کرتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ نوال کے قدم تو وہیں جم گئے۔ اسے نظر کا دھوکا نہیں ہوا تھا، وہ دعا ہی تھی وہ اسے پشت اور چال سے بھی پہچان چکی تھی۔ وہ اسے ہزاروں کے مجمع میں تلاش کر لیتی۔ اس کی زبان گنگ اور وجود ساکت ہو گیا۔ وہ کافی دور جا چکی تھیں۔

"مجھے ان کے پیچھے جانا چاہیے۔"

وہ یکدم ہوش میں آئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ جلدی سے ان کے پیچھے آئی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔

"دع....." اس کی آواز اور حلق نے ساتھ نہ دیا۔ وہ باتیں کرتی کوریڈور سے مڑ کے، اس کی آنکھوں سے اوچھل ہو گئیں۔

"مجھے ڈاکٹر مائرہ سے پوچھنا چاہیے۔" وہ یہ سوچ کر رک گئی کیونکہ یہ زیادہ مناسب تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر ادنیٰ ڈی میں ہوتی تھیں۔ اپنے روم میں وہ صرف ایجنٹل مریضوں کو چیک کرتیں۔

"سے آئی کم ان میم۔" وہ چوکھٹ میں ایستادہ ہوئی۔

"جی..... جی آئیے ڈاکٹر نوال۔" وہ اپنی چیزیں سمیٹ کے بیک میں ڈال رہی تھیں۔

"میم مجھے آپ سے ایک چھوٹی سی انفارمیشن

چاہیے تھی۔"

"جی ضرور....." وہ سمجھیں شاید کوئی پروفیشنل ماہم ہے۔

"میم ایہ جو لڑکی ابھی آپ کے روم سے نکلی ہے، کیا اس کا نام دعا ہے۔" اس نے بڑا سوچ کے آغاز کیا۔

"جی..... جی بالکل، کیا آپ اسے جانتی ہیں۔" انہوں نے گاڑی کی چابی اور موبائل ہاتھ میں لیا۔

"جی..... جی، میں اور دعا ایک ساتھ اکیڈمی میں پڑھتے تھے، ہم دونوں کی اچھی فرینڈ شپ تھی۔ اب میں نے اسے دور سے دیکھا تو پہچان لیا۔ پھر مجھے لگا کہ شاید نظر کا دھوکا ہو۔ اس لیے آپ سے کنفرم کرنے آ گئی۔"

اس نے بڑا خوب صورت سا جواز پیش کیا۔ اب وہ دونوں باہر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"ہاں اس کا نام دعا ہی ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے آنکھوں پر گلاسز لگائے۔

"کیا آپ کی بھی جان پہچان ہے ان سے۔" بڑی معصومیت سے جان بوجھ کر یہ سوال کیا گیا۔

"نہیں، وہ صرف میری پیشکش ہے۔ انہم اور احسن سے میری اچھی فرینڈ شپ ہے اور وہ انہم کی فیملی سے ہے۔ اس کا ٹریٹمنٹ مجھ سے چل رہا ہے۔"

ڈاکٹر مائرہ بڑی روانی سے اسے بتاتی جا رہی تھیں۔ نوال کے کان گرم ہو کے دھکنے لگے۔ اس کی چال ست اور قدم گھسیٹنے لگے۔

"میم! پیشکش مطلب....." اس کی زبان مزید بولنے کے لیے ساتھ نہ دے رہی تھی۔

"دعا پریکٹس ہے....." ان کا لہجہ پروفیشنل تھا۔ نوال کے لڑکھڑاتے قدم رک گئے۔ اس کے پیروں تک سے جان نکل گئی تھی ڈاکٹر مائرہ، ڈاکٹر مابین کے پاس رک گئیں۔ ان کی توجہ پڑ مردہ ہوئی نوال سے ہٹ گئی تھی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مہوش افکار



پیر سید نظر حسین شاہ سے سکبر سنگھ بہت متاثر ہوتا ہے ان کے دربار میں روز جھاڑو لگاتا ہے اور اپنے خاندان اور بیوی کی ناراضی سہتا ہے۔ وہ اسلام قبول کر لیتا ہے اس کا نام عبداللہ رکھا جاتا ہے۔ خاندان والے اس کا اور اس کے بیٹے کا بایکات کر دیتے ہیں، بیوی صدے سے مر جاتی ہے۔

عبداللہ، نظر حسین شاہ کے دربار پر آ جاتا ہے اور سب انتظامات سنبھال لیتا ہے۔ پیر نظر حسین کے بھائی کا بیٹا ہاشم خاندان کے دیگر لڑکوں کی طرح شہر پڑھنے جاتا ہے اور عیاشیوں میں لگ جاتا ہے۔ بھائی کی بیٹی معصومہ ان کی بڑی بہو ہے۔ پیر نظر حسین بیٹے کی حرکتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ بھادج اور بہو کو ان کی بیٹی زرناب کا رشتہ مانگنے پر اذکار کرتے ہیں، دلوں میں فرق آ جاتا ہے۔ پیر صاحب اپنے بعد پیری مریدی کے سلسلے کو باقاعدہ ختم کر دیتے ہیں کیوں کہ وہ کسی کو اس ذمہ داری کا اہل نہیں سمجھتے۔

مکمل ناول



علاقے میں ایک نیا پولیس افسر آتا ہے، وہ دربار میں فاتحہ پڑھنے آتا ہے، جہاں اسے زرناب نظر آتی ہے۔
معصومہ سب کے بیچ میں بیٹھ کر زرناب پر الزام لگاتی ہے کہ وہ مصطفیٰ (عبداللہ کے بیٹے) کو پیر صاحب کا داماد بنا چاہتی ہے۔ بختیار شاہ یہ سن کر بیوی کو مارنے کے لیے اٹھتے ہیں۔

دوسری قسط

پوری طاقت سے معصومہ کی گردن دباتے ہوئے وہ جیسے عالم جنون میں تھے۔ بی بی نرجس کی چیخیں بے اختیار تھیں۔ صبور، ایاز، حاذق سب ہی دیوانہ وار اٹھ کر ان دونوں کی طرف بھاگے تھے۔ ایک صرف نظر حسین شاہ تھے جو کسی بت کی مانند اپنی جگہ پہ جے رہ گئے تھے۔ شاہ بی بی اور بی بی حوراں نے اس ہولناک الزام پہ دل تھام لیے تھے جبکہ بی بی نور بانو، کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت لیے یک ٹک اس تماشے کو دیکھے جارہی تھیں۔
شور کی آواز سن کے تینوں لڑکیاں بھی اندر سے بھاگی چلی آئی تھیں اور یہاں کا منظر دیکھ کر دروازے میں ہی سہم کر رک گئی تھیں۔
”چھوڑو! چھوڑو مجھے۔“ صبور کے لیے کف اڑاتے بھائی کو قابو کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ایاز اور حاذق ڈھال بن کے بہن کے آگے کھڑے ہو گئے تھے۔
”خبردار! جو میری بہن کو ہاتھ لگایا، ورنہ ہمارے گھر سے کڑے کڑا لوں گا!“ ایاز کی دھمکی نے جیسے جلتی پہ تیل کا کام کیا تھا۔
”تو میرے گھر سے کڑے کرے گا..... ہاں!“ بختیار شاہ بھر کر خود کو چھڑاتے سالے کی جانب لپکے تھے۔
سی انشاء میں معصومہ کی نظر دروازے میں کھڑی زرناب پہ پڑی تھی۔ وہ چیل کی طرح اس پر چبھتی تھیں اور اسے بازو سے چبھتی سب کے درمیان لے آئی تھیں۔
”پوچھیں، پوچھیں اس سے۔ کل یہ بارش میں مصطفیٰ کا بازو پکڑے پچھلے باغ میں کیا کر رہی تھی؟“
وہ حلق کے بل چلائی تو زرناب کے قدموں تلے

پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔
سامنے قیامت کا منظر تھا۔ ملازموں سے بھرے صحن میں مصطفیٰ، صبور شاہ کی ٹھوکروں میں تھا۔ اس کے ناک اور منہ سے خون نکل کر اس کے گرد سے بھرے کپڑوں پر گر رہا تھا۔ اس کی کراہیں اور عبداللہ کی آہ و بکا بھی صبور کا غصہ ٹھنڈا کرنے سے قاصر تھی۔ شاہ صاحب جلال کے عالم میں آگے بڑھے لیکن بختیار شاہ نے سرکھٹ سے ان کا راستہ روک لیا تھا۔
”نہیں بابا صاحب! آج آپ اس معاملے میں نہیں بولیں گے۔“ ان کا نفس تیز اور چہرہ مارے غضب کے سرخ ہو رہا تھا۔ پیر نظر حسین شاہ مٹھیاں پیچھے اپنی جگہ پہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ شاہ بی بی کا دل ٹپ اٹھا۔
”اے اپنی صفائی کا ایک موقع تو دو صبور! اتنا ظلم مت کرو۔“ انھوں نے بے اختیار دہائی دی تھی مگر صبور شاہ پہ تو جیسے خون سوار تھا۔ وہ اسے بے رحمی سے مارتا رہا تھا اور آخر میں گھسٹا باپ کے سامنے لایا۔
”ابھی، ابھی اس حرام خور کو سزا دیں!“ وہ ہانپتا ہوا چلا آیا تو شاہ صاحب کی نظریں اپنے قدموں میں گرے مصطفیٰ پر جا ٹھہریں۔ جو خود پہ ڈھائی جانے والی قیامت کا پس منظر بناتے بھی بہ خوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ معصومہ شاہ اپنا وار کر چکی ہے۔ جس کے بعد زرناب کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا تھا، وہ نہیں جانتا تھا، لیکن سچائی بیان کرنا اس کا حق تھا، تب ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھٹھاں سے انداز میں شاہ صاحب کے سامنے جوڑ دیے تھے۔
”مم..... مجھے اس رب پاک کی قسم ہے۔ مم..... میں نے آپ کے اعتبار کو نہیں..... نہیں توڑا!“
اور پیر نظر حسین شاہ کو لگا تھا جیسے ان کے بے جان جسم میں کسی نے نئی روح پھونک دی ہو۔ وہ

مصطفیٰ کی رگ رگ سے واقف تھے۔ انھوں نے اس کی تربیت خود کی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں سے جان گئے تھے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔
اگلے ہی لمحے وہ جھکے تھے اور مصطفیٰ کو دونوں شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔
”یہ..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں بابا صاحب؟“ بے یقینی کی زیادتی کے باعث صبور شاہ چلا اٹھا۔ مگر پیر نظر حسین شاہ نے اسے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔
”عبداللہ!“
وہ متوحش سے آنسو بہاتے عبداللہ کی جانب پلٹے تو وہ دیوانہ وار بھاگتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔
”میرے اس حکم کو دل پہ نہ لینا۔ بس اتنا سمجھ لینا کہ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“ اسے دیکھتے ہوئے انھوں نے تمہید باندھی تو چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔
”تم اپنے بیٹے کو لو اور اس گاؤں سے دور چلے جاؤ۔“ وہ دھیرے سے بولے تو عبداللہ کی سانس جیسے رک سی گئی تھی۔
مصطفیٰ نے ٹپ کر شاہ صاحب کی طرف دیکھا۔
”کیا انھیں اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا؟“ اس کی آنکھوں میں درد شکوہ بن کر پھیل گیا تھا۔
”جو حکم سرکار۔“ ہر بات سے انجان ہونے کے باوجود عبداللہ نے اپنے مرشد کے حکم پہ سر تسلیم خم کر دیا تو شاہ صاحب کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ اس کا شانہ تھپتھا کے وہ ایک جھکے سے پلٹ کر اندر چلے گئے۔ صبور شاہ انگارے کی طرح دکھتا چہرہ لیے ان کے پیچھے لپکا۔
”بابا صاحب! آپ ایسا کیسے.....“
”بس!“ ان کی گرج دار آواز نے صبور کو اپنی جگہ پہ ساکت کر دیا۔
”بہت برداشت کر لی میں نے تم سب کی

س۔ میں الزام لگانے والے کی خصلت کو بھی بہ جانتا ہوں اور جن پر تہمت دھری گئی ہے ان کے کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں نے جو فیصلہ تھا، سنا دیا۔ اب اگر اس گھر میں کسی نے اس سے روگردانی کی یا اس موضوع پر دوبارہ کوئی ہوئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا!

قسطی لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ پلٹ کر نور بانو سے پلٹ کر آنسو بہاتی بیٹی کی طرف بات یہ بھی کہ کل تک جو لوگ اس بات سے بھی ناواقف تھے کہ صبور شاہ نے مصطفیٰ پہ ہاتھ کیوں اٹھایا تھا، انہوں نے کیا

کہا تھا۔ آج ان کی برسوں کی کمائی ہوئی عزت پر سوالیہ نشان لگ گیا تھا۔ آج ان کی زبان پہ دبے لفظوں میں ہی سہی لیکن زرناب اور مصطفیٰ کا نام آنے لگا تھا۔ یہ نام راتوں رات حویلی کے ہال سے نکل کر انجان لوگوں کی زبانوں تک کیسے اور کس ذریعے سے پہنچے تھے شاہ صاحب بہ خوبی سمجھتے تھے۔ ایک سوگ کی سی کیفیت تھی جو پوری سفید حویلی پہ چھا گئی تھی۔

”نور بانو! زرناب نے کچھ کھایا؟“

بی بی نور بانو کوڑے اٹھائے اس کے کمرے سے نکلتا دیکھ کر شاہ صاحب نے سوال کیا تو وہ آنکھوں میں آنسو لیے نفی میں سر ہلا گئیں۔

ان کے جواب پہ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اس کے کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔ بی بی نور بانو نے ملازمہ کو بلا کر کمرے اس کے حوالے کی اور خود بھی ان کے پیچھے اندر چلی آئیں، جہاں شاہ بی بی، بی بی حوریں، شفق اور صدف سب ہی زرناب کے پاس موجود تھیں۔

”زری بیٹا!“ انھوں نے اندر داخل ہو کر محبت سے اسے پکارا تو وہ جو شاہ بی بی کی گود میں سر دکھ لیتی تھی، بے تابی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے متورم چہرے اور سوچی ہوئی آنکھوں پہ نظر پڑتے ہی پیر نظر حسین

زہرا گل کے وہ دندانہ ہوتی اپنے خاندان کے ہمراہ باہر نکل گئیں تو باوجود بھرپور استقامت کے سید نظر حسین شاہ کا وجود ڈکڑا گیا۔

”بابا! بابا صاحب۔“ زرناب نے دل کر باب کو پکارا۔

”ٹھیک..... ٹھیک ہوں میں۔“

☆☆☆

پیر نظر حسین شاہ کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ آنے والا دن سفید حویلی کے لیے چہ گوئیاں لے کر آیا تھا۔ عجیب بات یہ بھی کہ کل تک جو لوگ اس بات سے بھی ناواقف تھے کہ صبور شاہ نے مصطفیٰ پہ ہاتھ کیوں اٹھایا تھا، انہوں نے کیا

کہا تھا۔ آج ان کی برسوں کی کمائی ہوئی عزت پر سوالیہ نشان لگ گیا تھا۔ آج ان کی زبان پہ دبے لفظوں میں ہی سہی لیکن زرناب اور مصطفیٰ کا نام آنے لگا تھا۔ یہ نام راتوں رات حویلی کے ہال سے نکل کر انجان لوگوں کی زبانوں تک کیسے اور کس ذریعے سے پہنچے تھے شاہ صاحب بہ خوبی سمجھتے تھے۔ ایک سوگ کی سی کیفیت تھی جو پوری سفید حویلی پہ چھا گئی تھی۔

”نور بانو! زرناب نے کچھ کھایا؟“

بی بی نور بانو کوڑے اٹھائے اس کے کمرے سے نکلتا دیکھ کر شاہ صاحب نے سوال کیا تو وہ آنکھوں میں آنسو لیے نفی میں سر ہلا گئیں۔

شاہ کا دل کٹ کر رہ گیا تھا مگر بظاہر وہ ہمت سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھے اور زرناب تو جیسے اسی لمحے کی منتظر تھی۔ باب کے سینے سے لگتے ہی وہ اس بری طرح ٹوٹ کر روئی تھی۔

”ایک بات یاد رکھنا بیٹا، زندگی میں انسان کے ساتھ بڑے بڑے حادثے پیش آ جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم ہمت ہار دیں۔ کل جو بھی ہوا، ہرگز اچھا نہیں ہوا لیکن آپ اس حادثے کو ایک بھیا تک خواب سمجھ کر بھلا دو۔۔۔ میں اپنی بیٹی کی آنکھوں میں دوبارہ کبھی اتنے آنسو نہیں دیکھنا چاہوں گا۔“ انھوں نے پیار سے اس کے بال

ستوار تے ہوئے اس کی پیشانی چومی۔

”بابا..... بابا صاحب میں..... میں اور مصطفیٰ بے قصور ہیں۔ مجھے۔ مجھے آپ کے سر کی قسم ہے بابا کہ ہم نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔“ وہ بچکیوں کے درمیان بولی تو شاہ صاحب نے تڑپ کے بولے۔

”میں جانتا ہوں میرے بچے۔ مجھے اپنی بچی پہ خود سے زیادہ بھروسہ ہے۔“

”پھر بھر..... بھر جائی نے ایسا کیوں کیا؟ وہ..... وہ بہت بری ہیں بابا..... باص..... صاحب..... بہت بری۔ میں تو مصطفیٰ سے جھ..... جھولا ڈلوا رہی تھی۔“

اور پھر وہ اسی ٹوٹے بکھرے لہجے میں انھیں ساری بات بتاتی چلی گئی جسے سن کر شاہ صاحب کا زندگی میں پہلی بار دل چاہا تھا کہ وہ معصومہ کی گردن اڑا دیں۔ اس فتنہ پرور عورت نے ان کے گھر کی عزت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس نے ان معصوم بچوں کے دامن میں زندگی بھر کی ندامت ڈال دی تھی، جس کے بعد وہ ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے بھی قابل نہیں رہے تھے۔

انہوں نے زرناب کو بہت پیار اور نرمی سے اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا مگر ان کی تمام تر کوششوں

کے باوجود اس کی ہنسی، اس کی شوخی بدنامی کی اتھاہ گہرائیوں کے خوف نے سمیٹ لی تھی۔ بھائیوں کا ڈر، ان کی نگاہوں کے نشتر اس معصوم کا اعتماد بکھیر گئے تھے۔ مصطفیٰ کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کی داستان نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ بختیار شاہ اور صبور..... کسی طور زرناب کو بخشنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اس ساری صورتحال نے زرناب کو ایک خول میں بند کر دیا تھا۔ وہ اس حد تک وحشت زدہ ہو گئی تھی کہ اپنے عزیز از جان بابا صاحب سے بھی بات کرنے اور نظریں ملانے سے کترانے لگی تھی۔ اس کی یہ حالت پیر نظر حسین شاہ کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

☆☆☆

ان کا یہ فیصلہ زرناب کے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا۔ باپ، چھٹی اور ماں کے بھرپور اعتماد اور محبت نے رفتہ رفتہ اس کی ذات کے اعتماد کو بحال کر دیا تھا۔ مگر اس کی وہ بے ساختہ ہنسی کہیں کھو گئی تھی۔ مصطفیٰ اور عبداللہ چاچا کی در بدری اسے پہروں ملول رکھتی تھی۔ شاہ صاحب نے صدف اور شفق کو بھی شہر بلوایا تھا جہاں انھوں نے تینوں بچیوں کی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کروایا تھا۔ ان سب کا گاؤں آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن بچیوں کی مستقل رہائش شہر میں ہی گئی تھی۔ جس کا معصومہ کو بے حد غصہ تھا اور اپنی یہ جلن اس نے نہایت ہوشیاری سے زرناب کے خلاف زہر اگل کر نکالی تھی۔ گاؤں کا کوئی ایسا گھر نہ تھا جہاں زرناب اور مصطفیٰ کے عشق کی ڈھیروں داستانیں سنی اور سنائی نہ گئیں۔ لیکن وقت کی گرد نے بالآخر ہر تجسس کا خاتمہ کر ڈالا تھا۔

زرناب اور صدف نے پرائیویٹ انٹر کا امتحان دیا تھا جب بڑی حویلی والے بہت دھوم دھام سے ہاشم کے لیے اس کی خالہ کی بیٹی بیاہ لائے تھے۔ اپنے

طور پہ انھوں نے مدیحہ کو زرناب پہ فوقیت دے کر سفید حویلی والوں کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ لیکن مدیحہ بھی بی بی نرجس کی بھانجی تھی۔ ان ہی کی طرح تیز اور بالکل ان پڑھ۔ ہاشم کے تندر مزاج کے ساتھ اس کا ٹکراؤ ایک لازمی سی بات تھی۔ اس پہ مستزاد زرناب شاہ کا دن بہ دن ٹکھرتا اور سلجھا ہوا روپ۔ ہاشم جب کبھی دونوں کا موازنہ کرتا اسے سوائے ناکامی کے دوسرا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اپنی اس ناکامی کا غصہ وہ گھوم پھر کر مدیحہ پر نکالتا جو جواباً اسے زرناب کا ناکام عاشق گردان کر اس کے غصے اور بیزاری کو مزید ہوا تھلج کی یہ ناچاقی جلد ہی سب پر واضح ہونے لگی۔ باتیں کھلیں تو رہا سہا لحاظ بھی گیا۔ مار پیٹ گالی گلوچ روزانہ کا معمول بن گیا اور ایک روز مدیحہ کے ماں باپ بی بی نرجس اور ہاشم کی اولاد پہ سارے جہان کی خاک ڈال کے اپنی بیٹی کو واپس لے گئے۔ ہاشم نے بھی موقع کو غنیمت جانا اور کسی سے پوچھے پتا۔ اسے طلاق بھجوا دی۔ بی بی نرجس لکیر چٹختی رہ گئیں اور دونوں پوتوں کی ذمہ داری ان پر آ گئی۔

اس دوران سفید حویلی میں شفق بیاہ کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ بی اے کے پرچوں کے بعد صدف اور صبور کی بات بھرا دی گئی تھی۔ اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے صدف، زرناب کی سہیلی سے اس کی بھانجی کے عہدے پر فائز ہو گئی۔ صدف کی شادی کے بعد زرناب بھی مستقل طور پہ حویلی واپس آ گئی تھی۔ اس کی ذات میں در آنے والا اعتماد اب کسی کے برے رویے سے متزلزل ہونے والا نہ تھا۔

☆ ☆ ☆
اس کی مستقل واپسی کی خبر پا کے ہاشم نے ماں بہن پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ ایک بار پھر اس کا رشتہ لے کر پیر نظر حسین شاہ کے پاس جائیں۔ ان کے ارادوں کی خبر سفید حویلی تک پہنچی تو شاہ صاحب کے حکم پہ گھر کی خواتین نے زرناب کے رشتے کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور تب انھیں اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا کہ بدنامی کا زہر کتنا سریع الاثر ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆
خاندان کا ہر وہ گھر جو کبھی پیر نظر حسین شاہ کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے کا خواہش مند تھا، اب کئی کتر اتنا نظر آتا تھا۔ اور جو ہر بات بھلا کر آنے کو تیار ہوتے تھے، ان کے کانوں میں نجائے کون سا صورت پھونکا جاتا تھا کہ بات ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی تھی۔ اس صورت حال نے پیر نظر حسین شاہ کو توڑ کے رکھ دیا تھا۔ لیکن بظاہر وہ ہر آن اپنی بیٹی، بیوی اور بہن کا حوصلہ سے نظر آتے تھے۔ ان کے شب و روز اور خدمتِ خلق کا وہی عالم تھا۔ نور والاں کو تعلیم سے لے کر صحت تک کی ہر سہولت ان کی ایما پر فراہم کی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے تھے۔ زرناب کی پریشانی نے شاہ صاحب کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا، اور ایک روز ان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ رات کے کسی پہر ہونے والا ہارٹ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ نور والاں پہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ کون سی آنکھ تھی جو اشک بار نہ تھی۔ ان کی داغی جدائی کے صدمے نے زرناب کو پاگل سا کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا غم اس کے پیارے بابا صاحب کو کھٹا گیا تھا۔ اور اس کے لیے وہ اپنے باپ کے مجرموں کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆
پیر سید نظر حسین شاہ کے چالیسویں کے بعد جب اگلے سجادہ نشین کا معاملہ اٹھا تو کوثر شاہ کے بلاوے پہ شاہ صاحب کا وکیل ان کا وصیت نامہ لے کر چلا آیا تھا۔ ان کی وصیت نے پورے خاندان میں ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ پیر نظر حسین شاہ نے پیری، مریدی کا سلسلہ اپنے ساتھ ہی ختم کر دیا تھا۔ جس کے بعد ہر من مانی کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
کچھ عرصے بعد بی بی نرجس، ہاشم کا رشتہ لے کر دوبارہ سفید حویلی چلی آئی تھیں۔ ان کی آمد پہ زرناب کا خون کھول اٹھا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس کی ماں، پھپھی اور چچی کی بھی تھی۔ بی بی نور بانو نے بغیر کسی لگی لپٹی کے انھیں انکار کر دیا تھا جس پر بختیار سمیت صبور شاہ نے بھی خوب ہنگامہ کیا تھا مگر بی بی کا انکار اقرار میں نہیں بدلاتھا۔

☆ ☆ ☆
بڑی حویلی والوں کے لیے اپنی بات کا ایک بار پھر رد کیے جانا اور زرناب کا کہیں اور رشتہ طے ہونا کسی چٹک سے کم نہ تھا۔ معصومہ کی نفرت میں مزید شدت آ گئی تھی، وہ اس کی راہ کھوٹی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی، مگر اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود شفق کا لایا ہوا رشتہ قبول کر لیا گیا تھا۔ اور وہیں ہاشم غضب ناک ہو گیا تھا۔ زرناب شاہ کو پانا اور سفید حویلی والوں سے اپنی اس توہین کا بدلہ لینا اب اس کا اولین مقصد بن چکا تھا۔

☆ ☆ ☆
سیف علی ساکت کھڑا اپنے سامنے موجود خستہ حال عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں گائے اور بھینسوں کو باندھ کر اس سرکاری اسکول کی عمارت کو نہایت احسن طریقے سے باڑے کا روپ دے دیا گیا تھا۔ یہاں تعینات سرکاری نیچر یا تو بھگا دیا گیا تھا یا پھر اسے بھی کچھ دے دلا کر اس سازش کا حصہ بنا لیا گیا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی لیکن گاؤں کے غریب بچوں کے مستقبل کے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک سیف علی جنگ کا دل جلا کر خاک کر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
”کب سے چل رہا ہے یہ سب کچھ؟“ اس نے۔ ساتھ کھڑے ایس ایچ او سے دریافت کیا۔

”دو سال سے جناب۔“ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اور کون چلا رہا ہے؟“ اس نے جمیل کی

☆ ☆ ☆
طرف دیکھا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔

”بب۔ بڑی حویلی کے حاذق شاہ اور سفید حویلی کے بختیار شاہ۔“ وہ کھکھیا کر بولا تو سیف کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ وہ جانتا تھا کہ اس سب کے پیچھے علاقے کی ہا اثر شخصیات کا ہی ہاتھ ہوگا۔

”دل تو کر رہا ہے کہ تم سب کو کھڑے کھڑے فارغ کر دوں۔“ اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے سامنے کھڑے ماتحت کو دیکھا تو ایس ایچ او جمیل کی نظریں مارے شرمندگی کے جھک گئیں۔

”نفری بلاؤ اور ابھی کے ابھی اس جگہ کو خالی کرواؤ۔۔۔ جو بھی اس کام میں رکاوٹ ڈالے

☆ ☆ ☆
ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف۔

☆ ☆ ☆
بہنوں کے لیے خوب صورت نمونے۔

☆ ☆ ☆
لال زیست آمنہ ریاض 300/-

☆ ☆ ☆
بڑا آدمی نسیم سحر قریشی 400/-

☆ ☆ ☆
فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل 300/-

☆ ☆ ☆
دل اک گلشن رضیہ جمیل 300/-

☆ ☆ ☆
سوچ مگر کی رانی رضیہ جمیل 350/-

☆ ☆ ☆
حتا نادرہ خاتون 550/-

☆ ☆ ☆
چلمن نادرہ خاتون 300/-

☆ ☆ ☆
باریڈاٹ شوالے۔۔۔

☆ ☆ ☆
مکتبہ، عمران ڈائجسٹ

☆ ☆ ☆
37 32216361

اسے پکڑ کر اندر کروا“ وہ سخت لہجے میں حکم دیتا آگے بڑھ گیا تو جمیل اقبال مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق تھانے بھاگا اور اگلے آدھے گھنٹے میں پورے نور والاں میں اسکول پہ پولیس کے چھاپے کی اطلاع نے سنسنی پھیلا دی تھی۔

حاذق شاہ کو علم ہوا تو وہ بھائیوں کو لیے بھاگ بھاگ سفید حویلی پہنچے جہاں صبور شاہ پہلے ہی غصے میں بھرا کمرے میں چکرارہا تھا۔ بختیار شاہ البتہ اس کے مقابلے میں پرسکون سے صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بختیار شاہ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے انھیں روک دیا تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن اگر آج ہم نے سیف علی کی مخالفت میں کوئی قدم اٹھایا تو وہ لوگوں کی نظروں میں ہیر و اور ہم زبرد ہو کر رہ جائیں گے۔ جبکہ ابھی ہمیں ان سب کی حمایت کی اشد ضرورت ہے۔ کچھ ہی مہینوں میں الیکشن ہونے والے ہیں۔“

”اوہ! تو تمہیں اپنی لیڈری کی پڑی ہے۔“ حاذق شاہ نے استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرا۔ ”اور یہاں جو ہماری عزت کا جنازہ نکل رہا ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟“ وہ غصے سے بولے تو بختیار شاہ کی پیشانی خشک آلود ہو گئی۔

”تو کیا تمہارے اس باڑے کے پیچھے میں اپنا سیاسی کیریئر داؤ پہ لگا دوں؟“ وہ تند لہجے میں بولے تو ہاشم شاہ انھیں تیز نظروں سے دیکھتا، بھائی کی طرف پلٹا۔

”چھوڑیں لالہ، ان سفید حویلی والوں کا تو خون ہی سفید ہے۔“

”زبان سنجال کے بات کر ہاشم!“ صبور اچانک پلٹتے ہوئے غرایا تو ایاز شاہ جو ابھی تک خاموش بیٹھے تھے، بول پڑے۔

”یہ تم لوگ کیا بچوں کی طرح آپس میں ہی شروع ہو گئے ہو۔۔۔ بختیار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اپنے ہی علاقے کے لوگوں کو اپنے خلاف کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اس وقت خاموشی اختیار کر لیں۔“

”پر یہ تو اسے شہ دینے والی بات ہو گی ناں۔“ صبور غصے سے بولا۔

”آج شہ دے رہے ہیں تو کل لگام کھینچ بھی لیں گے۔“ بختیار شاہ رساں سے بولے۔ ”ایک بار کرسی ہاتھ آ جائے اس کے بعد دیکھنا، کیسے میں اس کمینے کا پتا صاف کروانا ہوں۔“ ان کی بات پہ ایاز شاہ نے دانت پیسے۔

”ویسے اس سمجھت کی قسمت اچھی ہے۔ یہ اس وقت یہاں آیا ہے جب بہت کچھ داؤ پہ لگا ہے۔“ ”مگر اب ہم لوگوں سے کہیں گے کیا؟“ حاذق نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”یہی کہ ہم اسے ایس پی صاحب کے اس اقدام کی حمایت کرتے ہیں اور اسکول کی بحالی کا کام اپنے ذمے لیتے ہیں۔“ بختیار شاہ مکاری سے مسکرائے تو ایاز شاہ کی نظروں میں ستائش درآئی۔

”واہ! بہت خوب۔ اس سے بہترین داؤ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ منہ ٹوٹ کر رہ جائے گا اس آلہ کے پیٹھے کا۔“ ان کی تعریف پہ بختیار شاہ تہی ہوئی گردن کے ساتھ مسکرا دیے۔

”صبور! تم کل رات کے لیے فارم ہاؤس پہ شان داری دعوت کا اہتمام کرو۔ میں آج خود اسے ایس پی صاحب سے ملنے جاؤں گا۔“ مونچھوں کو تالا دیتے وہ پُرسوج انداز میں بولے تو صبور شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

سیف علی جنگ اپنے سامنے بختیار شاہ کو پا کر حیران نہیں ہوا تھا۔ آج جو کچھ بھی ہوا تھا، اس کے

بعد وہ ان کی طرف سے ہر طرح کے رد عمل کے لیے تیار تھا۔ لیکن جب انھوں نے اس کے اقدام کی تعریف کرتے ہوئے، اسکول کو باڑے میں تبدیل کرنے جیسی گھٹیا اور غیر قانونی حرکت کی اصل جڑ بڑی حویلی والوں کو قرار دیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی سیف کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

مزید اسکول کی بحالی کا کام اپنے ذمے لے کر انھوں نے ساری بات ہی ختم کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بختیار شاہ نے اسے اپنے فارم ہاؤس پہ مدعو کیا تھا تو وہ انکار نہیں کر سکا تھا۔ ان کا غیر معمولی حسن سلوک اسے چونکا گیا تھا۔ اور وہ بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”بی بی جی! آپ کو پتا ہے کہ یہ افسر جس نے اسکول کی عمارت خالی کروائی ہے، کون ہے؟“ زرناب اور صدف چائے پیتے ہوئے کل وقوع پذیر ہونے والے شان دار کارنامے پہ بات کر رہی تھیں جب پاس بیٹھی فضیلت نے زرناب کی طرف دیکھا تھا۔

”مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے فضلی۔“ وہ اس کے سال پہ دھیرے سے مسکرائی۔

”بی بی جی! یہ وہی نیلی آنکھوں والا بندہ ہے جو اس دن مزار پر ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔“

”کیا۔۔۔“ زرناب کے گم سے چائے ٹھکٹے چھلکتے پکی تھی۔ صدف نے چونکتے ہوئے پہلے فضلی اور پھر زرناب کو دیکھا تھا۔

”یہ نیلی آنکھوں والا کون ہے محترمہ؟“ اس نے انگلی بجائی۔

”کوئی نہیں یار۔“ زرناب دھیرے سے بولی۔ نجانے کیوں اسے اس فرض شناس اور بہادر آفسر کی اصلیت جان کر اچھا خاصا جھکا لگا تھا۔

”تم بتاؤ فضلی۔“ وہ فضیلت کی جانب گھڑی تو

اس نے فر فر سے پوری بات سنا دی۔ ”تم نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ صدف زرناب کی طرف پلٹی۔

”اس میں بھلا بھانے والی کیا بات تھی۔“ اس نے سر جھٹکتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرا۔

”مجھے تو حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ آیا ہم ایک ہی شخص کو ڈسکس کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہاں وہ عامیانی حرکت اور کہاں یہ قابل ستائش کارکردگی۔ تمہیں کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا؟“ صدف ابھی ابھی سی بولی۔

”جتنے دو غلے روٹے لوگوں کے میں نے جھیلے ہیں اس کے بعد تو یہ سب مجھے بہت عام سی بات لگ رہی ہے۔“ آزر دہ سی مسکراہٹ، لبوں پر سجائے وہ دھیمے لہجے میں بولی تو صدف ایک لمحے کو خاموش ہو گئی۔

”بالا بتا رہا تھا جی کہ آج رات اس افسر کی وڈے شاہ جی نے اپنے فارم ہاؤس پہ بڑی شہنشاہی (ایپیشل) قسم کی دعوت بھی رکھی ہے۔“ فضلی نے اپنے شوہر کا حوالہ دیا تو دونوں کے منہ کل گئے۔

”کیا؟“ انھوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”یہ کیا چکر ہے بھئی؟“ صدف نے گنگ میز پر رکھا۔ ”کہیں یہ سب ایک دوسرے سے ملے ہوئے تو نہیں؟“

”کیا کہہ سکتے ہیں۔“ زرناب نے اک گہری سانس لی۔ ”چلو ہماری یہ غلط فہمی تو دور ہوئی کہ وہ ایک دیانت دار اور سچا انسان ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولی تو صدف کے چہرے پہ ہلال اتر آیا۔

”سچ کہوں تو مجھے افسوس ہوا ہے۔ کل کے واقعے کے بعد یوں لگنے لگا تھا جیسے یہاں بہت کچھ بدلنے والا ہے۔ لیکن۔۔۔ وہ بولتے۔ بولتے چپ ہو گئی تو زرناب پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

”یہ اس کا نہیں، تمہاری خوش فہمی کا قصور ہے۔ اب اٹھو، مغرب ہونے والی ہے۔“ اس کا بازو تھپتھپاتی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تو طولی سی صدف اٹھ کر زرناب کے پیچھے چل دی جو خود بھی خاصی خاموش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

طلے کی آواز اور گھنگھر وؤں کی جھنکار، رات کے سنائے میں دور تک سنائی دے رہی تھی۔ وسیع لان روشنیوں اور پھولوں سے سجا خاصا دلکش لگ رہا تھا۔ ساغر وینا کا دور جاری تھا۔ وہ گاؤں کیے نہ کہنی کے بل بیٹھے، اپنے سامنے بچے حسن کے اس جال کو محفوظ نظروں سے نکتا سافٹ ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہا تھا۔

”لگتا ہے، آپ کو ہماری پسند کچھ خاص نہیں بھائی۔“ ہاشم شاہ گلاس لیے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا تو سیف کھل کر مسکرا دیا۔

”نہیں۔ اچھی ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں ناکہ ہر نظر کا اپنا حسن ہوتا ہے۔ اس لیے عورت کے حوالے سے میرا معیار کچھ اور ہے۔“ اس کی بات پہ ہاشم مسکرا دیا۔

”خوب! ذرا ہمیں بھی تو بتا چلے۔ کیا پتا آپ کا گوہر مقصود ہماری نظر میں ہو۔“ اس نے شرارت سے آنکھ دیبائی تو سیف علی ہنس پڑا۔

”جو کسی کی نظر میں سما جائے، وہ میرا گوہر مقصود کہاں۔“

”واہ! کیا بات کہی ہے۔“ اس نے سیف کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”پھر تو بہت خاص پسند ہوئی آپ کی۔“ ہاشم شاہ کی بات پہ ایک پری چہرہ اس کی نگاہوں میں آنکھرا تو سیف دھیرے سے مسکرا دیا۔

”بہت خاص..... آپ سنا میں ہاشم صاحب، آپ کے مزاج کو کیسے رنگ بھاتے ہیں؟“ سیف نے سافٹ ڈرنک کا گھونٹ لیا۔

”صحیح معنوں میں بھانے کی بات کریں تو کبخت ایک ہی رنگ بھایا ہے۔ وہ اور بات ہے کہ اب تک اسے یا نہیں سکے۔“

”اچھا! مگر آپ کے بارے میں تو سنا ہے کہ آپ شادی شدہ ہیں۔“ سیف نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیسی شادی؟ اسے بھولنے کا بس ایک بہانا تھا۔“ ہاشم نے بد مزگی سے سر جھٹکا۔

”غیر خاندان سے بھی کیا؟“ سیف نے کا جواٹھا کر منہ میں رکھا۔

”ارے کہاں۔ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ بختیار اور صبور شاہ کی بہن۔“ اور سیف علی جنگ کو یوں لگا جیسے اسے کسی کرنٹ نے چھو لیا ہو۔ بے اختیار سپدھے ہوتے ہوئے اس نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو گہری نظروں سے دیکھا جو آنکھوں میں نشے کا سرور لیے ایک عیاش رئیس زادے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

”پھر شادی کیوں نہیں ہوئی؟“ سیف نے دھیرے سے سوال کیا۔

”بس یار۔ میرے چاچا جی کا پھیلا ہوا کھڑاگ تھا۔ اور پھر وہ کچھ خود بھی ٹھیک نہیں تھی۔“ ہاشم شاہ نے ہمیشہ کی طرح زرناب کے کردار پہ کچھڑ اچھالی تو سیف ساکت ہو گیا۔

”کیا۔ کیا مطلب؟“

”اب اپنے منہ سے کیا کہوں۔ آخر ہے تو ہمارے خاندان کی عزت اور میری محبت۔ مگر اس لڑکی نے اپنی ہی حویلی کے ایک ملازم کے ساتھ منہ کالا کر کے اس دل کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔“

وہ تاسف سے بولا تو سیف کو لگا جیسے کوئی تیز رفتار ٹرین اس کے وجود کے پر خچے اڑانی گزر گئی ہو۔ بے اختیار اس کی نظروں کے سامنے وہ جھکی آنکھیں آنکھیں جنہوں نے ایک نگاہ غلط بھی اس پر

ڈالنا گوارا نہیں کیا تھا۔ سیف علی کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پوسٹ ہو گئے۔

”اس کی بے وقائی کے باوجود آج بھی میں اسے اپنا نا چاہتا ہوں، مگر محترمہ کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ وہ کہتے ہیں ناں، رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ عزت راس ہی نہیں آرہی سالی کو۔“ دانت پیستے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں جام خالی کر ڈالا۔

سیف کا دل چاہا کہ وہ اس گھٹیا آدمی کی زبان کھینچ لے۔ ایک طرف تو وہ مسلسل محبت اور عزت کا راگ الاپ رہا تھا اور دوسری طرف وہ ایک اجنبی کے سامنے اپنی ہی چاہت کی کردار کشی کر رہا تھا، اسے گالی دے رہا تھا۔ کس درجے کا منافق انسان تھا وہ! ایک لخت سیف کو ہر چیز سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر مزید وہاں رکھا اور پھر سب کے اصرار کے باوجود گھر چلا آیا۔

جبکہ اپنا ہر حربہ ناکام جاتا دیکھ کر بختیار شاہ کتنی ہی دیر تک تلملاتے رہے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح سفید حویلی کے لیے نئی پریشانی لے کر آئی تھی۔ بی بی حوراں ہاتھ روم میں گر گئی تھیں۔ ٹانگ اور بازو پہ شدید چوٹیں آئی تھیں جبکہ ٹخنے کی سوجن دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ ہڈی فریچر ہو گئی ہے۔ وہ بے حد تکلیف میں تھیں۔ صدف کا رورو کر برا جال تھا۔ بختیار شاہ علی الصباح پارٹی میٹنگ کے لیے ملتان جانے کے لیے نکل چکے تھے جبکہ صبور کا نمبر رات فارم ہاؤس پہ گزارنے کے باعث نا حال بند جا رہا تھا۔

بالآخر شاہ بی بی نے ڈرائیور سے کہہ کر حویلی میں اس وقت موجود واحد گاڑی نکلوائی تھی اور زرناب کے ساتھ بی بی حوراں کو لے کر شہر روانہ ہوئی تھیں۔ صدف بچوں کی وجہ سے چاہتے ہوئے بھی

ماں کے ساتھ نہ جاسکی تھی۔

حویلی سے نکل کر گاڑی بڑی تیزی سے نور والاں کی حدود کو پار کرتی بڑی سڑک پر آئی تھی، جب بیچ راستے میں جھٹکے کھانے کے بعد اچانک بند ہو گئی تھی۔

”اے گڈی کیوں بند ہو گئی اے حق نواز؟“ شاہ بی بی نے پریشانی سے ڈرائیور سے استفسار کیا۔

”ہن ای ویکنا آں بی بی۔“ ڈرائیور دروازہ کھول کے باہر نکل گیا، لیکن جب دس، پندرہ منٹ کی کوشش کے باوجود بھی گاڑی اشارٹ نہ ہوئی تو زرناب اور کوثر شاہ دونوں پریشان ہو گئیں۔

”اب کیا کریں بی بی؟“ زرناب نے متفکر نظروں سے پچھنی کو دیکھا۔ گھر میں بھی دوسری کوئی گاڑی موجود نہ تھی جو وہ حق نواز کو بیچ کر منگوا لیتیں۔

”میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ انھوں نے پریشانی سے اپنی گود میں سر رکھے لیٹی بھادج کو دیکھا۔

”بی بی صبیہ (صاحبہ)۔“ حق نواز کے پکارنے پہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ”او پچھے، اے ایس پی صیب حوراں دا بنگلہ اے۔ جے تسی اجازت دوتے میں اونھوں مدد دا آکھاں؟“ (وہ پیچھے اے ایس پی صاحب کا بنگلہ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں وہاں سے مدد کے لیے کہوں؟)

اس نے کچھ فاصلے پر موجود سیاہ گیٹ کی طرف اشارہ کیا تو زرناب بے اختیار گھبرا گئی۔

”نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔“

”مگر! اس کے بغیر گزارہ بھی تو نہیں۔“ شاہ بی بی پریشانی سے بولیں تو زرناب نچلا لب کاٹنے لگی۔

”بلکہ ایسا کرو کہ تم بھی اس کے ساتھ جاؤ۔ اگر اس وقت گھر میں کوئی عورت ہوئی تو پتا نہیں اس کی بات سننے کی بھی یا نہیں۔“ انھوں نے اپنے تئیں

معقول بات کی تو مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق زرناب گاڑی سے نیچے اتر آئی۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دن کے سوا گیارہ بجے اے ایس پی صاحب کی گھر میں موجودگی کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ اس پر مستزاد رات ہونے والی دعوت خاص!

”وہ بھی یقیناً فارم ہاؤس پہ ہی کہیں مدھوش پڑا ہوگا۔“ تنگی سے سوچتی ہوئی زرناب ڈرائیور کے ہمراہ چلتی سیاہ گیٹ کے سامنے آکھڑی ہوئی تو حق نواز نے آگے بڑھ کے اطلاعی گھنٹی پہ انگلی رکھ دی۔

کمرے میں پھیلی ملگجی سی روشنی کے درمیان سیف علی جنگ اپنی مسہری پہ گہری نیند سوراہا تھا، جب اچانک کسی عجیب سے احساس کے زیر اثر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ تیزی سے سیدھے ہوتے ہوئے اس نے اپنے ارد گرد دیکھا تھا لیکن چار سو خاموشی تھی۔

تب ہی اس کی نظر سامنے لگے وال کلاک کی طرف اٹھی تھی اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ گیارہ بج گئے تھے اور اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ تیزی سے کبل ہٹاتا وہ اٹھ کر باتھ روم میں جا گھسا تھا۔ ہاشم شاہ کی کل کی باتیں اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ شدت سے زرناب شاہ کو دوبارہ دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

نہا، دھو کر وہ کاشن کے سرمئی شلوار سوٹ میں باہر نکلا تو سوا گیارہ بج رہے تھے۔ جوں ہی اپنے دھیان میں سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ اس کی سماعتوں سے آواز ٹکرائی۔

”تمہاری بیگم صاحبہ کہاں ہیں شمیم؟“ سیف علی نے بے یقینی سے نظریں اٹھاتے ہوئے سامنے دیکھا تھا جہاں سفید کڑھائی والی چادر میں اس دشمن جاں کو لپٹا کھڑا دیکھ کے وہ ایک لمحے کے لیے مبہوت رہ گیا تھا۔ تو کیا وہ اس کی آمد کا احساس تھا۔ اس نے حیرانی سے سوچا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”یہاں تو کوئی بیگم صاحبہ نہیں بی بی۔ صرف صاحب ہی ہوتے ہیں۔“ شمیم کو اے ایس پی صاحب کے جنگلے میں پا کر زرناب نے بے اختیار سکون کا سانس لیا تھا۔ اس نے ساری بات اسے بتا کر اس کی مالکن کے متعلق استفسار کیا تھا اور اس کا جواب سن کر اب پریشان ہو گئی تھی۔

”تو پھر؟“

”پھر یہ کہ میں صاحب کو اٹھاتی ہوں۔ وہ آج گھر پہ ہی ہیں۔ رات شاہ جی کی دعوت سے واپسی پہ انہیں بہت دیر ہو گئی۔“ اور زرناب اس کی موجودگی کا سن کر گھبرا گئی تھی۔ اس کی گھبراہٹ سیف کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ بے اختیار اسے ہاشم شاہ کی بات یاد آئی اور اس کا خون نئے سرے سے کھول اٹھا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ کچھ سوچتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا تو زرناب کی نگاہیں اس کے اونچے لمبے وجود کی طرف اٹھی تھیں۔ اس نے تیزی سے چادر سے چہرہ چھپایا تھا۔

”زہے نصیب!“ وہ اپنی نیلی آنکھیں اس کی سیاہ آنکھوں پہ جماتا ہوا بولا تو زرناب کی شفاف آنکھوں میں ناگواری پھیل گئی۔ سیف کے لبوں پہ بے اختیار اک دھیمی سی مسکراہٹ آکر غائب ہو گئی۔

”صاحب جی! یہ ہماری سفید حویلی کی بی بی صاحبہ ہیں۔ انہیں اس وقت آپ مدد کی ضرورت ہے۔“ شمیم اس کے قریب آتے ہوئے بولی تو سیف نے زرناب کی طرف دیکھا۔

”کہیے کیا مدد کر سکتا ہوں میں آپ کی؟“ اس کی آنکھوں میں چھایا رت جگے کا خمار زرناب کا حلق تک کڑوا کر گیا۔ یقیناً یہ اسی رنگین محفل کا کمال تھا جس کا کل وہ مہمان خصوصی تھا۔

”میری چچی کو شہر پہنچانا ہے، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ہماری گاڑی سامنے بڑی سڑک پہ بند ہو گئی ہے۔ بھاء جی اور صبور بھائی سے رابطہ نہیں ہو پا

رہا۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے مختصر ترین الفاظ میں اپنا مدعا کہہ سنایا تو سیف کا ذہن مکمل طور پہ الرٹ ہو گیا۔

”آپ لوگوں کے ساتھ کون ہے؟“

”ہمارا ڈرائیور۔“ اس کی بات پہ وہ اثبات میں سر ہلاتا باہر نکل گیا تو وہ اور شمیم بھی پیچھے چلی آئیں۔ حق نواز سے ساری تفصیل سننے کے بعد وہ اس کی طرف پلٹا۔

”آئیے پلیز۔“ اور زرناب جھجکتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑی جو تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے زرناب کے لیے پچھلا دروازہ کھولا تو وہ اس کے مہذب بننے کی اداکاری پہ اندر ہی اندر کھول اٹھی۔ اس کے بیٹھتے ہی سیف دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا اور اگلے چند ہی لمحوں میں وہ ان سب کو لیے شہر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک بہترین اسپتال میں اس نے شاہ بی بی کے روکنے کے باوجود بی بی حوراں کے لیے بھاگ دوڑ کی۔ زرناب اس دوران خاموش تماشا بنی بیٹھی رہی تھی۔

ڈاکٹر نے بی بی حوراں کے پاؤں پہ پلستر کر دیا تھا۔ اس سارے سلسلے میں انہیں اچھا خاصا وقت لگ گیا تھا۔ ایسے میں صبور شاہ کا دوبارہ فون آیا تھا جسے شاہ بی بی نے غصے میں کاٹ دیا تھا۔ یوں چار، پانچ گھنٹے بعد جب وہ لوگ اس کی۔ گاڑی میں حویلی پہنچے تھے تو بختیار اور صبور شاہ دونوں بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔

”کیا ضرورت تھی اس شخص کا احسان لینے کی؟“ سیف علی جنگ کے منظر سے ہٹتے ہی صبور ان پہ جڑھ دوڑا تھا۔

”جب اپنے مرد ذمہ داریوں سے غافل ہو جائیں تو غیروں سے مدد لینی ہی پڑتی ہے۔“ شاہ بی بی

کا سرد لہجہ صبور شاہ کو نظریں چراتے پہ مجبور کر گیا تھا۔

”آپ کو تو ہمیں شرمندہ کروانے کے سوا دوسرا کوئی کام نہیں۔ جانتی بھی ہیں، کتنا بڑا عذاب بن کے وہ ہمارے سروں پہ مسلط ہو گیا ہے؟“ بختیار شاہ غصے سے بولے تو زرناب چونک گئی۔

”اگر وہ ایسا ہی عذاب تھا تو کل رات کی دعوت کس سلسلے کی کڑی تھی؟ کوئی اپنے مخالفین کے لیے بھلا محفلیں بجاتا ہے؟“

استہزائیہ انداز میں سوچتے ہوئے اس نے سامنے کھڑے بھائی کو دیکھا۔ جو بچانے کیوں سب کے سامنے اس اے ایس پی اور اپنے درمیان حلق کو ظاہر نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

”ہمارے لیے تو وہ کسی رحمت سے کم نہیں تھا۔ بہت ہی نیک اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔“ شاہ بی بی صاف گوئی سے بولیں تو بختیار شاہ نے لب پیچھے ہوئے قطعیت سے ہاتھ اٹھایا۔

”بس! دوبارہ اگر آپ لوگوں میں سے کسی نے یہ غلطی دہرائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ تنبیہی انداز میں اپنی بات مکمل کرتے وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر نکل گئے تو زرناب اس آنکھ مچولی کے بارے میں سوچتی ہوئی الجھ سی گئی۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر سیف نے گاڑی ڈرائیور کے حوالے کی اور خود اندر چلا آیا۔ وہ فریش ہو کر نیچے آیا تو شمیم اس کے لیے گرم چائے اور کباب لیے چلی آئی۔

”صاحب جی! کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے نا؟“ اس نے کپ سیف کے سامنے میز پر رکھا۔

”نہیں۔ اللہ نے خیر کر دی ہے۔ بس معمولی سا فریج پھر ہوا ہے جو ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کی بات پہ شمیم نے مطمئن سے انداز

میں سر ہلایا۔

”صاحب جی یہ رفاقت آپ کا فون دے گیا ہے۔ گڈی میں رہ گیا تھا۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل سیف کی طرف بڑھایا تو وہ چونک کر اس انجان سیٹ کو دیکھنے لگا۔

تب ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ سیٹ تو اس نے اسپتال میں شاہ بی بی کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ اب پتا نہیں یہ ان کا فون تھا یا زرناب کا۔ پر سوچ انداز میں ہنکارا بھرتے ہوئے اس نے شیم سے فون لے کر ایک طرف ڈال دیا۔

”شیم۔“

”جی صاحب۔“

”ایک بات کا بالکل سچ جواب دو گی؟“ اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

شیم نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلادیا۔

”یہ زرناب بی بی اور ان کے ملازم کا کیا قصہ ہے؟“ اور یہ سن کر شیم کی رنگت ——— متغیر ہو گئی تھی۔ ”آپ کو کس نے کہا جی؟“

”ہاشم شاہ نے۔“

”جھوٹ بولتے ہیں جی وہ۔“ شیم تپ کر بولی تھی۔ ”بلکہ یہ سارا گند ان کے خندان (خاندان) اور ان کی بہن معصومہ کا ہی پھیلا ہوا ہے۔ ہماری زرناب بی بی تو فرشتوں کی طرح مصوم (معصوم) ہیں جی۔“ اس کی بات پر سیف نے بغور اسے دیکھا۔

”اچھا، تو پھر حقیقت کیا ہے؟“ اور شیم وہیں زمین پر بیٹھ کر اسے الف تا بے پوری بات سنانی چلی گئی تھی۔ سیف لبوں پہ مٹھی جمائے اسے سنتا رہا۔

”وڈے شاہ صاحب کے مصطفیٰ کو کج نہ کہنے پر دونوں بھائیوں نے باپ سے بات کرنا بند کر دی۔ جبکہ بی بی کی تو وہ شکل تک نہیں دیکھنا چاہتے

تھے۔ زرناب بی بی سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند پڑی روتی رہتیں۔ ان کا ہنسنا بولنا سب ختم ہو گیا تھا۔ سوکھ کے کاٹا ہو گئی تھیں جی۔“ اس نے سیف کی طرف دیکھا۔

”معصومہ بی بی اور ان کے گھر والوں نے انکار کا خوب بدلہ نکالا۔ انھوں نے پورے گاؤں میں زرناب بی بی کو پھنڈ (بدنام) کے رکھ دیا۔ پھر ایک دن شاہ صاحب بی بی، اپنی بیوی اور بہن کو لے کر شہر چلے گئے۔ کج عرصے بعد اپنی بھینچوں کو بھی وہیں بلوا لیا۔ یہ لوگ وہیں رہنے لگے۔“

کڑیوں نے اپنی تنیم (تعلیم) مکمل کی مگر معصومہ بی بی نے زرناب بی بی کی جان نہیں چھوڑی۔ یہی حال ان کے اس بد معاش بھائی کا بھی تھا۔ حالانکہ اس نے اپنی خالہ کی دمی سے شادی دی کر لی تھی مگر نہ اسے و سایا نہ بی بی کا پیچھا چھوڑا۔ پھر صدف بی بی اور صبور صاحب کی شادی کے بعد بی بی لوگ بھی واپس آ گئے۔

وڈی حویلی والوں کو پتا چلا تو وہ اک واری فیر زرناب بی بی کو ہاشم صاحب کے لیے مانگنے پہ تل گئے۔ مگر شاہ صاحب نے بی بی کے لیے خاندان میں رشتے کی کوشش تیز کر دیں۔ لیکن جہاں نہیں دی بات چلتی وڈی حویلی والے وہاں چپ چاپتے (چوری چھپے) گند ڈال دیتے۔

وقت گزرنے لگا۔ بی بی کی عمر بڑھنے لگی۔ اس پریشانی نے ہمارے شاہ صاحب کو ختم کر دیا لیکن ان ظالموں کو شرم نہ آئی۔ وہ تب سے لے کر آج تک اندر خانے زرناب بی بی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن بظاہر یہی کہتے پھرتے ہیں کہ ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اور بی بی کے بھائی ہیں کہ صرف ماں بہن کو جھٹلائے جاتے ہیں۔ ان کی تکلیف کا انھیں کوئی احساس ہی نہیں۔“ دل گرفتگی سے کہتے ہوئے اس نے سیف کو دیکھا تو وہ خود کو مجتمع کرتا

سیدھا ہو بیٹھا۔

”اور وہ لڑکا مصطفیٰ؟“

”اللہ جانے کدھر گیا۔ نہ وہ واپس آیا اور نہ اس کا نماڑاں (بے چارہ) باپ۔“ شیم کے متاسف لہجے پر سیف اک بوجھل سانس لیتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ سب اٹھا لو۔“ اس نے ٹھنڈی ہوتی چائے اور کباب کی طرف اشارہ کیا تو شیم خاموشی سے ٹرے میں چیزیں رکھ کے باہر نکل گئی۔

سیف باہر کھڑکی میں آکھڑا ہوا جس کی دوسری طرف شام اتر آئی تھی۔

”اتنی صعوبتیں۔ اتنی طویل سزا! اور میرا تن من ساری عمر مصطفیٰ کی جلا وطنی، اس کے کردار کی رسوائی پہ جلتا رہا۔ خاک ہوتا رہا!“

ملال نمی بن اس کی آنکھوں میں اتر آیا تو مارے کرب کے اس نے اپنا نچلا لب سختی سے دانتوں تلے دبایا۔

ان گزرے ماہ و سال میں زرناب نظر حسین شاہ پہ کیا ہوتی تھی، یہ آج اسے پتا چلا تھا، لیکن گھائل روح اور زخم خوردہ وجود لیے ہوئے مصطفیٰ کو، اس کا ادھیڑ عمر باپ کہاں لے گیا تھا۔ یہ آج بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور جو جانتا تھا، وہ اس دنیا سے کب کار خست ہو چکا تھا۔

☆☆☆

حویلی سے متصل دربار میں رات کے جس پہر عبد اللہ نے قدم رکھا، ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ صرف ایک برآمدے کی نئی تیل رتی تھی جس کی روشنی میں سیرھیوں پہ بیٹھا وجود اسے صاف دکھائی دے گیا تھا۔ وہ دیوانہ دار اس کی جانب بڑھا تھا۔

”سرکار!“

”بیٹھو عبد اللہ۔“ پیر نظر حسین شاہ نے اسے اشارہ کیا تو وہ طول سا ان کے قریب آ بیٹھا۔

اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ شاہ صاحب نے اسے خود پیغام دے کر بلوایا تھا ورنہ اس ہنگامے کی جو وجہ مصطفیٰ کی زبانی اس کے علم آئی تھی اس نے تو جیسے عبد اللہ کو چوڑی ہی لیا تھا۔

اسے اس بات کا پکا یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ نہ تو کبھی اپنے مرشد کا چہرہ دیکھ سکے گا اور نہ ہی ان کا دل اپنے بچے کی طرف سے صاف کر پائے گا۔ لیکن اسے اپنے پاس بلوا کر پیر نظر حسین شاہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ حقیقت میں بہت بڑے ظرف اور حوصلے کے مالک تھے۔

”مصطفیٰ کیسا ہے؟“ ان کی بات سن کے اس کا دل ان کی عظمت کے آگے پانی بن کر بہنے لگا تھا۔

”بخار میں بے سدھ پڑا ہے جی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ تو شاہ صاحب کے لب مسخ گئے۔ عبد اللہ نے ڈرتے ڈرتے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”سر..... سرکار۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ میرا بچہ اس گھرانے کی عزت کی طرف نگاہ اٹھانے کی خیانت کر سکتا ہے؟“ اس نے سوال کیا تو پیر نظر حسین شاہ پھیکا سا مسکرا دیے۔

”نہیں۔“

”پھر آپ مجھے اس عمر میں اپنے قدموں سے دوری کی سزا کیوں دے رہے ہیں؟“ ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے وہ سک اٹھا۔

”تمہیں وہ وقت یاد ہے عبد اللہ! جب ایسی ہی ایک رات میں اسی جگہ پہ بیٹھ کر تم نے میرے بھروسے پر اپنی منزل کا انتخاب کیا تھا؟“ انھوں نے نرمی سے استفسار کیا تو عبد اللہ کا اندھے پہ پڑے رومال سے آنسو صاف کرتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا۔

”یاد ہے سرکار۔“

”اپنے اس فیصلے پر کبھی کسی قسم کا پچھتاوا ہوا تمہیں؟“ انھوں نے اگلا سوال کیا تو عبد اللہ تڑپ

اٹھا۔

”رب دی سوں (قسم) کبھی نہیں۔“

”تو بس پھر سمجھو کہ آج میں اسی جگہ پر بیٹھ کر تمہارے لیے ایک اور بہتر فیصلہ کرنے والا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میرے لیے مصطفیٰ اب قابل اعتبار نہیں رہا بلکہ اس لیے کہ یہاں اس کی موجودگی اس کی جان اور میری آن دونوں کے لیے اب ٹھیک نہیں رہی۔ اس کی ذات کو لے کر شک اور بدگمانی کا جو بیج بویا جا چکا ہے، اسے اب لوگوں کے دل و دماغ سے بھی نہیں نکالا جاسکتا۔“ وہ افسردہ سے بولے تو بغور ان کی بات سنتے ہوئے عبداللہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

”ٹھیک کیندے اور سرکار۔ اے شک دا بھول ہن سانو سن نہیں دے گا۔“ وہ محفل سا بولا تو انداز میں صدیوں کی تسکین تھی۔

پیر نظر حسین شاہ نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”یہ کچھ پیسے اور ایک پتا ہے۔ لاہور کی ٹکٹ کرانا اور سیدھا اس پتے پر پہنچ جانا۔“ انھوں نے کرتے کی جیب سے کچھ روپے اور ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ چونک کر شاہ صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”اے کے داپتا اے سرکار؟“

”اے ایک بندہ خدا۔ جب جاؤ گے تو دیکھ لو گے۔“ وہ بو جھل سا مسکرائے۔

پیر نظر حسین شاہ جانتے تھے کہ اس کی ساری زندگی اس گاؤں اور گاؤں کی گلیوں کے علاوہ کہیں نہیں گزری تھی اور وہ اتنے سستی نہیں تھے کہ اسے یہاں سے بھیج کر در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے بے آسرا چھوڑ دیتے، تب ہی ان اعصاب شکن حالات میں بھی، انھوں بہت سوچ بچار کے بعد اس کے لیے مناسب ترین حل تلاش کیا تھا۔

عبداللہ نے بھی آنکھیں لیے ان کے ہاتھ

سے دونوں چیزیں تھام لیں۔

”سرکار مینوں اپنی آواز تے سزودی اجازت دو گے ناں؟“ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں استدعا کی تو پیر نظر حسین شاہ کے آنسو ان کے اندر گرنے لگے۔

”پلٹ کر دیکھتے رہو گے تو آگے کا سفر مشکل ہو جائے گا عبداللہ! بس اس بات کا یقین رکھنا کہ میری دعائیں ہمیشہ تم دونوں کے ساتھ رہیں گی۔“ اور عبداللہ اپنے مرشد، اپنے محسن کا ہاتھ پکڑ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

☆☆☆

زرناب منہ دھو کے کمرے میں آئی تو اس کا فون بج رہا تھا۔ تو لیے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کے اسکرین پر نظر ڈالی۔ شاہ بی بی کا نمبر دیکھ کر وہ بری طرح چونک گئی۔ رات کے بارہ بجے شاہ بی بی اسے کال کیوں کر رہی تھیں، پریشانی سے سوچتے ہوئے اس نے سرعت سے فون اٹھا کر کان سے لگایا تھا۔

”خیر تو ہے ناں بی بی؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ پھوٹتے کے ساتھ ہی وہ متوحش سی بولی تو لائن پہ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”آپ جیسی اچھی بیٹی سے اتنی ہی محبت اور کیئر کی توقع کی جاسکتی ہے۔“ یک لخت ایک گھمبیر مردانہ آواز فون پہ ابھری تو زرناب لکھ بھر کو گھبرا گئی۔ یہ شاہ بی بی کے نمبر سے کون بات کر رہا تھا؟ ”کون بول رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں سختی در آئی۔

”آپ کا خادم۔“ سیف پھیکا سا مسکرایا تو زرناب نے ناگہی کے عالم میں ہنسی سکھڑیں۔

”جی؟“

”سیف علی جنگ بات کر رہا ہوں محترمہ۔“ اگلے ہی لمحے وہ بشاش لہجے میں بولا تو

زرناب کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ بی بی کا فون اس کے پاس کیا کر رہا تھا؟ کہیں اس نے قصداً تو فون غائب نہیں کیا تھا؟

”غلط مت سوچیں، ہم قوم کے رکھوالے ہیں، چور نہیں۔“ سیف نے مسکراتے ہوئے اس کی سوچ کو زبان دی تو زرناب اپنی چوری پکڑی جانے پر بری طرح گڑبڑا گئی۔

”م۔ میں نے ایسا کب کہا؟“ اور سیف اس کی آواز میں لرزش محسوس کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔ ”دیے آپ کے اطمینان کے لیے عرض ہے کہ شاہ بی بی کا موبائل میری گاڑی میں رہ گیا تھا۔“ زرناب پر گھڑوں پانی آ پڑا۔

”میں۔ میں انھیں بتا دوں گی۔“ وہ شرمندہ سی بولی۔ سیف مسکرا دیا۔

”آپ کی یہی بات تو مجھے اچھی لگتی ہے، اپنی غلطی کا احساس فوراً کر لیتی ہیں۔“ اور زرناب چکرا کر رہ گئی۔ کیا یہ شخص کسی قسم کا علم جانتا تھا جو اس کی ندامت، اس کا شک، ہر احساس پڑھتا جا رہا تھا؟ گھبرا کر سوچتے ہوئے اس نے خود کو سنبھالا۔

”تو پھر آپ کو یہ جان کر بھی اچھا لگے گا کہ میں غیر مردوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔“ اس نے حتی المقدور اپنے لہجے کو سپاٹ بنایا۔ سیف کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”جانتا ہوں۔ لیکن بات تو ساری سمجھنے کی ہے میں زرناب نظر حسین شاہ کو غیر نہیں سمجھتا۔“ وہ اچانک گھمبیر لہجے میں بولا تو زرناب کا دل اس کے کانوں میں دھڑک اٹھا۔

”یہ آپ کس انداز میں مجھ سے بات کر رہے ہیں؟“

”اپنائیت بھرے انداز میں۔“ اس کا بر جستہ جواب زرناب کا چہرہ سرخ کر گیا۔

”اپنی حد میں رہیں اے ایس بی صاحب!“ اس کا غصہ عود کر آیا۔ ”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ آپ کس سے مخاطب ہیں۔“

”یہی تو بات ہے کہ میں آپ کو بھول ہی تو نہیں پایا۔“ وہ اس کے غصے کو خاطر میں لائے بنا زری سے بولا۔ ”رہی حد کی بات تو میری ہر حد آپ سے شروع ہو کر آپ پہ ہی ختم ہوتی ہے زرناب شاہ! آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔“

بنا کسی ہچکچاہٹ کے واضح الفاظ میں اپنی پسندیدگی ظاہر کی۔ تو زرناب بھونچکی کھڑی رہ گئی۔

”آپ..... آپ کی ہمت کیسے ہوئی مجھ سے یہ بکواس کرنے کی؟“ لمحے کی بے یقینی کے بعد وہ بولی تو آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ نکلی تھیں۔

”ہمت کی بات نہ کیجیے گا۔ اگر میری ہمت کے بارے میں جان گئیں تو پلکیں جھپکنا بھول جائیں گی۔“ سیف یک لخت سنجیدہ آواز میں بولا۔ زرناب نے بے مشکل تمام اپنے اشتعال پہ قابو پایا۔

”ہونہہ! اچھا ہوا جو آپ نے اپنی اچھائی کا یہ ڈھونگ جلد ختم کر دیا۔ اب تم از کم مجھے آپ کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔“

”بدگمانی کی اوٹ سے دیکھیں گی تو ہر منظر دھند میں ڈوبا نظر آئے گا۔ اس لیے صرف یہی کہوں گا کہ اتنی جلدی رائے قائم کرنے کی غلطی نہ کریں۔ ابھی تو پرکھنے کو عشق کے بہت سے امتحان باقی ہیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ شب بخیر۔“

جس طرح اچانک فون آیا تھا اسی طرح اچانک بند ہو گیا تو ساکت کھڑی زرناب نے چونکتے ہوئے فون کان سے ہٹا کر نگاہوں کے سامنے کیا اور پھر لب بھینچے بیڑیہ گری گئی۔ سیف علی جنگ کی آنکھیں، اس کا انداز تو پہلی ملاقات میں ہی اسے چونکا گیا تھا، لیکن وہ اس حد تک بے باکی پہ اتر آئے گا اس بات کا اسے اندازہ نہ تھا۔

”یا اللہ یہ کیا نئی مشکل آپڑی ہے؟ لب کاٹنے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس کے وجود پہ سے تو ابھی پہلے الزام کی گردنیں چھٹی تھی ایسے میں ایک نیا الزام تو شاید اس کی ذات کو ہمیشہ کے لیے مصلوب کرنے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں اس ناگن کا اصلی روپ سب کو دکھا کر رہوں گا۔“ سو جن زدہ چہرہ لیے مصطفیٰ نے سامان باندھتے باپ کو شدید طیش کے عالم میں دیکھا تھا۔ لیکن عبداللہ کے ہاتھ نہیں رکے تھے۔ اپنی بات کا مطلق اثر نہ ہوتے دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے چار پائی سے نیچے اتر اٹھا۔

”اگر تو نے ایک قدم وی اس کمرے سے باہر نکالا تو اپنے پیو کا مرا ہوا منہ دیکھے گا۔“ عبداللہ کی سرد آواز کمرے میں گونجی تو مصطفیٰ نے تڑپ کر باپ کی طرف دیکھا۔

”کیوں؟ کیوں کر رہا ہے تو میرے ساتھ ایسا؟“

”اس لیے کہ یہ سرکار کا حکم ہے۔“

”میں نہیں مانتا اس حکم کو۔ یہ نا انسانی ہے۔ میں اس گاؤں سے گنہگاروں کی طرح سر جھکا کر نہیں نکلوں گا۔ میں زرناب بی بی کو ان ظالموں کے رحم و کرم پہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ حلق کے بل چلایا تو عبداللہ نے سرد نظروں سے اسے دیکھا۔

”آج کہا ہے۔ دوبارہ کبھی شاہ صاحب کو نا انصاف نہ کہنا ارے بات بی بی کی، تو ان کے سر پہ ان کے والد کا سایہ سلامت ہے۔ اللہ نے چاہا تو سرکار کے ہوتے، انھیں تھی ہوا (کرم ہوا) بھی نہیں چھو سکتی۔“ اور مصطفیٰ دونوں ہاتھوں سے منہ چمپا کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا۔

اس کے اندر ذلت کی ایک آگ لگی تھی جو بے بسی کے چھیروں سے اذیت ناک حد تک دکھ اٹھی

تھی۔ عبداللہ نے زخم خوردہ نگاہوں سے بیٹے کو روٹے دیکھا تھا اور پھر سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

وہ شام ان کی نور والاں میں آخری شام تھی۔ جدائی کے اس احساس نے مصطفیٰ کے اندر حشر برپا کر دیا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے آخری بار مڑ کر پیچھے دیکھا تھا جہاں دور کھیتوں کے اس پار سفید حویلی کی اونچی دیواریں نظر آ رہی تھیں جن کے پیچھے اس کی زندگی کا اولین خواب، اولین محبت جن دی گئی تھی۔

☆☆☆

”میں نے آپ کے ساتھ مل کر چلنے کا فیصلہ کیا ہے شاہ جی۔“

پیر ویٹ گھماتے ہوئے سیف علی جنگ نے اپنے مقابل بیٹھے بختیار شاہ کی طرف دیکھا تو وہ بری طرح چونک گئے۔ پہلے اچانک سیف کی کال اور اپنے دفتر آنے کی دعوت اور اب یہ غیر متوقع بات، وہ ٹھنک گئے تھے۔

”اس تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ انھوں نے کھوجتی نگاہیں اس کے چہرے پہ جماتے ہوئے سوال کیا تو سیف دیر سے مسکرا دیا۔

”میں نے آپ کے اندر اس علاقے کے لوگوں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ پایا ہے۔ اور جو لوگوں کی بھلائی چاہے گا، میرا ساتھ از خود اس کے ساتھ ہو جائے گا۔“ اس نے شانوں کو خفیف سی جنبش دی تو بختیار شاہ گڑبڑاتے ہوئے سنبھلے۔

”بالکل کیوں نہیں، ان لوگوں کی بھلائی ہی میرا مقصد ہے۔“

”بس تو پھر اختلاف کس بات کا۔ میں ہر قدم آپ کے ساتھ ہوں۔“ وہ اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بھرپور انداز میں مسکرا کر بختیار شاہ اندر ہی اندر کلستے ہوئے بظاہر کھل کر مسکرا دیے۔

صبر شاہ کو واقعہ کا علم ہوا تو وہ بری طرح جھنجھلا گیا۔

”آپ سے کس نے کہا تھا اس شخص سے ہاتھ ملانے کے لیے؟“ اس نے غصے سے بھائی کا چہرہ دیکھا۔

”تو کیا اس کی بات کی تردید کر کے اسے لوگوں کو بھڑکانے کا موقع دے دیتا؟ یا پھر اس کا ہاتھ جھٹک کر کھلی دشمنی کا اعلان کر دیتا؟“ وہ غصے سے بولے تو صبر مارے بے بسی کے مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ بختیار شاہ نے اک گہری سانس لیتے ہوئے خود کو پرسکون کیا۔

”دیکھو، فی الحال ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔ اب کم از کم ہم اس کے ارادوں کی خبر تو رکھ سکیں گے ورنہ اسکول والے معاملے کی طرح انجانے میں ہی مات کھا فی پڑے گی۔“ ان کی بات پہ صبر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”پتا نہیں کیوں بھاتی مجھے یہ بندہ، انجان نہیں لگتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے۔“ اس نے اپنے اندر چھٹی آنکھوں کو زبان دی تو بختیار شاہ چونک اٹھے۔

”کمال ہے۔ پہلی ملاقات میں مجھے بھی کچھ ایسا ہی احساس ہوا تھا۔“ ان کے جواب پہ صبر سرعت سے سیدھا ہوا۔

”مجھے یقین ہے، کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔“ اپنے اندازے کی تصدیق نے اس کے اندر جوش بھر دیا۔ ”میرے خیال میں بھاتی ہمیں اس کے بارے میں تفصیلی معلومات نکلوانی چاہیے۔“ اس نے ان کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

”ہوں۔“ بختیار شاہ نے پرسوج انداز میں مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”کرتے ہیں کچھ۔ تب تک جتنا ہو سکے، اس کے آس پاس رہو۔“

ان کی ہدایت پہ صبر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تھیں یہ دھوکا بہت مہنگا پڑے گا جنگ، اگر جو تم آستین کے سانپ نکلے!“ غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں جمائے بختیار شاہ کی آنکھوں میں سرد مہری پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

صبح سے بی بی حوراں کی عیادت کو آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ شفق کو ماں کے گرنے کا علم ہوا تو وہ اسلام آباد سے دوڑی چلی آئی۔

ان کا شفیق چہرہ دیکھ کے اس کی جان میں جان آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ سب بی بی حوراں کے پاس بیٹھی تھیں جب معصومہ کی نظر، خود سے ابھتی زرناب پہ جا ٹھہری تھی۔

”یہ تم کیوں صبح سے اتنی چپ چپ سی ہو؟“ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔ وہ آج صبح سے ہی اس کی کھوئی کھوئی سی کیفیت کو محسوس کر رہی تھیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں بھر جاتی۔“ زرناب خود کو سنبھالتے ہوئے بے تاثر لہجے میں بولی تو معصومہ کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”مجھے لگتا ہے، اسے اپنے سرال والوں کا نہ آنا پریشان کر رہا ہے۔“

انھوں نے باقی سب کی طرف پلٹتے ہوئے خیال آرائی کی تو زرناب ان کی اس سوچ پر جل کر رہ گئی۔ پتا نہیں وہ کہاں کہاں سے اس طرح کے نکتے نکال لاتی تھیں۔

”اول تو وہ ابھی اس کی سرال نہیں بنی۔ دوسرا وہ لوگ فون پہ حوراں کی عیادت کر چکے ہیں اور اس اتوار آنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لیے بے فکر رہو، زرناب کو ایسی کوئی پریشانی لاحق نہیں۔“

شاہ بی بی نے بظاہر پرسکون انداز میں اچھی طرح ان کی طبیعت صاف کی تو معصومہ بد مزہ سی رخ موڑ گئیں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر صبر

شاہ اندر داخل ہوا تو سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔

”تم سب لڑکیاں باہر جاؤ۔ سیف علی جنگ بی بی سے ہی اسے ملے گا۔ لیکن کمرے میں جانے کے خیال سے ہی اسے ملے گا۔“ وہ شفق، صدف، زرناب اور اپنی بھتیجیوں سے مخاطب ہوا تو اس کی آمد کا سن کر زرناب کا دل بے اختیار ڈوب کر ابھرا۔ رات بھر کی پریشانی کیا کم تھی جو وہ صغیریت کا روپ دھارے گھر تک چلا آیا تھا؟

”کمال ہے۔ کل تک تو وہ آپ لوگوں کا دشمن تھا۔“ صدف نے طنزیہ انداز میں شوہر کی طرف دیکھا تو وہ خشکیوں سے اسے گھورنے لگا۔

”زیادہ فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں، جا کے کھانے کی تیاری کرواؤ۔ وہ کھانا ہمارے ساتھ کھائے گا۔“ اور صدف استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ زرناب اندر ہی اندر ہوتی صدف اور شفق کے ساتھ کچن میں چلی آئی جہاں کھانے کی تیاری کرتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل سیف علی جنگ میں اٹکا ہوا تھا۔

”کہیں وہ کسی سے کچھ کہہ ہی نہ دے۔“ مچھلی کو مسالا لگاتے ہوئے اس نے پریشانی سے سوچا۔ تب ہی فرج سے سلا کا سامان لے کر چلتی شفق کی نظر زرناب کے متھکر چہرے سے ٹکرائی تو وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

”کیا بات ہے زرناب، تم اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو؟“ اس کی آواز پہ جہاں زرناب نے سر اٹھایا تھا، وہیں صدف بھی ہاتھ روکے اسے دیکھنے لگی تھی۔ زرناب کا الجھا الجھا سا انداز وہ بھی کتنی دیر سے محسوس کر رہی تھی۔

”میرے سر میں درد ہو رہا ہے آپ۔“ اس کی کنپیاں واقعی بری طرح دکھ رہی تھیں۔

”تو جانو! جا کر لیٹ جاؤ۔“
”بس یہ مچھلی کا کام ختم کر لو تو جاتی ہوں۔“
”چھوڑو اسے۔“ شفق نے آگے بڑھ کے اس

کے سامنے سے پالہ اٹھا لیا تو وہ مسکراتی ہوئی ہاتھ دھو کر باہر نکل گئی۔ لیکن کمرے میں جانے کے خیال سے ہی اسے ملے گا۔ لیکن محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی لیے خاموشی سے زینہ طے کرتی وہ چھت پہ آگئی تھی جہاں رات کی رانی کی مہک میں ڈوبی ٹھنڈی ہوائ نے اس کے اندر تک تازگی بھر دی تھی۔ لمحہ بھر کو آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے اپنے تئیں ہوائے اعصاب کو پرسکون کرنا چاہا تھا لیکن نیچے لان سے بلند ہونے والے بھاری قہقہے نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔

وہ بے قراری سے آگے بڑھی اور لان کے وسط میں رکھی کرسیوں پہ اپنے بھائیوں کے ساتھ سیف علی جنگ کو براجمان دیکھ کر اس کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ احتیاط سے چلتی، ایک کونے میں، ریلنگ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ چھت پہ چونکہ اندھیرا تھا، اس لیے اسے اپنے دیکھ لیے جانے کا خدشہ نہ تھا۔ جبکہ نیچے لان میں نصب سنہری لیپ پوسٹس کی روشنی میں سیف علی جنگ کا ساحر وجود دھیمے دھیمے جگمگا رہا تھا۔

لائٹ گرے کاٹن کی شلوار قمیض میں وہ کالی پٹاوری چپل پہنے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ اس کا یا قوت کی انگلی سے سجا ہاتھ بے نیازی سے کرسی کے بازو پہ رکھا تھا۔

زرناب کی نگاہیں اس کا جائزہ لیتی اس کے چہرے پہ جا بھری تھیں۔ وہ آج پہلی بار اندھیرے کی اوٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے خدو خال کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور اسے اس کی وجاہت کا احساس بہت شدت سے ہوا تھا۔

سیدھی کھڑی ناک کے نیچے سیاہ گھنی مونچھیں اور بھری بھری سی فیشنی داڑھی اس کی سفید رنگت پہ خوب بچ رہی تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں صبور شاہ بہ جی تھیں۔ وہ بغور اس کی کوئی بات سن رہا تھا۔ یک لخت

زرناب کو اس کا انداز بہت جانا پہچانا سا لگا تھا۔ کہاں دیکھا تھا اس نے نظروں کا یہ ارتکاز؟ ذہن پہ زور دیتے ہوئے وہ قدرے آگے کوچھکی تھی۔ اچانک ہوا کا ایک شریر جھونکا آیا اور اس کے سرخ دوپٹے کا پلو اپنے ساتھ اڑا لے گیا تھا۔ زرناب نے گھبرا کے دوپٹا پکڑا تھا۔

تب ہی سیف کو، جس کا رخ زرناب کی طرف تھا، کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے چونک کر نگاہوں کا زاویہ بدلا تھا۔ زرناب کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ وہ سرعت سے پیچھے ہٹی۔ لیکن اگلے ہی بل اسے نارل انداز میں دوبارہ صبور شاہ کی طرف متوجہ ہوتا دیکھ کر اس نے بے اختیار سکھ کا سانس لیا تھا۔

یہ بے اختیاری اسے بہت مہنگی پڑ سکتی تھی اگر جو کوئی اسے دیکھ لیتا تو۔ وہ مزید چھت پہ رکنے کا ارادہ ترک کرتی نیچے چلی آئی تھی، لیکن اس کا ذہن سیف کی ذات کی وجہ سے کچھ عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ اپنے بیڈ پہ کروٹیں بدلتے کب اس کی آنکھ لگی اسے پتا نہیں چلا تھا۔

جلتی لائٹ میں وہ گہری نیند سو رہی تھی جب موہاٹل کی مسلسل ہونی بتل پہ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ کمرے میں موجود روشنی نے اس کے لیے آنکھوں کو کھولنا مشکل بنا دیا تھا۔ بے اختیار اپنا ہاتھ آنکھوں پہ رکھتے ہوئے اس نے بنا نمبر دیکھے کال ریسیو کر لی تھی۔

”ہیلو“ اس کی خمار آلود آواز دوسری طرف موجود منظر سماعتوں سے ٹکرائی تو اک دھیمی سی مسکان بھرے بھرے لیوں کا احاطہ کر گئی۔

”ہماری نیندیں چڑا کر وہ خود سو رہے ہیں۔۔۔۔۔ اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا!“ جانی پہچانی سی گھبرا آواز زرناب کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کی ساری نیند بھک سے اڑ

گئی۔ اس کی خاموشی پہ اپنی کھڑکی میں کھڑا سیف مسکرا دیا۔

”اس وقت میری نگاہوں کے عین سامنے چودھویں کا چاند ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ شاید یہ منظر بھی اتنا خوبصورت نہیں جتنا کہ کسی آجکل اڑنے کا وہ لمحہ حسین تھا۔“ اور زرناب کے اعصاب کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی تھی۔

”آپ کیا بھی نہیں، میرا چاند میرے روبرو ہو گا اور مجھے پتا نہیں چلے گا؟“ وہ محبت پاش لہجے میں بولا تو زرناب کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

”کوئی اور وقت ہوتا مادام! تو آپ کو اپنے روبرو پہنچ لاتا لیکن اس وقت تو بس۔۔۔۔۔ ہم بس دیے ہم چپ رہے منظور تھا پردہ تیرا۔“ وہ دل نشین سی ہنسی ہنسا تو زرناب کو لگا جیسے اس کا دل سینے کی دیوار توڑ کے باہر آ جائے گا۔

وہ اس پر یہ کیسا سحر طاری کر رہا تھا؟ کن جذبوں کو جگا رہا تھا؟ اس نے اپنے خشک پڑتے لیوں پہ زبان پھیری۔

”میری زندگی میں ایسی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں اے ایس پی صاحب۔“ وہ بولی تو آواز میں لرزش واضح تھی۔

”آپ کی زندگی میں تو ان تلخیوں کی بھی گنجائش نہیں تھی زرناب! جنہیں آپ آج تک سہتی رہی ہیں۔“ وہ دل گرفتہ سا مسکرایا تو زرناب بے اختیار چوٹ گئی۔

”کن تلخیوں کی بات کر رہے ہیں آپ؟“
”ہر اس اذیت، اس رسوائی کی بات کر رہا ہوں جو برادری آپ کا مقدر بنا دی گئی۔“

اور زرناب کا پورا وجود بھک سے اڑ گیا۔ یعنی اس کی بدنامی کی داستان یہاں بھی پہنچ چکی تھی۔۔۔۔۔ دھواں دھواں چہرہ لیے زرناب کا دل چاہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

”اوہ! اب سمجھی! آپ مجھے کوئی آسان مارگت سمجھ رہے ہیں۔“ وہ زہر خند سا بولی تو سیف کے دل پہ اک گھونسا سا لگا۔

”میرے جذبوں کی اس درجہ عزت افزائی کے لیے بہت شکریہ!“ وہ لب بھینچ کر بولا تو زرناب جیسے پھٹ پڑی۔

”کون سے جذبے؟ وہ جو محض دو اتفاق ملاقاتوں کی بنا پر راتوں رات آگ آئے ہیں؟“ اس کا ہنک آمیز انداز سیف علی جنگ کا چہرہ سرخ کر گیا۔

”یہ جذبے کتنی بے خواب راتوں کا ثمر ہیں اگر آپ کو پتا لگ جائے تو شاید آپ سانس بھی لینا بھول جائیں، زرناب نظر حسین شاہ!“ وہ انتہائی سخت لہجے میں بولا تو زرناب کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ یکا یک اس کے ذہن میں نگاہوں کا وہ جانا پہچانا سارنگاز جاگا تو وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔

”کک۔ کون ہیں آپ؟“

”افسوس۔ یہی تو فرق ہے آپ میں اور مجھ میں۔ میں نے آپ کو آپ کی خوشبو سے پالیا تھا اور آپ مل کر بھی انجان رہیں۔ خیر جانے دیجیے۔ بس اتنا جان لیں کہ اب میں مزید کوئی دکھ آپ کا مقدر نہیں بننے دوں گا۔ آپ میرے لیے قابل احترام تھیں، ہیں اور رہیں گی لیکن یہ بھی ایک اہل حقیقت ہے کہ آپ اس کم نسل کی نادانی کا وہ خواب ہیں جسے وہ سمجھی خود سے بھی بیان کرنے کی جرأت نہ کر سکا تھا مگر جسے دھندلانے کی طاقت نہ تو فاصلوں میں تھی اور نہ ہی ماہ و سال کی گردش میں۔“

اور زرناب کو لگا تھا جیسے اس کی نگاہوں کے سامنے سے کوئی پردہ اٹھ گیا ہو۔ نیلی آنکھوں کا وہ ارتکاز اگر محض سیاہ آنکھوں سے بدل دیا جاتا تو وہ..... وہ.....

”مصطفیٰ!“ اس کے ہونٹوں سے سرگوشی کی صورت ایک نام ٹوٹ کر ہوا میں بکھرا تو دوسری طرف

موجود شخص کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پوست ہو گئے۔ زرناب متوحش سی سیدھی ہوئی۔

”آپ۔ آپ۔ آپ مصطفیٰ عبد اللہ ہیں ناں؟“ لیکن دوسری جانب سے جواب دیے بنا رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ زرناب نے تیزی سے کال لاگ نکالتے ہوئے اس نمبر پہ دوبارہ کال ملائی تھی لیکن نمبر بند جانے کی اطلاع نے اس پہ وحشت طاری کر دی تھی۔

”یہ..... یہ مصطفیٰ ہے؟“ دیوانہ وار کمرے میں چکراتے ہوئے اسے خود کو یقین دلانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی رنگت لٹھے کی مانند سفید پڑ گئی تھی۔

”نہیں۔ ایسا۔ ایسا نہیں ہو سکتا!“ وہ غڈ حال سی بیڈ پہ آگری تھی۔ آنے والی قیامت کا خوف اس پہ عفریت بن کے سوار ہونے لگا تھا۔ دل سینے کی گہرائیوں میں ڈوبا تو پھر ابھرنے سے قاصر رہا تھا ہر چیز اچانک اندھیرے کا حصہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

راکنگ چیئر پہ جھولتا اس کا وجود ملال بھری خاموشی میں ڈوبا تھا۔ بے اختیاری کا وہ لمحہ کب کا بیت چکا تھا مگر سیف علی کا پچھتاوا کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ احساس کہ انجامے میں اس کے انکشاف نے زرناب پہ کیسا غضب ڈھایا ہوگا، اسے ندامت سے چور کیے دے رہا تھا۔

وہ زرناب پہ اپنی حقیقت بھی اس طرح سے نہیں کھولنا چاہتا تھا لیکن اپنے جذبوں پہ اتنی بڑی تہمت سن کے وہ جیسے خود پر سے اختیار کھو بیٹھا تھا۔ غصہ، کج عقل پہ حاوی ہوا تھا تو مصلحت کا دامن اپنے آپ پہ سے چھوٹ گیا تھا اور وہ جو کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا، آن کی آن میں اپنی پہچان پر پڑا پردہ اٹھا رہا تھا، جو اس نے بہر کیف ان لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے نہیں ڈالا تھا۔ بلکہ جس طرح مصطفیٰ عبد اللہ اس کا تھا بالکل اسی طرح سیف علی جنگ اس کا حال تھا۔ بات تھی کہ اپنے حال سے ماضی تک کا یہ سفر دوبارہ

نے یوں ہی بنا کسی مقصد کے طے نہیں کیا تھا۔

اسے آج بھی وہ کڑا وقت بہ خوبی یاد تھا جب اجڑا دل اور زخمی جسم لیے اس کا سارا سفر روتے اور بخار میں پھٹتے گزرا تھا۔ وہ جیسے اپنے آبا کے ساتھ ساتھ خود سے بھی ناراض ہو گیا تھا۔ اور اس ناراضی میں وہ دنوں زندگی سے بیزار اپنے بستر پہ پڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی پریشانی سے غڈ حال اس کے باپ کو دمے کا شدید ایک ہوا تھا۔ اپنے آبا کو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا دیکھ کر وہ جیسے تڑپ اٹھا تھا۔ اس کی بے نیازی اور خود اذیتی کا خول چٹخ گیا تھا۔ اور تب اسے اپنے محسن، عثمان علی جنگ کی نیکی اور اچھائی کا اندازہ ہوا تھا۔

عثمان علی جنگ کون تھے اور شاہ صاحب نے ان باپ بیٹے کے لیے ان کا انتخاب کیوں کیا تھا وہ نہیں جانتا تھا لیکن ان کی عظمت اور اچھائی نے بہت جلد مصطفیٰ پہ پیر نظر حسین شاہ کے اس انتخاب کی وجہ واضح کر دی تھی۔

لاہور پہنچنے پہ عبد اللہ کا سامنا عثمان صاحب سے ہونے والا تھا، یہ اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ وہی عثمان تھے جنہوں نے کسی زمانے میں شاہ صاحب کے مصاحبین میں ایک سکھ نو جوان کو پا کے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا۔

گو کہ عبد اللہ کے علم میں یہ واقعہ نہیں تھا، لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ شاہ صاحب کے یہ مرید جب بھی نور والال آتے تھے، اس سے خصوصی محبت سے پیش آتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی آمد میں کمی آہوتی گئی۔ لیکن جب اس نے کبیر سے عبد اللہ تک کا سفر طے کیا تھا، تب وہ خاص طور پہ اسے مبارک باد دینے کے لیے شہر سے گاؤں آئے تھے اور آج وہ انہیں اتنے سالوں بعد ان نامساعد حالات میں اپنے روبرو پا کے خوش گواری حیرت میں گھر گیا تھا۔

عثمان علی ان باپ بیٹے کے ساتھ بہت محبت

سے پیش آئے تھے۔ شاہ صاحب نے ان دونوں کے بارے میں انہیں کیا بتایا تھا کیا نہیں، وہ نہیں جانتے تھے، مگر عثمان صاحب نے مصطفیٰ کی زخمی حالت عبد اللہ کے نادم چہرے، کسی چیز کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

انہوں نے بس ان دونوں کو اس نئے ماحول سے مانوس ہونے کے لیے مکمل طور پہ ان کے حال پہ چھوڑ دیا تھا اور جس روز مصطفیٰ نے خود اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اس دن انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اور ایسی شفقت سے تھاما تھا کہ اسے حکم ربی سے ذرے سے آفتاب بنا دیا تھا۔

وہ شہر کے ایک نامی گرامی ادارے میں تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اور انہوں نے اسی کالج میں مصطفیٰ کا داخلہ کروا دیا تھا۔ ان کے اس فیصلے نے مصطفیٰ پر بے یقینی کی کیفیت طاری کر دی تھی، کالج میں تعلیم حاصل کرنا اس کی دیرینہ آرزو تھی جو اس طرح سے پوری ہونا تھی، اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ تقدیر کی اس کا یا پلٹ پہ حیران ہوتے نہ تھکتا تھا۔

اس کی حفاظت کو ذہن میں رکھتے ہوئے عثمان علی جنگ نے کالج میں اس کا تعارف مصطفیٰ کے لفیل کی حیثیت سے کروایا تھا۔ اور اس نئی پہچان کے مد نظر اسے مصطفیٰ سے سیف علی جنگ کا نام دیا تھا۔ اس نئی پہچان نے مصطفیٰ کی اپنے ماضی سے جڑی آخری ڈور کو بھی کاٹ دیا تھا۔ اب وہ ایک نئے آسمان پہ پرواز کرنے کے لیے بالکل آزاد تھا۔

☆☆☆

دن مہینے اور مہینے سالوں میں بدلنے لگے تھے اس دوران سیف کی روح پر لگے زخم مندمل ضرور ہوئے تھے لیکن بھرے نہیں تھے۔

مگر گزرتے وقت نے اسے ہمت کے ساتھ

مکراتا سکھا دیا تھا۔ اس کی اس مسکراہٹ میں ایک اخصہ بیگم عثمان کا بھی تھا۔ جو اسے اپنی اولاد کی روح چاہنے لگی تھیں۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی محض وہ برس میں کینسر کے باعث ہونے والی موت کے لئے ان کی سسکتی ہوئی ماما کے لیے سیف کا وجود کسی سے کم نہ تھا۔ اسے اپنے گھر میں پا کے انھیں نے لگا تھا جیسے ان کا روی واپس آ گیا ہو۔ ان کے وہ تن میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی اور یوں وہ کب کی امی اور عثمان صاحب اس کے بابا بن گئے تھے سے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

اپنے رب کی اس درجہ مہربانیوں پر عبد اللہ اپنے حق و مالک کا شکر ادا کرتے نہ تھکتا تھا اور اپنے محسن سید نظر حسین شاہ کے لیے بھلائی اور خیر کی دعائیں لگتے اس کی زبان نہ سوکتی تھی مگر اس کا دل رہ رہ کر مٹی کے لیے ہمکتا تھا۔ اپنے باپ کی اس خاموشی سے سیف انجان نہ تھا مگر اس کے پاس اندر ہی رگڑنے کے سوا اس بات کا اور کوئی حل نہ تھا۔

تین سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزرا تھا۔ اس ان عبد اللہ کی منت سماجت پر عثمان علی نے دو تین سیف سے چھپ کر اس کی بات شاہ صاحب سے والی تھی۔

شاہ صاحب کو مصطفیٰ کی پڑھائی میں لگن اور انثر

باپ کی موت سیف کے لیے گہرا صدمہ تھی لیکن عثمان صاحب و بیگم عثمان کے محبت بھرے سہارے نے اسے جلد ہی سنبھال لیا تھا۔ وہ ان کے مزید قریب آ گیا تھا اور ایک دن اس نے اپنے دوست جیسے بابا کے سامنے اپنا دل اور اس دل میں دن زرناب نظر حسین شاہ کی گم گشتہ محبت کو کھول کر رکھ دیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا وہ راز تھا جس سے اس کا سرگام باپ بھی ناواقف تھا۔ اس کی معصوم محبت کو ملنے والی سزا نے عثمان صاحب کو بھی دل گرفتہ کر دیا تھا مگر وہ اس معاملے میں ملحد طور پر بے بس تھے۔

زرناب شاہ کس حال میں تھی وہ اس بات کا پتا کسی طور نہیں لگوا سکتے تھے۔ انھیں سیف کی بہتری اسی میں لگی تھی کہ وہ ماضی سے جڑی اس محبت کو ہمیشہ کے لیے بھلا دے اور خود کو تکلیف پہنچانے والوں کو معاف کر دے مگر سیف نے اپنے اور اپنے باپ کے ساتھ ہوئی کسی بھی زیادتی کو معاف کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ عمل اس کے حوصلے سے باہر کی بات تھی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تھا۔ اور ایک دن پیر سید نظر حسین شاہ کے انتقال کی خبر آئی تھی۔ سیف کے اندر ویرانی سی بھر گئی تھی۔ اس کے دل میں آج تک آخری وقت میں ان سے اپنی ناراضی اور نہ ملنے کا ملال قائم تھا جو اس خبر کے بعد عمر بھر کی کک اور ندامت میں ڈھل گیا تھا۔ اسے ان کے آخری دیدار کی خواہش بڑی شدت سے تھی مگر وہ عثمان صاحب کے ساتھ گاؤں نہ جاسکا تھا اس لاچارگی نے اس کے اندر غم و غصہ کی ایک نئی لہر۔ جنگا دی تھی۔ سر اٹھا کر نوراں والا لوٹنا اب اس کا عزم بن گیا تھا۔

آئی آر میں ماسٹرز کرنے کے بعد اس نے اسی مضمون میں ایم ایس کیا تھا اور پھر مقابلے کے امتحان کی تیاری کے لیے مختلف کلاسز جو آن کر لی تھیں۔ دو سال کی ان تھک محنت اور تیاری کے بعد جب اس نے امتحان دیا

تھا تو شان دار کامیابی نے اس کے قدم چومے تھے، اسے اس کی مرضی کا ڈیڑھ گھنٹہ ملا تھا۔ وہ دن سیف علی جنگ کی زندگی کا خوش گوار ترین دن تھا جب اس نے ٹریننگ کے لیے اکیڈمی میں قدم رکھا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اس نے نور والاں اور اس سے متعلق شخصیات کے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کی تھیں اور یوں جب تعیناتی کا وقت آیا تھا تو اس نے خود کہہ کر گاؤں نور والاں اور اس سے ملحقہ علاقے کا چارج مانگا تھا۔

اس کی درخواست نے افسران بالا کو حیران کر دیا تھا۔ دور افتادہ گاؤں میں تعیناتی بھلا کس کی خواہش ہو سکتی تھی؟ مگر اس کے کچھ کر دکھانے کے جذبے نے انھیں متاثر کیا تھا۔ اس کی درخواست قبول کر لی گئی تھی۔

سیف خوشی سے سرشار ہوا تھا تھا۔ یہ اس کا اپنے مقصد کی راہ میں پہلا پڑاؤ تھا۔ عثمان علی اس کے ساتھ تھے مگر بیگم عثمان کو سمجھانا ایک دشوار مرحلہ تھا۔ وہ کسی طور سیف کو ان ظالم لوگوں کے درمیان بھیجنے کو تیار نہ تھیں۔ سیف نے عثمان صاحب کے ساتھ مل کر بہت مشکل سے انھیں قائل کیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے پچھان لیے جانے کا دھڑکا انھیں خوف زدہ کیے ہوئے تھا، حالانکہ اب یہ اتنا آسان نہ رہا تھا۔

سیف جس وقت نور والاں سے آیا تھا تو چودہ سال کا ایک دبلا پتلا سالک تھا جس کی میسں ابھی بھیگ رہی آئی تھیں اور اب وہ تیس برس کا ایکٹ بھر پور توانا مرد تھا جس کا مضبوط جسم دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی بھری بھری سی فیشی داڑھی اور گھنی مونچھیں اس کی وجاہت اور رعب میں اضافے کا باعث تھیں۔ اعتماد سے بھرپور شخصیت اور عہدہ اسے کہیں سے بھی اس غریب عبد اللہ کا بیٹا نہیں ظاہر کرتے تھے۔ جو انتہائی کمپرسی کی حالت میں نور والاں سے نکلا تھا۔ مگر بیگم عثمان کے خدشے کسی طور کم ہونے میں

نہیں آتے تھے۔ ان کی تسلی کے لیے سیف نے غیلے لینز کا سہارا لیا تھا، جس کے بعد اس کا چہرہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ بالآخر بیگم عثمان کو اسے رخصت کرنا ہی پڑا تھا۔

سولہ سال بعد اپنے گاؤں کو لوٹے راستوں پہ سفر کرتے ہوئے اس کے دل کی کیفیت عجیب تھی۔ بچپن کی یادیں، بے بے کا چہرہ، باپ کی انمول محبتیں، دوستوں کا ساتھ اور بیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں..... کیا کچھ نہ چھوٹا تھا ان راستوں پہ۔ سفید حویلی، پیر نظر حسین شاہ کا پر نور وجود، اس کے دل پہ دستک دیتی اس کی اولین محبت اور اس محبت سے جڑی رسوائی، جدائی۔۔۔۔۔ سیف کے نقصانات کی فہرست طویل تھی اور اسے درد پہنچانے والے بے خبر!!

زرناب نظر حسین شاہ کو دیکھنا تو اب اس کے نزدیک ناممکنات میں سے تھا، اس کے اندازے کے مطابق تو وہ بہت پہلے ہی سفید حویلی سے رخصت ہو چکی تھی۔ اور شاید یہی ان دونوں کے حق میں بہتر بھی تھا۔

ان گزرے دو سالوں کی تحقیق نے سیف پہ کچھ واضح کیا تھا۔ آج کے۔۔۔ نور والاں میں اور ماضی کے نور والاں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہاں اب صرف دولت اور طاقت کا راج تھا۔ نہ خدا خونی رہی تھی اور نہ انسانیت۔ قانون دونوں حویلیوں کے مردوں کے پاؤں کی جوتی بن چکا تھا اور یہاں بسنے والے ان کی رعایا۔ ایسے میں سید بختیار حسین شاہ اور اس کے بھائی بندوں کا احتساب سیف علی جنگ کا اخلاقی اور قانونی فرض بن چکا تھا اور اپنے فرض کی ادائیگی میں وہ کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتنے والا تھا۔

نور والاں میں اس کی اچانک آمد نے ہلچل مچا دی تھی۔ مالکوں کے ہاتھ پاؤں پھولے تھے تو صبور حسین شاہ دھمکی میں لپٹی دوستی کا پیغام لیے اس کے

مقابل آکھڑا ہوا تھا۔ ایک عرصے بعد اپنے مجرم کو اپنے روبرو پا کے سیف کے جسم کی ہر گت گئی تھی۔ چشم زدن میں وہ ملازموں سے بھرے اس محن میں جا کر اٹھا جہاں وہ تھا اور اس شخص کے جوتے کی ضرب سیف کے اندر حشر برپا ہو گیا تھا مگر وہ ان باتوں کو فی الحال نظر انداز کر کے اپنے محن پر نظر حسین شاہ کے مزار پہ چلا آیا تھا۔ پھر جیسے لمبے کے ہزاروں حصے میں نارسائی کی سزا سمیٹ لی گئی تھی۔ وصل کا اذن اتر ا تھا اور زرناب نظر حسین شاہ پورے بارہ سال بعد اس کے روبرو آکھڑی ہوئی تھی۔ آن کی آن میں اس نے اسے پہچان لیا تھا۔

سیف اگلا سانس لینا بھول گیا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح راہ میں کھڑا اسے تکتا رہ گیا تھا اور وہ ہوا کے جھوکے کی مانند اس پہ نگاہ غلط ڈالے بنا وہاں سے نکل گئی تھی۔ شیم کی زبانی یہ جان کر کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے ایک لمحہ کے لیے وہ سانس لینا بھول گیا تھا۔ اس کی محبت اس کے ساتھ تھی۔ اس کے پاس تھی۔

عثمان صاحب اس کی جانب سے اطلاع پا کے بے طرح خوش ہوئے تھے۔ انھوں نے سیف کو ہمت اور سمجھ داری سے کام لینے کی تاکید کرتے ہوئے ہر طرح کی جلد بازی اور جذباتیت سے پرہیز کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اس کی جان کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ان کی بات نے سیف کے حواس کو سنبھالا دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ شیم کی زبانی یہ جان کر کہ زرناب ابھی تک غیر شادی شدہ ہے ساری صورت حال بدل گئی تھی۔ اور اس بدلی ہوئی صورت حال نے سیف کی ترجیحات کو بھی یکسر بدل ڈالا تھا۔

بدلتے حالات نے سیف کو ایک نیا لائحہ عمل سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے اپنی محبت کو پانا تھا مگر اس کا فرض اس کی اولین ترجیح تھا تب ہی اس نے

ذاتی نفع نقصان سے بالاتر ہو کر اسکول کی عمارت میں ایک عرصے سے قائم ناجائز باڑے کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ لیکن رد عمل میں سید بختیار حسین شاہ کے مصاحبتی انداز نے اسے نہ صرف چونکا دیا تھا بلکہ ان کی دعوت قبول کرنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔

اس کا وہاں جانا انجانے میں ہی سہی لیکن گزرے ماہ و سال کے کچھ بھید اس پہ کھول گیا تھا۔ ہاشم شاہ کے منہ سے، اپنے حوالے سے

زرناب کے کردار سے منسوب داستان سن کر وہ ساکت رہ گیا تھا۔ وہ ابھی تک اس کے نام کی بدنامی جھیل رہی تھی۔ اس اعصاب شکن حقیقت نے اسے پتھر کے رکھ دیا تھا۔ تمام رات آنکھوں میں کٹی تھی اور اگلی صبح جیسے اس کے درد کا درماں لیے اتری تھی۔

زرناب شاہ، پہلی مرتبہ کی طرح اس بار بھی، ہوا کا جھونکا بنی از خود اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ اور وہ اپنی دعاؤں کی اس قبولیت پہ حیران رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت ان دونوں کے درمیان حائل رکاوٹوں اور فاصلوں کو خود سمیٹنے پہ اتر آئی تھی۔ جب ہی تو زرناب اس کے گھر تک چلی آئی تھی پھر چاہے بہانا کچھ بھی بنا تھا۔

بی بی حوراں اور شاہ بی بی کو ایک مدت بعد اپنے روبرو پا کے سیف کا دل جذبات سے بھر آیا تھا۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جنھوں نے اس کی ماں کے گزر جانے کے بعد اسے اپنی مامتا کی چھاؤں عطا کی تھی۔ وہ ان کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ مگر مجبوری تھی کہ وہ فی الحال انہیں اپنی پہچان نہیں کروا سکتا تھا۔ اسپتال میں اس کی بی بی حوراں کے لیے کی گئی بھاگ دوڑنے زرناب کے چہرے پہ عجیب الجھن بھری کیفیت بکھیر دی تھی مگر وہ اس کی حیرت کو نظر انداز کیے اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔

واپسی کا تمام راستہ زرناب شاہ کا خیال اس کے ساتھ رہا تھا۔ اس نے بنا کسی پس و پیش کے شیم

سے زرناب کے کردار کے حوالے سے سوال کیا تھا اور پھر جیسے ماضی کا کوئی درپچہ کھل گیا تھا۔

شیم ایک ایک کر کے زرناب کو لگنے والا ہر زخم ہر دکھ بیان کرتی۔ گئی تھی اور سیف لب بستہ سا زرناب کے وجود پہ برسنے والے، اپنے نام کے سنگ ریزوں کو پھتار رہ گیا تھا۔ پیر سید نظر حسین شاہ نے اس کا مستقبل تو محفوظ ہاتھوں میں سوپ دیا تھا لیکن اپنے جگر کے کھڑے کو نام نہاد اپنوں کی سازشوں سے محفوظ نہ رکھ پائے تھے۔ ان کی یہ ہار سیف کی آنکھیں نم کر گئی تھی۔ پھر وہ جیسے ایک نئے عزم سے میدان عمل میں اتر آیا تھا۔

معصومہ سے اس کا گناہ منوانے کا عزم، ہاشم کی گندی پہنچ سے زرناب کو بچانے کا عزم، بختیار اور صبور کی آنکھیں کھولنے کا عزم اور زرناب نظر حسین شاہ کو اپنا بنانے کا عزم!

اس نے اگلے ہی روز بختیار شاہ کو کال کر کے اپنے آفس بلوایا تھا اور اس کے دوستوں میں شامل ہونے کا فیصلہ سن کر اسے حیران کر دیا تھا۔ سیف نے ان کی صفوں میں گھس کر انھیں شکست دینے کا ارادہ باندھا تھا، پھر چاہے اس میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جاتی مگر وہ اب تند ہوا کا ایک جھونکا بھی زرناب کی طرف نہیں آنے دینے والا تھا۔

اپنے اسی عہد کا اقرار جب اس نے فون پہ زرناب کے سامنے کیا تھا تو وہ پھٹ پڑی تھی۔ بات بڑھی تھی تو بڑھتی چلی گئی تھی اور وہ طیش کے عالم میں اپنی اصلیت اس پہ کھول گیا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ دوسری طرف زرناب کا کمزور وجود جیسے کسی زلزلے کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کے لبوں سے بکھرتا ہوا اپنا نام سیف کے لیے جان لیوا تھا۔ وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہ رہا تھا۔

مگر اب اس جذباتی ریلے کے گزر جانے کے بعد وہ اپنی اس نادانی پہ بری طرح پچھتا رہا تھا۔

لیکن متواتر ہوتی بیل کے باوجود جب اس کا فون نہیں اٹھایا گیا تو اس کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

”مجھے یہ سزا نہ دینا زرناب!“ بے تابی سے کال کاٹتے ہوئے اس نے تیسری بار نمبر ملا دیا تھا اور اس مرتبہ بھی وہی جواب پا کر سیف کا ضبط جیسے ختم ہو گیا تھا۔ غصے سے پاگل ہوتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ پوری طاقت سے کھڑکی کے شیشے پہ مارا تھا جو ایک چھناکے سے ٹوٹ کر زمین پر بکھر گیا۔ رات کی تاریکی میں شیشہ ٹوٹنے کی آواز دل دہلا دینے والی تھی۔ گیٹ پہ موجود چوکیدار بری طرح ڈر کے اچھلا اور اگلے ہی لمحے وہ سنبھل کر گھر کے رہائشی حصے کی جانب بھاگا تھا۔

”صاحب! صاحب جی!“ اس کی آواز یں خاموشی میں گونج رہی تھیں مگر سیف علی جنگ تو جیسے خود سے بھی بیگانہ ہو گیا تھا۔ اس کی ہتھیلی بری طرح کٹ گئی تھی اور انگلیوں میں کالج کے کھڑے چھگنے تھے۔ خون کی دھارا اس کے ہاتھ سے ہوتی آستین اور دامن کو رنگین کر رہی تھی لیکن اسے اس بات کا احساس تک نہ تھا۔ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خاتین ڈائجسٹ

گی لہری

بہنوں کیلئے خواہش مند ناول

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، ملہ بلاک، کراچی

ایمل رضا کادہ دلہا کی

ایما جی بڑی پراسرار خاموشی لیے..... نوم کے پرانے لیکن آرام دہ صوفے پر نیم دراز اپنے چاروں بیٹوں اور بیٹیوں کی صحبتیں سن رہے تھے۔ نی دی موڑ، انٹر چینج کی اٹھل پھل ہوئی بھی تو اندر کے پر بڑی مدھم آواز میں کوئی گیت چل رہا تھا اور ابا اس گیت کو سنتے سنتے کم ہونے لگے تھے۔

ساتھ سالہ نجیف ابا جی ساری زندگی گوتم بدھ کا آسن جمائے خاموش، جامد، آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے تھے۔ چار بیٹوں اور بیٹیوں کو باری باری گھر کا کیا..... بیوی مری..... پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں پیدا ہوئیں..... لیکن کوئی شیطان بن کر نہ آیا اور نہ ہی ابا جی نے اپنی بند آنکھیں کھولیں.....

یہ زندگی درویشی کا چولا پہنے ابا جی پوری حیاتی ریڑ کی پٹری کی طرح ناک کی سیدھ میں چلتے رہے۔ کسی دی موڑ، انٹر چینج کی اٹھل پھل ہوئی بھی تو اندر کے مسافروں کو خبر نہ ہونے پائی۔ ابا جی وہ بت تھے جس میں نہ جان ڈلی جا سکتی تھی نہ دیکھ کر سراہا جاسکتا تھا۔

لیکن دو سال پہلے اسکوٹر کے ایک ایکسیڈنٹ نے ان کی پوری زندگی — کو بدل کر رکھ دیا۔ ان کے ساتوں بچوں کی زندگیوں کی اس سے بھی زیادہ ساتوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ پلستہ چڑھے بازو جب حرکت میں آئیں گے تو ان کے گلے دبائے تک ہی آجائیں گے۔

ناولٹ



اباجی اپنے دوست عباس سے مل کر آ رہے تھے کہ راستے میں پتا نہیں وہ کون سا ٹویا تھا جو اباجی کو نظر ہی نہ آیا شاید اب واقعی ان کی نظر چشمہ لگنے کے باوجود بھی کمزور ہونے لگی تھی۔ اسکوٹر کا ایک پہیہ تو اسی ٹوے میں پھنسا رہ گیا اور اباجی خود دو فرلانگ دور جا کرے۔ سر، بازو، ٹانگوں اور کمر پر شدید چوٹیں آئیں۔ ڈاکٹر نے خطرے کا الارم بجادیا۔ پٹری اور لندن والی دونوں بیٹیاں بھی روتی ہوئی آ گئیں۔ بڑے بیٹے سجاد نے ڈھکے چھپے لفظوں میں فون پر ہی ان دونوں کو دل مضبوط کر لینے کی تلقین کر دی تھی۔ دل تو مضبوط ہوئے ہی ساتھ ارادے بھی کئے ہو گئے۔ ساتوں بہن بھائی گھر کے علاوہ اسپتال میں بھی ہر وقت اکٹھے رہنے لگے۔ ڈیوٹیاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ سارے ادھ موئے ہو کر چڑ سے گئے تھے۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے دیتے اور ایک دوجے کا کام اپنے سر لیتے لیتے سب ہی سوڑے کے پھل کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ پھر جب اباجی کی طبیعت کسی صورت سمجھنے میں نہ آئی تو ساتوں نے اسپتال کے لاؤنج میں بیٹھ کر آنے والے غم اور ابدی جدائی پر دل کھول کر ماتم کر لیا اور باتوں باتوں میں ساری جائیداد کو آپس میں بانٹ بھی لیا۔

”نمن آباد والی دکان میں لوں گا۔۔۔۔۔ وہاں ورکشاپ کا کام بہت چل نکلا ہے۔“ دوسرے نمبر والے بلال نے کہا۔

”سنت مگر والا مکان مجھے دے دیجیے۔“ دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود بھی سر پر دو پونیاں کیے رابعہ نے کہا اور پھر سب بھی بتایا۔

”امی مگر بھی وہاں ہیں۔۔۔۔۔ اور مجھے اب ان کے ساتھ رہنا ہے۔“ ویسے اس حلیے میں رابعہ پر اداسی چھٹی نہ تھی۔

”میں یہاں جائیداد لے کر کیا کروں گی۔۔۔۔۔“ لندن والی ساتوں میں سب سے چھوٹی فرح بولی۔

”مجھے تو آپ انشورنس کے بیس لاکھ دے دیجیے گا۔“ مطالبہ پیش کیا گیا۔

یوں جس جس کو جو پسند تھا ایک دوسرے کو بتا دیا گیا۔ کسی نے دوسرے کے حق اور پسند پر ڈاکا نہ ڈالا نہ ہی شب خون مارنے کی جسارت کی۔

”چلو یہ بھی اچھا ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ کام جس میں سالوں مقدمہ بازی ہوتی رہتی ہے، ہم نے نہایت اطمینان اور بھائی چارے کی فضا میں کر لیا۔“ بڑے سجاد نے اختتام پر مسکراتے ہوئے کہا۔ جیسے باتوں کی مہروں کے ساتھ ساتھ رجسٹریاں بھی ان کے نام ہو گئی ہوں۔

”اس میں اماں جی کی تربیت کا ہی ہاتھ ہے بھیا جی۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ اللہ جنت نصیب کرے، وہ تو خود اپنے شوہر کے ہاتھوں۔۔۔۔۔“ رو دینے والے انداز میں رافیہ نے کہا تو سب کو چپ لگ گئی۔

”نہ رو رافیہ۔۔۔۔۔ اماں نے مرتے وقت معاف کر دیا تو ہم کون ہوتے ہیں، بات کرنے والے۔“ طلال کی نصیحت سب کو بھاگ گئی۔

گھنٹے بھر بعد ڈاکٹر جب کمرے سے باہر نکلا تو وہ سب جو ڈاکٹر کے سر کو ”نان“ کے انداز میں ملنے اور کانوں کو ”آئی ایم سوری“ کے الفاظ سننے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر کے چہکنے کو سمجھ نہ سکے۔ ڈاکٹر بھی شاید میڈیکل سے پہلے تھیٹر ویٹر کا شوقین رہا تھا۔ پہلے تو پوری بیٹی باہر نکالی پھر کمیٹی نکل جانے کے سے انداز میں بولا۔

”مبارک ہو۔۔۔۔۔ اباجی کو ہوش آ گیا۔۔۔۔۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔“

”اباجی۔۔۔۔۔؟“

ڈاکٹر مسخرہ ہونے کے ساتھ ساتھ کانیاں، خوشامدی اور مطلبی بھی تھا۔

ساتوں بہن بھائیوں نے زبردستی زبردستی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔ جس نے سجنے میں میک اپ سے بھی زیادہ وقت لیا پھر گھر میں انتظار کی

گھڑیاں گنتے شوہروں، بیویوں کو فون کر کے اس ”معجزے“ کی نوید سنا دی گئی۔ قدرت نے گویا شمشیر گولی دکھا کر دوبارہ چھین لی تھی۔ سب کے منہ سالوں سے استعمال ہوتی چوٹی کی طرح سکڑ سکڑ گئے تھے۔

دو دن بعد مسخرے ڈاکٹر نے اباجی کو چھٹی دے دی۔۔۔۔۔ اور چلتے وقت۔۔۔۔۔ بالکل ایسے۔۔۔۔۔ بالکل ایسے ہی کہہ دیا تھا۔

”چار دن کی تو زندگی ہے اباجی۔۔۔۔۔ خیال رکھا کریں اپنا۔۔۔۔۔ نمیں، بولیں، خوش رہا کریں۔۔۔۔۔ گھومیں پھریں۔۔۔۔۔ سیر کریں۔“

بڑے سجاد کو اس فقرے کی ذرا سی۔۔۔۔۔ ذرا سی نزاکت کا بھی خیال ہوتا تو اسی وقت ڈاکٹر کی گردن تن سے جدا کر دیتا۔۔۔۔۔ لیکن ان ساتوں میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ چار دن کی زندگی اب ان کی اپنی زندگیاں دو دن بلکہ ایک آدھ گھنٹے کی کرنی والی ہے۔

گھر آ کر کرمو نے اباجی کو نہلایا، دھلایا، پرانے کپڑے اتار کر نیا سوٹ پہنایا تو اباجی میں جیسے نئی زندگی سرایت کر گئی اور خود کرمو میں بھی۔

اب یہ کرمو کون تھا۔۔۔۔۔؟؟؟

مالی کا بھتیجا۔۔۔۔۔ جو پندرہ سال پہلے اس گھر میں آیا تھا۔ تب بچہ تھا، معصوم تھا۔۔۔۔۔ محنت اور لگن سے کام کیا تو سب کے دل جیت لیے۔۔۔۔۔ اباجی کا کچھ زیادہ ہی جیت لیا۔۔۔۔۔ اسی لیے باقی سب کا دشمن ہو گیا۔۔۔۔۔ اب اپنی بیوی کے ساتھ اسی گھر کے کورڈ میں رہ رہا تھا۔ یہ کواٹر بھی اباجی کی نوازش سے عطا ہوا تھا۔ ورنہ امیدوار تو بہت تھے۔۔۔۔۔ کرمو شروع سے ہی اباجی جی کا منہ چڑھا تھا۔۔۔۔۔ اسپتال سے کار۔۔۔۔۔ اور کار سے گھر کے اندر اباجی کے کمرے تک وہیل چیئر کو وہ ہی دھکیلتا ہوا لایا تھا۔

رات میں اباجی کے حکم کے بعد۔۔۔۔۔ اباجی کے کھانے پینے کا انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔۔۔۔۔ سب نے لاکھ سمجھایا کہ نہلانے دھلانے تک

تو ٹھیک ہے لیکن اس چوڑے کو کچن تک رسائی دینے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر سبزی کھانا تو بہو دیں بھی بنا دیں گی۔ یا جو آپ کہیں گے۔ مگر اباجی بڑی رکھائی سے بولے۔

”بہو دیں ایک آدھ دن تو خوشی سے بنائیں گی۔۔۔۔۔ پھر ناک بھوں چڑھائیں گی۔۔۔۔۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ اس لیے اسے کچن میں جانے دو۔“

بہو دیں اس بات پر بیچ و تاب کھا کر رہ گئیں۔ وہ تو انہیں اباجی کی ناتواں صحت کا خیال مار گیا۔ اور پچھلے دو ماہ سے نظر انداز ہوتی اپنی اپنی محبتوں کا۔ ورنہ اس بات پر کسی ایک آدھ کو ہارٹ ایٹک تو ضرور ہی ہو جاتا۔

چاروں بیٹوں کو یہ بات بھی اندر ہی اندر تنگ کرتی تھی کہ اباجی کی زندگی کے چھوٹے بڑے راز جو کرمو جانتا ہے، وہ۔۔۔۔۔ وہ کیوں نہیں جانتے اور ساتوں بچوں سے زیادہ اعتماد آخر اباجی اس کرمو منحوس پر کیوں کرتے ہیں۔

سانولا، دلا پتلا سا کرمو پہلے تو اس بات پر بہت گھبرا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ جب اسے یہ پتا چل گیا کہ کم از کم اباجی کی زندگی میں کوئی اسے گھر اور کواٹر سے نہیں نکال سکتا تو وہ بھی ٹہنی سے اترتے اخروٹ کی طرح مضبوط سے مضبوط ہی ہوتا چلا گیا اور اب تو وہ ان ساتوں اور ان سب کے شریک سفروں سمیت چودہ جانوں کا مقابلہ بڑے گل سے کیا کرتا تھا، جیسے ان سب کو مزید چڑا رہا ہو۔۔۔۔۔ بات سے بات نکلتی تو طنز کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

پچھلے دنوں۔۔۔۔۔ اباجی کا چشمہ ٹوٹ گیا۔ کرمو بنوانے جا رہا تھا۔ بلال نے دیکھا تو کہا مجھے دے دے، آتے وقت بنوا کر لیتا آؤں گا۔۔۔۔۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ چشمہ دو دن کار میں ہی پڑا رہ گیا۔ تیسرے دن کرمو نے کار سے چشمہ نکالا۔۔۔۔۔ اور خود بنوانے چلا گیا۔ شام کو بلال گھر آیا تو کرمو۔۔۔۔۔ چشمہ

خود لگائے اسے گھورنے لگا۔

”ایسے کیا دیکھ رہا ہے.....“ تاڑ بلال بھی گیا تھا پھر بھی گرج کر بولا۔

”جتنے والے نے دوسو لیے..... میں نے کہا اتنے زیادہ تو کہنے لگا خاص شیشہ لگا رہا ہوں۔ لوگوں کے اصل چہرے نظر آئیں گے..... صبح سے تو کوئی تجربہ ہوا نہیں..... لیکن اب آپ کے چہرے کی جگہ لومڑ نظر آ رہا ہے۔“ نئے تجربے پر چٹکی بجا کر کہا گیا۔ ”کرمو.....“ گالی دے کر غصے سے بلال نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔

”کیا بات ہے.....“ اباجی بھی حاضر ہو گئے۔ ایک تو منحوس کرمو کی قسمت بھی میٹھی ریوڑی تھی۔ جب بھی اس پر کوئی افتاد آن پڑتی۔ اباجی چراغ کے جن کی طرح بنا رگڑے ہی حاضر ہو جاتے۔

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں۔“ ہاتھ ہوا میں ہی رہ گیا..... غلطی اپنی تھی، اس لیے بلال چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بے درپے سب کے ساتھ ایسے ہی واقعات ہو چکے تھے۔ اس لیے سب کو مشترکہ طور پر کرمو سے نفرت ہو گئی تھی۔ کتنی ہی بار اباجی کے کان بھی بھرے۔ ایک کی دو لگائی گئیں کہ اس خبیث کو گھر سے نکال باہر کریں لیکن کرمو، برسوں کی خدمت کی روٹی عاجزی اور معصومیت کی تیلی پر چڑھا کر اباجی کے کان صاف کر دیتا۔ تسلی ہو چکتی تو سل بے کا ٹھیل پھر سے شروع ہو جاتا۔

اور اب تو اس کرمو نے بس اپنے آگے ہاتھ جڑوانے کی ہی کسر باقی رکھ چھوڑی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن اباجی کمرے سے باہر نکل آئے۔ چھٹی کا دن تھا۔ سب ناشتے کے بعد باہر ہی مچن میں بیٹھے مالٹے اور مونگ پھلیوں کے مزے لے رہے تھے۔ اباجی کو باہر آتے دیکھ کر اور وہیل چیئر کے بغیر

دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔

”اباجی..... باہر.....؟“

”بیڈریسٹ کریں اباجی..... ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے چلنے پھرنے سے۔“

”اندر دل گھبرا رہا تھا..... اور ویسے بھی ڈاکٹر تو نجانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں۔“ کرمو نے سہارا لے کر کرسی پر بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے، بیٹھے۔“

”تم تینوں یہاں کیوں ہو اباجی تک.....“

گھروں کو جاؤ..... تمہارے بچوں کے اسکولوں کا حرج ہو رہا ہوگا۔“ اباجی نے تینوں بیٹیوں سے کہا۔

”نہیں اباجی..... چھٹیاں ہیں سر دیوں کی۔“

”شوہروں کا کام کاج تو ہو رہا ہوگا۔“

”انتظام کر کے آئے ہیں اباجی ان کا بھی.....“

”یہاں کس چیز کے انتظار میں ہو۔“ اباجی ذرا غصے سے بولے۔

”اباجی آپ کے لیے بیٹھے ہیں..... آپ کے ساتھ بیٹھتے ہیں تو دل لگ جاتا ہے۔“

”بھرا نہیں دل اباجی تک۔“

”آپ کی طبیعت.....“

”میں ٹھیک ہوں..... میں ٹھیک ہوں..... تم جاؤ اب اپنے اپنے گھروں کو۔“

”کیا ہو گیا ہے اباجی آپ کو..... کیوں اتنے چڑچڑے ہو رہے ہیں آپ.....“ رافیہ ذرا ناراضی سے بولی۔

”باپ کے گھرا تے دن نہیں رہنا چاہیے..... سسرال والے باتیں بناتے ہیں..... اتنا ٹکڑا نہیں رہا میں اب کہ تمہارے جھگڑے نبھاتا پھروں۔“

”خیر رہنے دیں اباجی..... صحت مندی میں بھی آپ کون سا آ جاتے تھے..... ہمیشہ بھائیوں نے ہی ساتھ دیا۔“ رافیہ پیر پختی اندر چلی گئی۔

”ہاں..... ٹھیک ہے، جاؤ پھر اب اپنے گھروں کو۔“ باقی دونوں بھی منہ پھلاتی اندر چلی گئیں۔

”کیا ضرورت تھی اباجی اس طرح بات کرنے کی۔“ طلال نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔“

”بچوں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے ان بے چاروں کو.....“ بھائیوں میں سب سے چھوٹے ظہیر نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر خود بھی اندر چلا گیا۔

مالٹے، مونگ پھلیاں سب وہیں رکھ کر کرمو بخنی کا پالہ لے آیا..... جس میں تقریباً آدھ سیر دیسی مرغ کی بوٹیاں بھی تھیں..... پیالہ میز پر رکھ کر کرمو اباجی کی گردن پر کپڑا لگانے لگا۔

”کرمو..... تو پاگل تو نہیں ہو گیا.....“ سجاد نے کہا۔

”ڈاکٹر نے صرف ہلکی خوراک کھانے کو کہا ہے..... اور تو بوٹیاں بھی ساتھ لے آیا۔“

”ابا حضور نے ہی کہا تھا.....“ بات کرتے وقت کرمو کے ہاتھ ہمیشہ ہی ڈگڈگی کی طرح حرکت کرتے تھے۔ ایسے وقت میں سجاد بھائی سمیت سب کا دل کرتا تھا کہ اس خبیث کے ہاتھ سرے سے کاٹ ہی دیں۔

”ہاں..... ہاں..... بیٹا میں نے ہی کہا تھا..... ڈاکٹر تو بس.....“

”یا اپنی مرضی کریں اباجی یا ڈاکٹر سے علاج کروالیں۔ پھر ہم سے شکوہ نہ کیجیے گا کہ ہم آپ کا خیال نہیں رکھتے۔“ سجاد نے کہا..... باقی دونوں لڑکے بھی باری باری اپنی اپنی سنا کر اندر میں چلے گئے۔

”چھوڑیے اباجی..... ان کی باتوں میں نہ آئیں۔“ کرمو نے ڈگڈگی بجائی۔

اباجی بوٹیوں سمیت سارا پالہ چٹ کر گئے۔ لیکن شام ہوتے ہوتے ان کو پتا چل گیا کہ ڈاکٹر جو کہتے ہیں وہ ایسے ہی نہیں کہتے..... ساری رات ان کے پیٹ میں مروڑاٹھتے رہے..... صبح بڑی بہود کیھنے آئی..... لیکن شرمندگی کے مارے اسے بھی کچھ نہ بتایا۔ چہل قدمی کا بہانہ بنا کر کرمو کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر نے معدے کے خرابی کی گولیاں دے دیں اور تاکید کر دی کہ آئندہ بد پرہیزی نہ ہو..... پہلی ہی خوراک سے فرق تو پڑ گیا لیکن رات کو اباجی کا دل پھر مرج مسالے والا مرغ کھانے کو کیا۔ کرمو نے ہی حل نکالا اس کا بھی۔

”خرابی آپ کے معدے میں نہیں ہے ابا حضور، خرابی اس مرغی میں ہے۔“

”دیسی مرغی میں بھی.....؟“

”یہ چور، ڈاکو، حرام خوردکان دار مرغی کو گوندھا ہوا آٹا کھلاتے ہیں، وزن زیادہ کرنے کے لیے۔“

”تو کیا کیا جائے کرمو.....؟“ اباجی بے چارگی سے بولے۔

اور ویسے تو کرمو کو کبھی سگی ماں کی یاد بھی نہ آئی تھی۔ لیکن اباجی کی اس بے چارگی پر اس کا دل کٹ کٹ گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا پھر بھی حفظ ماتقدم کے طور پر کرمو اپنا منہ اباجی کے کان کے قریب لے گیا۔ وہ دبی دبی آواز میں حل بتاتا رہا اور اباجی کا پڑ مردہ چہرہ روشن ہوتا چلا گیا۔

اگلی صبح سب گھر والوں نے دیکھا کہ باغ کے کونے میں چند مزدور کونے کا بڑا حصہ صاف کر رہے ہیں۔

”بچے کب سے کہہ رہے تھے۔ چھوٹے سوئنگ پول کا اباجی کو اب خیال آیا ہے۔“ بڑی بہو شگفتہ نے سجاد سے کہا۔

باقی تینوں بیٹیوں اور بہوؤں کے تاثرات بھی شگفتہ کے ہم رنگ ہی تھے۔ دوسرے دن صاف حصہ پراٹھیں بچھ گئیں۔ سب حیرت سے ایک دوسرے کو

دیکھنے لگے کرمونے تو کوئی جواب ہی نہ دیا۔ اور ابا جی۔ دیکھ لینا جب بنے گا، دیکھ لینا جو بنے گا۔ کہہ کر نالتے رہے۔

چھٹے روز گاؤں سے کرمو کا باپ بچپس مرغیوں سمیت آن حاضر ہوا۔ تین درجن چوزے الگ۔ ساتھ دو بوریاں باجرے اور دو دوسری غذا کی، سب کی آوازیں حلق میں بیٹھ گئیں۔ ککڑوں کوں بھی نہ کر سکیں۔ پھائیوں میں سب سے چھوٹا ظہیر دادا کی طرح خوشی، غم ہر موقع پر تانک میں رہتا تھا۔ ”بازار سے مل تو جاتی ہے دیسی مرغی پھر اس سب کی کیا ضرورت تھی ابا جی۔“

”کرمونے کہا وہ خراب خراب چیزیں کھلاتے ہیں دیسی مرغیوں کو بھی۔“ اپنا نام سن کر کرمو چابی دیے چوہے کی طرح بھاگ گیا۔ ”کرمونے“ کہا۔ سجاد بھائی نے دانت پیسے، چیزے مضبوط نہ ہوتے تو یقیناً خون نکل آتا۔ یا بیٹی۔

”کرمو کرمو کرمو۔۔۔۔۔“ بلال نے مٹھی کا مکا ایک نہ پوری ہونے والی آرزو کے تحت بھینچا۔ پورے چہرے پر ٹماٹر سے لگ آئے۔

”ویسے تو آپ ہم سب کو تلقین کرتے ہیں ابا جی۔۔۔۔۔ فضول خرچی سے بچنے کی۔۔۔۔۔ اور اب یہ سب جو کیا ہے، وہ۔“

”بیٹا معذہ کمزور ہے اور کچھ۔۔۔۔۔“ ”رہنے دیں ابا جی۔۔۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان اپنی خوشی اور اطمینان کے لیے بڑا ہی مطلب پرست افع ہوا ہے۔“ بچے سوئمنگ پول کی آس لگائے بیٹھے تھے، ڈبکی بڑوں کو آگئی اور آئی بھی پھر ایسی کہ فوں سانس بحال نہ ہو سکی۔

تینوں بیٹیوں کو فون کر کے نئی کارگزاری کے رے میں بتایا گیا۔۔۔۔۔ اور مردود کرمو کا بھی۔ ”عباس انکل کو بلاؤ۔۔۔۔۔“ بڑی نے کمال مشورہ کیا۔

”ابا جی تو ساری جائیداد خود ہی ہڑپ کر جائیں گے۔“

اگلے دن سب نے متفقہ طور پر عباس انکل کے حق میں ووٹ کا سٹ کر دیا۔

”میں پریس چلاتا ہوں۔ بلال ورکشاپ، باقی دو کی تنخواہیں بے شک اچھی ہیں لیکن عباس انکل! آپ بتائیں کیا زندگی مسلسل آگے بڑھنے کا نام نہیں ہے۔ آج بچے چھوٹے ہیں۔ کل کو بڑے ہوں گے، بیٹیوں کا جہیز بنانا ہے۔ اچھی سے کوئی بیج بویں گے تو سالوں بعد کہیں جا کر فصل کاٹنے کی نوبت آئے گی نا۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم سب۔۔۔۔۔ ٹھیک کہتے ہو، بات کرتا ہوں میں دین محمد سے۔“

”ابا جی نے یہ جائیداد کون سی اپنے ساتھ لے جانی ہے۔۔۔۔۔ بس کہتے ہیں کہ آج بھی تمہاری ہے، کل بھی تمہاری۔۔۔۔۔ تو آخر ہمیں دے کیوں نہیں دیتے۔“

”بے فکر رہو۔۔۔۔۔ کرتا ہوں اندر جا کر بات۔“ ”صرف بات نہیں کرنی آپ کو انہیں راضی کرنا ہے۔“ سب نے کورس میں کہا۔

ایک گھنٹے سے عباس انکل، سجاد کے کمرے

میں سب کے درمیان بیٹھے مسائل کی کھلتی فائلوں پر اپنی زبان کے دستخط کر رہے تھے۔ گھنٹے بھر بعد جا کر جب ان کے قلم کی سیاہی ختم ہو گئی تو انہیں ابا جی کے کمرے کی طرف دھکیل دیا گیا۔ کرمو ساری اطلاع پہلے ہی دے آیا تھا۔ ابا جی مارشل لا لگائے فوجی کی طرح جنگ کرنے کو تیار بیٹھے تھے۔

”دنیا میں کوئی ایسی سرورس ابھی ایجاد نہیں ہوئی جو یہاں کی جائیداد کو وہاں منتقل کرے۔۔۔۔۔ پھر تو کیوں ستارہا ہے اپنے ہی بچوں کو دے دے اپنی زندگی میں ہی جو کل بھی ان کا ہی ہے۔“

”ہاں، ہاں دے دوں گا۔ دے دوں گا۔ تو بھی ان کی زبان ہی بولنے لگا۔“

”کب دے دے گا۔۔۔۔۔ جب وہ تیرے مرنے کی باقاعدہ دعائیں مانگنے لگیں گے۔ میں نے بھی تو دے دیا اپنی زندگی میں ہی سب کچھ۔ کتنے خوش ہیں دونوں، سالوں میں ڈبل کر لیا جائیداد کو۔۔۔۔۔ اپنے اپنے کاموں سے واپس آتے ہی سب سے پہلے میرے کمرے میں آتے ہیں پھر اپنے کمروں میں جاتے ہیں۔“

”مجھے نہیں چاہیے ایسی منافقت۔“ ”منافقت نہیں ہے یہ بچے! پیار ہے، عزت و احترام ہے، باپ قسمت سے بڑا بن جائے تو بیٹوں کو کندنہ جانے، یہ ہی دنیا کا اصول ہے۔ باپ غلط بھی یا اتار ہوتا ہے ساری عمر۔۔۔۔۔ حالانکہ اس کے بیٹوں کی رگوں میں گرم خون ہوتا ہے۔ جیسا بھی باپ کی رگوں میں ہوتا تھا۔“

”بیوی مر گئی۔۔۔۔۔ بچے اپنے اپنے کمروں میں بند۔۔۔۔۔ تنہائی کی زندگی جی رہا ہوں۔ اپنی بیٹی جائیداد کے کاغذات دیکھتا ہوں تو مالک ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ پرانی فائلیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہوں۔“ ابا جی نے اپنا دکھڑا دیا۔

”بس اتنی سی بات۔۔۔۔۔“ عباس انکل نے توقف کیا۔ ”تو تنہا بھی اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوا ہے تو جانتا ہے کہ عورت بیوہ ہو کر بھی تنہا کیوں نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اپنے وجود اپنے بچوں یا ان کے وجود ان کے بچوں کے ساتھ دل لگاتی ہے مرد ایسا نہیں کرتا اسی لیے تنہا ہو جاتا ہے۔ ورنہ میں تو نہیں ہوا۔ پوتوں کو اسکول اکیڈمی لینے اور چھوڑنے جاتا ہوں۔ سکون ہی سکون ہے۔“

ابا جی پر باتوں کا اثر ہوا یا نہیں لیکن وہ آنکھوں سے ایسا تاثر دینے لگے جیسے وہ کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

”تو میرے ساتھ چل شکار پر۔۔۔۔۔ سمجھاتا ہوں تجھے کہ دل کیسے لگاتے ہیں۔“ ابا جی تب بھی خاموش ہی رہے۔ باہر نکل کر عباس انکل نے مختصر چہروں کو بھی تسلی دی۔

”فی الحال میں اسے شکار پر لے کر جا رہا ہوں، واپسی پر ان شاء اللہ معاملہ حل ہو جائے گا۔“ ”کرمو کو ابا جی کے جانے کا پتا چلا تو ابا جی کے نکلتے ہی اپنا سامان بھی پیک کر لیا۔ گاؤں چلا گیا۔ جانتا تھا ابا جی کی غیر موجودگی میں اس کی وہ درگت بنی ہے جو دھینے کے ہاں روٹی کی بھی نہیں بنتی ہوگی۔۔۔۔۔ مرغیوں کو سنبھالنے کے لیے بیوی کو کوائر میں ہی چھوڑ گیا۔

ابا جی کی غیر حاضری کا سارا ہفتہ سب کا دعائیں کرتے گزرا۔ فرض کے ساتھ ساتھ نفل بھی ادا ہوئے۔ سارا دن با وضو رہتے ہی گزرنے لگا۔ بہوؤں نے جہیزوں کی جائے نمازیں نکال لیں۔ قرآن مجید کھلنے لگے۔ وظیفے، نمازیں، درود تہننا، کوئی چیز نہ چھوڑی گئی۔ اچھی خبر کی امید نے سب کے چہرے نورانی سے کر دیے۔

ساتویں دن ابا جی کا فون آ گیا۔۔۔۔۔ بلال کو حکم ملا کہ فوراً دولاکھ کی رقم ٹرانسفر کرے۔ بلال نے وجہ پوچھی لیکن نہ بتائی۔

”ارے بھی گفٹ خریدنے ہوں گے ہم سب کے لیے، پہلی دفعہ تو گئے ہیں نہیں باہر، وہ بھی گھر والوں کے بغیر۔“ رات کے کھانے پر بلال کی بات سن کر بڑی بھابھی نے قیاس لگا کر سب کی بے چینی کو دور کر دیا۔

”لیکن بھابھی دولاکھ!!“ بلال کی الجھن دور نہ ہو سکی۔

”فیملی ممبرز کی تعداد بھی تو دیکھو تم ہماری اللہ بری نظر سے بجائے۔“ فیملی ممبرز کی تعداد تو پتا نہیں کتنی تھی لیکن گفٹ چار آئے، دو نر، دو مادہ۔ دو مور، دو مورنیاں۔

دولاکھ کی خطرہ رقم ست رنگی پنکھوں پر اجڑی دیکھ کر سب گھروالے بن بادل برسات کے ہی ناچنے لگے۔

”کرمو آ گیا۔“ عجلت سے پوچھا گیا۔ سب کے کلیشہ صورت چہرے ساکت رہے۔

”نہیں۔“ کسی بچے نے ہی جواب دیا۔

”اور پرکا اسٹور صاف کروادو۔ یہ موراب وہیں رہیں گے۔ کل مستری آ کر بڑی کمز کی بھی نکال دے گا۔ کھلی فضا میں رہنے کے عادی ہیں یہ۔“

”اور پرکا اسٹور تو میں اپنے لیے صاف کرنے کی سوچ رہا تھا۔“ سجاد کا بڑا بیٹا احمد اپنی سی صورت لے کر باہر چلا گیا۔ سجاد کا دل اولاد کے لیے ہٹا نہیں بھیڑا تھا یا نہیں لیکن اس وقت پھٹ کر رہ گیا۔

”آگے ہی مرغیوں کی آوازیں ہمیں سکون نہیں لینے دیتیں۔ اوپر سے آپ یہ مور لے آئے ہیں۔“

”بیٹا! مرغیاں میں نے اپنی صحت کے لیے پالی ہیں ورنہ مجھے کیا شوق ہے اپنے گھر کو گاؤں بنانے کا۔“

”گاؤں ہی بنادیتے، آپ تو تھر بنانے چلے ہیں۔“ طلال نے بھی حصہ ڈالا۔

”ہمیں تو بہت درس دیتے ہیں کہ روپیہ پیسہ سنبھال سنبھال کر خرچ کرو۔ بھی پیزے والا گھر آ جاتا تھا تو آپ سارا دن بولتے رہتے تھے کہ بچوں کو اتنے مہنگے شوق نہ ڈالو۔“ بلال بھی کیسے چپ رہتا۔

”بیٹا! دیکھنے میں اچھے لگے تو میں نے خرید

لیے، ناچیں گے تو تمہیں بھی اچھا لگے گا۔ بچوں کا دل بھی لگا رہے گا۔“

”پہلے آپ اپنے بچوں کی ضرورتیں تو پوری کریں اباجی! پھر ان کے بچوں کے بارے میں بھی سوچ لیجیے گا۔“ طلال نے کہا اور حسب عادت ایسی باتوں پر اباجی کے کانوں نے سننا بند کر دیا۔ دائیں بائیں دیکھنے لگے۔

”سجاد بات سن وہ سمن آباد والی دکان بیچ دے۔“

”کیوں اباجی؟“

”بس بیچ دے..... مجھے پیسے چاہییں۔“

”لیکن وہاں تو بلال۔“

”اگر نہیں بکواسکتا تو بتادے، میں کرمو کو کہہ دوں گا۔ تم سے اچھا تو وہ ہی ہے۔“ اباجی کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سب وہیں تڑپنے لگے۔

کرمو، کرمو، کرمو.....

اباجی، اباجی، اباجی.....

رات سب کے بستروں پر جیسے بجلی کے ننگے تار بچھ گئے۔ سب کروٹ کروٹ تڑپ تڑپ لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔ وہ تو شکر تھا کہ اگلے دن اتوار تھا۔ ورنہ سوچی ہوئی آنکھیں لے کر اپنے اپنے کاموں پر کیسے جاتے۔

☆☆☆

دکان کے خریدار تو بہت تھے، پیسے ہاتھوں میں لیے بیٹھے تھے۔ دنوں میں بک گئی دکان اور میں لاکھ اباجی کی جیب میں آ گئے۔ چاروں بیٹوں میں سے کسی کی غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ پیسوں کے متعلق کچھ پوچھ لیں کہ ایسی کیا ارجنٹ ضرورت آن پڑی تھی جس کے کارن دکان بیچ دی گئی۔ اباجی نے بتانے کی زحمت بھی مول نہ لی۔

کرمو اگلے ہی دن آ گیا۔ سولہ، سولہ کلو دیسی کھی کے دو کنستروں، گڑ، شہد، تل، بکئی کے آٹے کی بور یوں اور پانچ عدد دروندے بکروں کے ساتھ۔ سب نے سارا سامان دیکھا اور خود کو گرم گرم کھی کی کڑاھی میں مکمل ڈیپ فرائی ہوتا محسوس کیا۔

”ہر مہینے ایک بکرا کر لیا کریں گے اباجی! پیکٹ بنا کر فریج میں لگا دوں گا۔ ہر دو بجے تیجے دن بنادیا کروں گا۔“

”ٹھیک ہے کرمو، جیسے تو کہے۔“ کرمو کے واپس آنے پر اباجی بھی جنگلی بلی سے ایک دم پلٹا کھا کر نرم گرم خرگوش میں بدل گئے تھے جیسے دو سال کا معصوم سا بچہ ہوں۔ جس نے ابھی باہر کی دنیا بھی نہ دیکھی ہو۔

”فریج میں اتنے دن کا گوشت بھی تو زہر

ہو جاتا ہے خبیث.....“ بلال مگر جا۔

وہی عمل کس کا، غصہ کسی پر۔

”گھر کے پلے ہوئے بکروں کی خیر ہے بلال..... بھائی۔“

اب اس خبیث نے ایک اور عادت اپنالی تھی۔ بڑے صاحب بڑے صاحب کہنے والا، ہر ایک کا نام بنا ڈرے لیتا اور نام کے بعد ”بھائی“ کہنے میں تو اتنا لمبا وقفہ ڈال لیتا کہ تب تک اگلا اپنی۔ بے عزتی باقاعدہ محسوس کر چکا ہوتا۔

”ہمارے گاؤں میں تو ویسے بھی طرح طرح کی جڑی بوٹیاں اگتی ہیں۔ بھی بھی جانوروں کو وہ بھی کھلا دیتے ہیں مصطفیٰ خون ہوتی ہیں خالص، ویسے بھی بازار کا پانی لگا گوشت بھی تو کھاتے ہی ہیں نا پیاریوں کی جڑ، پانی بھی گندے نکلے گا۔“ کرمو نے کٹنیوں کی طرح ناک بھوں چڑھائی۔

”تو پھر ایسا کر، چھت پر مٹی کی ٹالیاں ڈلو کر سبزیاں، دالیں، پھل بھی اوپر ہی کاشت کر لے۔ مرچ، ادرک، لہسن بھی، سنا ہے ان فصلوں کی کھاد بھی بڑی معزز صحت آنے لگی ہے۔“

”آپ صحیح طرح شہر کو نہیں جان سکے، گاؤں کو کیا جانو گے۔“ کرمو نے ڈگڈگی بجا کر کہہ دیا اور بلال کسی تیز دھار آ لے کی تلاش میں مٹھن میں نظریں دوڑانے لگا۔

”پھل سبزیاں — ہاٹھر سینٹر سے لے آیا کریں گے ان کی چیزیں بڑی معیاری ہوتی ہیں۔“

”ریٹ پتا ہیں ان کے، عام ہلا کیٹوں سے دگنے ہوتے ہیں۔ سمجھائیے اسے اباجی۔“

اباجی کیا سمجھاتے، ان کی تو خود کی بھی یہی مرضی تھی جو کرمو کہے، جو کرمو مناسب سمجھے۔

”اب اباحضور کی صحت پر تو کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے نا۔“ اس بار ڈگڈگی کے بجائے ڈفلی بجائی گئی۔

”کینیے! ایسے بات کرتا ہو اپورا نچیا لگتا ہے تو۔ ہاتھوں کو کنٹرول میں رکھا کر بات کرتے وقت۔“

بلال سمیت باقی تینوں کا بھی دل کرتا تھا کہ کسی دن کرمو کو قربان کر کے خواجہ سراؤں کی پارٹی میں جمع کر دیا آئیں اور کچھ نہ بھی ملے، دعا میں ہی مل جائیں کرمو کے بدلے تو وہ بھی کافی ہیں۔

”نہیں بیٹے گالی نہیں دیتے کسی کو۔“ اباجی نے بلال کو سمجھانا چاہا اور اس وقت بلال کو اباجی بڑے بچے متاثر لگے۔

”آپ چپ رہیں اباجی! یہ میرا اور کرمو کا معاملہ ہے۔ آپ کا معاملہ تو میں نے اب خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہی آپ کو پوچھے گا۔“ بلال سمن آباد والی دکان پر ورکشاپ کرنا چاہتا تھا۔ جب سے وہ بکلی تھی اس کے سر کے بال سفید ہو رہے تھے۔ آج تو وہ بالکل ہی رو دے کو تھا۔ شاید رو بھی لیتا جو کرمو ساتھ نہ بیٹھا ہوتا۔ آگے کون سی عزت کر رہا تھا، اب یوں روتے دیکھ لیتا تو نہ بھلنے مخاطب کرنے کا کون سا انداز اختیار کرتا وہ۔

اباجی بلال کا یہ روپ دیکھ کر دمگ سے رہ گئے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ بلال وہاں ورکشاپ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ایک طرف بیٹے کے کاروبار کا سوال تھا اور دوسری طرف چار دن کی زندگی کا، انہیں کسی ایک کو تو چھٹنا تھا ہی وہ بھی کیا کرتے۔

دکان کے تیس لاکھ کیا ہوئے؟ کیا ہو رہا ہے؟ کیا کیا جا رہا ہے؟ ان تیس لاکھ کو ہر کوئی ہر روز انگلیوں پر گنتا تھا۔ اتنے خرچ ہوئے، اب اتنے رہ گئے۔ آج اتنا خرچا ہوا باقی بچے؟

اباجی کی خوراک کا انداز بھی مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ صبح ناشتے میں ہر پختے، سبزی پائے، تل والا کچہ یا پوریاں دس بجے بک رہے کی بجائی بوٹیوں کے ساتھ، دوپہر میں دہی کے ساتھ چاول یا تکے، ویسی کھی کے چھڑ کا ڈوالے، رات میں چھوٹا گوشت یا دال، سبزی گوشت۔ یہ پٹیرن تو فکس تھا۔ دن بھر کی بے احتیاطی اور ٹھونگنا۔ لگ سے تھا۔ شہد یا زعفران ملا دودھ۔ پھل، خشک میوے، تازہ جوس، پیٹھے میں کھوئے کے قتلے، امرتیاں، گا جڑ پیٹھے کا حلوہ، پنجن، سلاد کے نام پر

سبزیاں، صحت بھی اب بدلنے لگی تھی۔ اباجی کی ایسی صحت جو ساری زندگی نہ بنی تھی۔ چہرہ زعفران کے باعث گہرا سرخ تھمتا ہوا لگتا تھا، کیا نو جوانوں کا ہوتا ہوگا۔

گھر والوں کو آئے دن نئی چیزیں دیکھنے کو ملتیں۔ اب وہ جلتے نہیں تھے صرف گنتے تھے۔ بانی کتنے بچے پیسے اور، اور دن۔

کمالیہ کے خاص آدمی کو لایا کر موگھر پر، میوہ اسپتال والی دکانوں سے۔ اگلے دن کمالیہ کھدر کے دس سوٹ گھر میں آئے۔ سارے وہ شہر کی سب سے بڑی دکان سے، جہاں سے بھی ظہیر جیسا تھیں آدمی بھی سوٹ سلوانے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اباجی کی پرانی الماری ساری کی ساری خالی ہو گئی۔ اباجی کے وہ میلے چیلے، دھل دھل کر رنگ چھوڑے کپڑے ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے۔ دو گھوڑا بوکی، کاشن، لٹھا ایک آٹا ایک جاتا۔ ڈرائی کلیئر والے سوٹ خود گھر دینے آتے درزی ہر بار پہلے سے انچ انچ کا اضافہ کر کے نیا ساڑ لے جاتا۔

اباجی کا کمرہ بھی اب مقفل رہنے لگا تھا۔ اور چابی ہوئی صرف اباجی کے پاس یا کرمو کے پاس۔ اب اباجی بڑے رعب سے پرائم چیئر پر بیٹھتے تھے۔ اکڑے اکڑے سوٹوں کے ساتھ لٹش لٹش کرتی جوتیوں کے ساتھ جو آئے دن بدلتیں اور ان سے بھی زیادہ تیزی سے بدلتیں گھڑیاں، کبھی بلیک راڈو، کبھی واٹ سوڈز، سلور سیٹیز، گولڈن سیکو۔ کوڑے دان میں سے گھروالے خالی ڈبے نکال نکال کر برینڈز کے نام پڑھتے تو محسوس کرتے جیسے کسی غار میں قید ہو گئے ہوں اور وہاں آہستہ آہستہ بند ہو رہا ہوں۔

پھر عینکوں کی بھی ایک وسیع رینج تھی اباجی کے پاس..... ٹوٹا میلا چشمہ تو نجانے کہاں تھا اب اور وہ مخصوص عطر بھی لاپتہ تھا۔ اب تو مہنگے مہنگے پرفیوم خریدے جانے لگے تھے۔ شگفتہ کو پرفیومز کا بڑا شوق

تھا۔ وہ ہی نام بتاتی تھی ہر بار۔ کوبرا، شینل فانیو، انسٹرکشن، ایول (شیطان)، ماہا ہا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بھی صرف دو ہی خالی رہی تھیں اب، باقی چھ کی چھ دانٹ گڈنگ گڈنگوں سے پُر تھیں، بائیں ہاتھ میں گھڑی تو دائیں میں بریسلیٹ جس کا ڈیزائن ہفتے بھر بعد ہی بدل جاتا۔ درمیان سے مانگ نکالنے والا چالیس سالہ پرانا میسر اسٹائل بھی بدل گیا تھا۔ بال تو مہندی کے بجائے کالے رنگ سے رنگے ہی جانے لگے تھے۔ ساتھ ساتھ جیل میسر اسٹائل کا استعمال بھی ہونے لگا تھا۔ ہاتھ پیر بھی مٹی کیور، پیڈی کیور کے باعث بڑے نفیس ہو گئے تھے۔

پھر ایک روز اسی طرح گنتے گنتے تیس لاکھ پورے ہو گئے۔

”لو جی، اب صرف دس ہزار بچے ہوں گے۔ کر لیا اباجی نے جتنا عیش کرتا تھا اب دس ہزار بھی اسی عیاشی میں اڑا لیں پھر دیکھیں گے۔“

اور اسی رات اباجی پندرہ لاکھ والی نئی چھچھاتی کار میں بیٹھے گھر میں داخل ہوئے۔ سب کو چھٹی کا دودھ تو یاد نہ آیا۔ البتہ دادی کی گھٹی ضرور یاد آگئی۔

”ہائے اباجی اتنی مہنگی کار۔“

اباجی کی شخصیت اب کافی بدل گئی تھی انہوں نے کسی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور کمرے میں چلے گئے البتہ کرمو کو کمرے میں ہی بلوایا۔ نئی کار کے لشکارے چاروں بیٹوں اور ان کی بیویوں پر پڑے اور ان کے سفید چہرے بچ کھر کے ہو گئے۔ حالانکہ کار کا رنگ تو کالا تھا۔

”اتنی مہنگی کار کہاں سے لے لی اباجی نے۔“

”ہمارے حساب سے تو اب اباجی کے پاس دس نہ سبکی بیس ہزار ہونے چاہیے تھے یا زیادہ سے زیادہ لاکھ۔“

”کسی سے ادھار لیا ہوگا۔“

”یہ ادھار چکائے گا کون.....؟“

”خود ہی چکائیں گے ہم کیا چاہیں یا کرمو“

چکائے گا۔ چھپتا منہ بولا پانچواں بیٹا۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ اباجی نے ادھار لیا ہے۔“

”تو پھر۔“ سب تشویش زدہ تھے۔ ظہیر نے کہا

”تو گویا سب نے خطرے کی گھنٹی سن لی۔“

”ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ دیکھنا تھوڑے دنوں بعد پتا چل جائے گا۔“

تھوڑے دن بعد واقعی پتا چل گیا، دال میں کچھ کالا نہیں تھا کسی نے دال ہی چک ڈالی تھی۔ کرمو کے ہاتھ پر پانچ ہزار رکھا گیا کہ پیسوں کے بارے میں پتا کرے کہ کہاں سے آئے ہیں۔ کرمو نے پانچ ہزار واپس ظہیر کے ہاتھ پر رکھ دیے اور بولا۔

”پوچھ لوں گا پر یہ پیسہ رکھو اپنی جیب میں، تمہاری طرح حرام نہیں کھاتا۔“

”کرمو.....“ ظہیر مٹھیاں بھینچ کر ایسے دھاڑا جیسے خدا نخواستہ کسی بہر شہر نے اردو بول لی ہو۔ سب نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ظہیر کو صبر کرنے کی تلقین کی۔

”وقت پر تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے پھر اس چھچھوند کو کیوں نہ تھوڑی دیر کے لیے نوکر ہی مان لیا جائے۔“

کرمو گرم گرم مچھلی اور نان لے کر اندر اباجی کے کمرے میں چلا گیا۔ باہر سب بے چینی کے باعث نہ ٹھیک سے اٹھتے تھے نہ ٹھیک سے بیٹھتے تھے۔

”لو جی سن لو۔“ کرمو نے باہر آ کر غصہ آ نکھوں میں جھانک کر کہا۔

”سنت نگر والا مکان بچ دیا اباحضور نے۔“ اس دفعہ اس نے ہاتھوں سے ڈگڈگی نہیں بجائی بلکہ دونوں ہاتھوں کو خلا میں لے جا کر اس طرح تالی ماری کہ

ان سب کا طبلہ ہی بجا ڈالا۔

سب کے پیروں تلے سے زمین تو پہلے ہی کھسک چکی تھی۔ اب یہ سن کر گویا سائبان بھی بک گیا۔ مہنگے داموں، دھم دھم کر کے سب صوفوں پر بیٹھے تو کمرے میں ترنم پھیلا ساتھ پرانے اسپرنگوں نے اپنی قسمت کا رونا رویا۔

چھوٹی بھابھی نے تینوں نندوں کو کانفرنس کال

کر کے دکان اور مکان والے دونوں واقعے بھی بتا دیے۔ پندرہ منٹ کی گفتگو میں جیون بھر کا رونا رویا گیا اور تینوں نندوں نے واضح کہہ دیا کہ اب اباجی سے ان کا کوئی تعلق نہیں بھائی جو بہتر سمجھیں کریں اور اباجی کے کسی کام کے حوالے سے اب ان کو نہ بلایا جائے۔

مرغوں کی بانگوں نے پہلے ہی سب کے کانوں میں درد کر رکھا تھا۔ مور کا ناچ بھی بھولانہ تھا اور کڑا ہی میں بھی سب ڈبکی لگا چکے تھے۔ ساری چیزوں نے ٹل کر جوٹل کھایا تو موٹی مضبوط رسی بن گئی۔ بلکہ ہنٹر چاروں بیٹے اور بہوویں دھاڑتے ہوئے اباجی کے کمرے میں داخل ہوئے جیسے مقفل بکھرے کا دروازہ مدتوں بعد کھلا ملا ہو۔ اباجی بیڈ پر نیم دراز، مچھلی اور نان کھا کالمی ڈکاریں لے رہے تھے۔

”آپ نے سنت نگر والا مکان بچ دیا؟“

کورس میں پوچھا گیا۔ بڑے گھڑیاں نے بارہ ٹن جیسے اکٹھے بجا دیے۔

”ہاں بیٹا، پیسوں کی ضرورت تھی، میں نے سوچا چاروں کی تو زندگی۔“

”چاروں، چاروں، چاروں.....“

اللہ یہ چاروں کی زندگی کیا ساری زندگیاں نکل کر ختم ہوگی یا چار صدیاں۔“

”آپ کو پتا ہے وہ گھر ہماری یاں کی نشانی تھا۔ اس کے ساتھ ہماری ماں کی یاد جڑی تھی۔“ طلال نے جذباتی ہو کر کہا۔

”کبھی رہنے تو گئے نہیں تم وہاں؟“

”کیونکہ اس کا کرایہ آپ کو عزیز تھا۔“ ظہیر بولا۔

”سمن آباد اور رائے دند والی دکانوں کا بھی۔“ بلال نے کہا۔

”انہوں سے زیادہ آپ ہمیشہ غیروں پر اعتماد کرتے رہے کہ تم سے کاروبار نہیں ہو سکے گا۔“

دوسرے کم از کم کرایہ تو دیں گے۔“

”میں نے تو کتنی دفعہ الگ ہو کر وہاں جانے کی بات کی تھی۔ تب تو آپ کو سانچہ کا بخار چڑھا ہوا تھا

بات کی تھی۔ تب تو آپ کو سانچہ کا بخار چڑھا ہوا تھا

اور اب اپنے بارے میں آپ کیا کہیں گے اباجی۔“
سجاد نے اگلے پچھلے سارے رجسٹر کھول لیے۔
”سانجھ کا پھر خود ہی بھول گئے اباجی۔“
”نہیں بیٹا، وہ میں.....“

”منافقت بس کر دیں اباجی..... بیٹا بیٹا کہہ کر
آپ ہماری جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کا
مستقبل اندھیر کر رہے ہیں۔“

”تمہارے بچوں کے مستقبل کا ذمہ دار میں
نہیں ہوں۔“ اباجی پر بھی پچھلی کا اثر ہونے لگا تھا۔
”آپ تو ہمارے مستقبل سے بھی ہمیشہ کنارہ
کش ہی رہے ہیں۔ اماں سے بھی آپ کو روٹی اور
خدمت ہی درکار تھی بس اور ہم سب سے بھی۔“
”خدمت کی ہے تو پھل بھی پایا ہے نا خلف
اولاد، بے ادب گستاخ لڑکے۔“

”زیادہ ادب مت جھاڑیں، میرا اور آپ کا
رشتہ آج سے ختم۔“ سجاد نے کہا تو کمرے میں۔
خاموشی سی چھا گئی۔ اباجی نظریں چراتے چراتے جیسے
خود بھی بے ضمیر سے ہو گئے۔

”تو پھر چلا جا یہاں سے۔“
”آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں، ہم سب
آپ کی فطرت سے آگاہ ہیں۔ ماں کو بھی تو بات
بات پر طلاق کی دھمکی دیتے تھے۔ میں اس چیز کے
لے تیار تھا۔ جاؤ شکستہ سامان باندھو۔“ سجاد نے بیوی
کو حکم دیا۔ سانپ سو گئے مجمع میں حرکت ہوئی۔

”سجاد بھائی! کیا کر رہے ہیں آپ۔“ تینوں
بھائی بولے۔

دیو رانیاں بھا بھی بھا بھی کہتے ہوئے شکستہ کی
طرف لپکیں جو سجاد کے کہنے کے فوراً بعد سامان
باندھنے چلی گئی تھی۔

”جانے سے پہلے ایک بات بتا دوں، رائے
ونڈ والی چاروں دوکانوں کی رجسٹری میں نے اپنے
پیسوں سے کروائی تھی تب تو آپ کے منہ سے ہر
وقت شیرنی ٹپکتی رہتی تھی اور اس گھر میں طلال اور ظہیر
کے لیے اوپر والا پورشن تیار کروانے کے لیے میں نے

تقریباً دس لاکھ دیا تھا لیکن پھر بھی حساب بے باق
کرتا ہوں آپ کا اور میرا کھانا کلینر۔“ سجاد سنا کر باہر
چلا گیا۔ چھوٹے بھائیوں نے خوب کس کس کر۔
تیوریاں ڈالیں اور جو جو منہ میں آیا، بول کر سجاد کے
پیچھے باہر کو لپکے۔

سجاد اگلے دن ناشتے سے پہلے گھر چھوڑ کر جا چکا
تھا۔ اباجی مجرموں کی طرح کمرے سے باہر نکلے تو
ڈائٹنگ ٹیبل کی سربراہی کرسی پر بلال کو بیٹھے دیکھا۔
دیکھ تو سب نے بھی اباجی کو لیا تھا لیکن بلانا پسند نہ کیا۔
اباجی کمرے میں واپس چلے گئے تب سے ان کا ناشتا
کھانا کمرے میں جانے لگا۔ ہمیشہ کے لیے۔
اگلے مہینے تیسرے نمبر والا طلال بھی گھر چھوڑ کر
چلا گیا۔ اس کے روٹھنے کی وجہ الگ تھی۔ جب اس
نے رانیونڈ والی چار دوکانوں میں سے دو کے بک
جانے کی خبر سنی تو بیٹا بولے بیٹا جھگڑا کیے چلا گیا۔ اور
بس اتنا کہہ گیا۔

”دیکھنا اباجی ایک دن اس گھر میں اکیلے کو
اڑایا کریں گے۔“

اباجی کے معمولات پہلے تو بڑے بڑے پڑمردہ سے
رہے لیکن دن گزرے۔ دو بیٹوں کی جدائی کا غم غلط
ہوا تو کند ہو چکی آری کو جیسے پھر سے کسی نے پتھری پر
لا رکھا۔ بادام سوکھ کر اور بھی رسیلا ہو گیا۔

اب اباجی روز نہاتے۔ نیا ڈرائی کلین سوٹ
پہنتے۔ نئی جوتی، گھڑی، چین، برسلٹ، انگوٹھیاں،

بالوں پر جیل، ہیرا سپرے، پرفیوم اور نئی نوٹیلی دلہن
کی طرح ہر وقت بنے ٹھنڈے رہتے۔ گھر میں پانچ چھ
طرح کے اخبار اور دس بارہ طرح کے میگزین
لگوا لیے۔ فیشن، سیاست، اسپورٹس قسے کہانیوں اور
کرمو کے لیے کھانا بنانے کی ترکیبوں والے بھی۔

کرمو کے انداز بھی بدلنے لگے تھے۔ ٹاٹ پر
ٹاٹ اور نت نئے تھان چڑھنے لگے تھے۔ اباجی کی
اترن ہی چاندی کے برابر تھی۔ کالے لکڑے کے جسم پر
چڑھتی تو چودھویں نہ سہی پارہویں کا چاند تو ضرور ہی
معلوم پڑتا اور خوب صورتی میں چاروں بیٹوں کو بھی

مات دے جاتا۔ مات تو چاروں بھی دے رہے تھے
جل جل کر کوئلے کو۔
”اس کم بخت کو اور چاہیے ہی کیا تھا یہی تو
چاہتا تھا۔ یہ وہاں نالیاں صاف کرتا تھا۔ یہاں اباجی
کی جوتیاں سیدھی کرتا ہے۔“

کمروں میں جا کر دونوں اعلا شخصیات پر خوب
خوب تبصرے کیے جاتے۔ ایک بادشاہ تھا تو دوجا
وزیر۔ اب اباجی نے ایک اور معمول اپنا کر سب کو
حیران کر دیا۔

روزانہ شام کو کالے کرنگل جاتے اور آدمی
آدمی رات کو گھر واپس آتے۔ جوان جہان لونڈوں
کی طرح چوری چھپے بہت ٹوہ لگانے کی کوشش کی لیکن
کچھ ہاتھ نہ آیا۔ دونوں بہوؤں نے تینوں نندوں کو
کانفرنس کال پر لیا۔ اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ لیکن
تینوں نندوں نے مشترکہ کہہ دیا کہ اب دوسری چھوڑ
تیسری مئی بھی آجائے تو ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دونوں گھر بدر ہوئے بیٹوں نے بھی اسی طرح کا
اظہار کیا۔ لیکن بلال اور ظہیر کی تشویش بڑھتی ہی گئی۔
اگر ایسی بات ہوگئی تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل
نہیں رہیں گے۔ ساٹھ سالہ باپ اور دوسری شادی!!
دیے تو لڑائی کے دوران مرحومہ بیوی کو دوسری شادی
کی دھمکی دیا ہی کرتے تھے لیکن عمل اب ہوگا اتنی دیر
سے، اس بات کا دونوں کو گمان تک نہیں تھا اور اصل
فکر شادی سے بھی زیادہ دوسرے داروں کی تھی۔

جائیداد۔ بچی کتھی۔ تھی جو نئے حصے داروں کے
لیے تنجائش بنی تھی۔

عباس انکل کو فون کیا گیا۔ انہوں نے صاف
کہہ دیا کہ دین محمد سے ملے تو انہیں بھی کافی عرصہ ہو
گیا ہے۔ نجائے کہاں کہاں جاتا ہے۔ اور اب اس
نے نئے دوست بھی بنا لیے ہیں۔ کہتا ہے تو بڑا مطلقین
شاہ بنا پھرتا ہے۔ اب تیری میری نہیں جم سکتی۔ لوجی
آخری پتہ بھی صاف ہو گیا۔ دونوں بہوویں پریشان
ہو گئیں سردوں کو ساری رات جوڑے رکھا گیا فائدہ بھی
ہوا پھر؟

کرمو کو پیسوں یا کسی اور چیز کا لالچ دے کر
راضی کرنا مشکل تھا کہ پتا کرے اباجی باہر کیا گل
کھلانے جاتے ہیں کیونکہ کرمو سے تو سب بائیکاٹ
اسی دن ہو گیا تھا جس دن اباجی سے ہوا تھا۔ اب
صرف اس کی بیوی ہی کام آ سکتی تھی۔

وہ کام آگئی لیکن پانچ کے بجائے دس ہزار میں
مانی۔ پانچ ہزار ایک بھا بھی نے ڈالے پانچ دوسری
نے۔ اگلے دن اس نے خوشخبری سنا دی کہ کسی عورت
دورت کا چکر نہیں ہے اور اباجی کا رڈز کھیلنے جاتے
ہیں۔ بے چاری کو شاید کارڈز کھیلنے کی اردو نہیں معلوم
تھی یا کرمو اسے صحیح طرح سمجھا نہ سکا تھا۔ اپنی دانست
میں وہ کارڈز کو وظیفہ، محفل یا تبلیغ جیسی کسی چیز عبارت
سے منسوب کر رہی تھی۔ بڑے خوش ہو کر اس نے بتایا
تھا جیسے دس ہزار کے علاوہ انعام کی آس بھی لگائے
بیٹھی ہو۔

دونوں بیویوں نے رات کو اپنے شوہروں کو
اباجی کی نئی کارستانی کے بارے میں بتا دیا۔
ایک تو ویسے بھی دو بھائیوں کے گھر سے جانے
کی جدائی کا غم تھا۔ دوسرا حائیداد کی باری باری بکنے کی
فکر کریں، دونوں غصے سے پاگل ہو گئے۔ اباجی کو پھر
کٹہرے میں گھیر لیا گیا۔

”بڑے مولوی بنے پھرتے تھے نا آپ،
بڑے دھانی گیانی، بڑے شوق سے بتاتے تھے کہ
آدمی آدمی تنخواہ کی اسلامی کتابیں خرید لیا کرتا تھا۔
میں اب کہاں گئے وہ درس..... اب جو کھیلنے جاتے
ہیں تو شرم نہیں آتی۔“ اباجی نے بلال کو چلاتے سنا تو
گویا حیرت کے کسی مراقبے میں چلے گئے۔

انتا بڑا راز کیسے فاش ہو گیا؟ کیا کرمو تنک
حرامی کر گیا یا دونوں نے زیادہ چالاکی دکھا کر کار کا
پیچھا کر لیا..... کہاں چوک ہوگئی ان سے۔ وہ تو کلب
میں بھی بڑے چوکے ہو کر بیٹھا کرتے تھے۔ پولیس
سے زیادہ انہیں بیٹوں کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔
”بولیے، اب بولتے کیوں نہیں۔“
”یہ کیا بولیں گے..... جن کی بکل میں خود ہی

چور ہے۔“

”ہاں میں جاتا ہوں جو اکیلے۔“ اباجی بولے، میووں کی کسر نکالنے لگے۔

”میرا دل کرتا ہے۔ میں خوش رہنا چاہتا ہوں چار دن کی تو زندگی ہے۔ تمہیں کیا میری زندگی ہے۔ اسے حلال طریقے سے گزاروں یا حرام طریقے سے۔ حساب میں نے دینا ہے اللہ کو۔“ فتویٰ جاری کر دیا گیا اپنی اپنی زندگی، اپنی اپنی قبر اور کرم۔

”یہ حرام کاری ہم اپنے گھر میں برداشت نہیں کریں گے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ کیا اثر پڑے گا ان پر کہ کیا کرتا ہے ان کا دادا۔“ ظہیر نے فیصلہ کن کہا۔

”یہ گھر تمہارا نہیں میرا ہے۔“ وہی عمر رسیدہ ہو چکی خام خیالی۔

”آپ، امی کو اور ہمیں سروٹ کو اثر میں لائے تھے۔ باقی کی اینٹ اینٹ ہم چاروں بھائیوں نے اپنی اپنی کمائی سے، بڑی محنت سے لگائی ہے یہاں، تب تو آپ کہتے پھرتے تھے کہ یہ گھر تمہارا ہے۔ میرا نہیں۔ میں تو آج ہوں کل نہیں۔ جیسے چاہو بناؤ ہم دونوں سجاد اور طلال جیسے نئی نہیں کہ چپ چاپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ سروٹ کو اثر اور زمین کاریٹ لگوا لیجیے۔ پیسے آپ کو ہم دے دیں گے۔ اگر مقدمہ بازی کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔“ ظہیر نے نیم غصے لیکن شائستگی سے سارے مسئلے کا حل نکال دیا۔

ایک سیڈنٹ کے بعد سے اب تک کے عرصے میں پہلی بار اباجی دوبارہ کانپے اور پہلی بار پھر سے اباجی کا بلڈ پریشر ہائی ہوا۔ پیالے کے الٹی طرف بھی تھوڑا بہت پانی ٹھہر سکتا ہے۔ اس بات کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔

ساری رات اور سارا دن سوچتے رہنے کے بعد اگلے دن شام کو کار لے جاتے وقت اباجی نے ظہیر سے وعدہ کر لیا کہ وہ آئندہ کبھی بھی جو انہیں کھیلیں گے۔ ظہیر سمیت باقیوں کو بھی اطمینان ہوا۔

اباجی کے معمولات زندگی رفتہ رفتہ پھر پرانی پٹری پر چڑھنے لگے ماسوائے رات کو دو بجے واپس گھر آنے کے۔ نئے دوستوں کے ساتھ ہی انہوں نے شمالی علاقہ جات کی سیر کرنے کا پروگرام بنالیا۔ روانہ ہونے کے ہفتے بھر بعد وہاں سے خبر آگئی کہ اباجی تھاپانی میں گر گئے ہیں۔ دونوں ٹانگیں اور جسم بری طرح جل گیا ہے اور اسلام آباد کے اسپتال میں داخل ہیں۔

☆☆☆

لندن والی بہن کو فون کر دیا گیا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب جب ”کچھ“ ہو جائے گا وہ تب ہی آئے گی۔ ٹیکس بہت مہنگی ہو گئی ہیں۔ البتہ پنڈی والی، اسلام آباد پہنچ گئی۔ ہفتے کے بعد اباجی کو لاہور منتقل کیا گیا۔ ٹانگیں اس بری طرح جل گئی تھیں کہ انہیں ٹھیک کروانے کے لیے پیسوں کے کنویں کے کنویں درکار تھے۔ انشورنس والوں نے بھی یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ پیسے ”کچھ ہو جانے“ کے بعد ہی ادا کرتے ہیں۔ یہ ”چھوٹی موٹی وارداتیں“ تو ہر انسان کے ساتھ آئے دن ہی ہوتی رہتی ہیں۔ چارو ناچار چھ لاکھ والے دو فکس ڈیپازٹ بینک سے نکلوانے پڑے۔

سجاد، طلال سمیت باقی سب بچوں نے بھی اباجی سے صلح کر لی۔ مہینے بھر بعد لندن والی کا بھی فون آ گیا۔ اباجی، بچوں کو خدمت کرتے دیکھتے تو

آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اتنا ہلکان ہو رہے تھے سب اور اتنے ڈھیروں کام کر رہے تھے جتنے کرمو جیسے تین بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نہلانا، دھلانا، بولہ براز، سہارا دے کر واک کروانا، بیڈ پر لیٹے لیٹے درک آؤٹ کروانا، روزانہ مخصوص تیلوں سے ٹانگوں کی مالش، صبح و شام بہوویں الگ الگ گھر پر کھینچیں۔ پرہیزی کھانا بنتا۔ دلیہ، پنکٹی، ملک شیک، جو دیور، جیٹھ، نند، بچے ساتھ ہوتے، ان کا کھانا پک کر اسپتال ہی آتا۔ بیٹوں کے کاموں کا خرچ ہو ہی رہا تھا۔ ساتھ ساتھ خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔

کام سے واپسی پر آتا تو کوئی جانے سے پہلے۔ طلال، ظہیر تو مسلسل ایک ماہ سے کام پر گئے ہی نہیں تھے۔ بیٹیوں نے بھی رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ یہ سب دیکھتے دیکھتے نیم جان اباجی نے دل پر پتھر رکھ کر بڑا ہی اہم فیصلہ کر لیا۔

چار ماہ بعد ڈاکٹر نے اباجی کو اسپتال سے چھٹی دے دی۔ لندن والی بیٹی بھی تب تک آ چکی تھی۔ اور اتفاق سے اس دن خاندان کا بچہ بچہ اسپتال میں تھا۔ کچھ خوش تھے کچھ خوش ہونے کی ایکٹنگ کر رہے تھے۔ کئی کے چہروں پر تو تھکن بڑی ہوئی تھی۔ اباجی صحت مند تو ہو گئے تھے لیکن فی الحال وہیل چیئر پر ہی تھے۔ مخصوص اوقات کے علاوہ ابھی زیادہ چل پھر نہ سکتے تھے۔ سہارے کے بغیر چلنے میں تو ابھی مزید دو ماہ درکار تھے اور دوڑ لگانے کے لیے کم از کم آٹھ۔

ڈاکٹر نے آخری معائنے کے بعد رخصت کرتے وقت روز کی کرنے والی ورزشوں اور خوراک کی ساری تفصیل سجاد بھائی کو تھما دی اور بتا دی۔ پھر اباجی کو بھی ہمت بڑھانے کی خاطر بولا بالکل ایسے سرسری سا۔

”ہمت نہ ہاریے بزرگو! خوش رہا کریں۔ چار دن کی تو زندگی.....“

”بس، بس، بس۔“ سجاد بھائی گرجے جیسے مہرے ہوئے شیر کو دوبارہ جنم ملا ہو۔

”بہت بہت شکریہ آپ کا۔ مزید کوئی نصیحت

مت دیجیے گا۔“ سجاد بھائی گرجے تو طلال کی بھی ہمت بڑھ گئی۔ آگے کو کئی لٹکے پرانے عکسے کی شکل بدلانا اکثر چہرے سے ایک دم ہی یتیم و مسکین ہو گیا۔ سجاد بھائی وہیل چیئر کو دھکیلنے لگے تو کرمو نے ہینڈل تھام لینے چاہے۔

”لائیں مجھے دے دیں۔“ صلح جو انداز۔

”تیری باری بھی آئے گی بیٹا! لیکن گھر چل کر۔“ دانت پیس کر سجاد بھائی نے ذومعنی بات کی۔

کرمو جیسے اب خود تھاپانی میں سر سمیت ڈوب گیا۔ اب حضور کی حالت ہی گیارہ گئی تھی جو اپنا بھی

دفاع کر سکتے، کہاں بے چارہ بن ماں کا کرمو۔ گھر پہنچ کر اباجی نے اطلاع دی کہ وکیل کو بلاؤ، مجھے اس سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ سب کے انگ انگ میں خوشی دوڑ گئی۔ سالوں سے ابلیتی کڑھی کو جیسے تڑکا لگ گیا۔ شانت ہو گئے سارے صلاح مشورے سے کرمو کو پاس بٹھالیا گیا۔

”کیا چاہتا ہے تو کرمو؟“ طلال نے پوچھا۔ حالانکہ بلال تو پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ”چیزی، پازیب، چولی، گھنگھر میں سے کیا چاہتا ہے تو کرمو؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ کرمو نے سمجھتے ہوئے بولا۔

”تو کیا چاہتا ہے کہ ہم سڑکوں پر آ جائیں بچوں سمیت۔“ کچھ میں بس لپیٹ دینے والا غضب تھا۔ سات بہن بھائیوں، ان کے شوہروں، بیویوں، بڑے بچوں کی آنکھیں الگ باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ کرمو، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے ٹوٹ بٹوٹ کی طرح فر فر بولنے لگا۔

”خدا قسم ایسی بات نہیں۔“

”پھر کیوں اباجی کونت نئے مشورے دیتا ہے؟“ تقریباً بیس جانوں کے دانت پس پس گئے۔

”کون سے؟“ کچھ کے بچے والی مصومیت۔

”زیادہ چوچا۔“ ٹھٹھڑ کا خیال دل میں ہی دم توڑ گیا۔

”اوہ بھائی میرے (کیا مکاری تھی) یہ مرغیوں، بکروں کے مشورے کیا تیرے نہیں تھے۔ یہ

کمالیہ کی معیاری مہنگی کھدر جو جسم پر چھتی نہیں ہے۔ دودھ، زعفران، میوے، مچھلی، نہاریاں یہ خوش رہنے کے نت نئے گر، کیا تو نے نہیں بتائے اباجی!! کو“ اباحضور کہتے کہتے دل سے پتا نہیں کرمو شرمندہ ہوا تھا کہ نہیں پرچہ سے ضرور ایسا ظاہر کرنے لگا جیسے اسے ونڈی کی چیز نہیں ملی۔

”مجھے معاف کر دیں بھائی اوچھوٹے صاحب (اعلامکاری) مجھے معاف کر دیں۔“ کرمو نے ہاتھ جوڑے تو سجاد بھائی اقبال کے شاہین کی طرح پلٹ کر جھپٹے اور پھر پلٹے۔ اب شاہین کے آگے بھلا ٹوٹ

بٹوٹے چارہ کیا کرتا۔

”ٹھیک ہے لیکن ایک شرط پر۔“

”مجھے ہر شرط منظور ہے، بتا سنے ہی۔“ کرمو بن پانی کی پھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

”آئندہ اپنا منہ بند رکھے گا ہمیشہ کے لیے۔“

”جیسے آپ کہیں مالک، آقا۔“

”اپنے باپ کو فون کر دے۔ دیسی گھی، بکرے،

مرغیاں، باجرہ، سیلا چاول اب نہ لائے۔ گارڈن میں

سب جانوروں کو کل ہی ذبح کر کے فریج میں لگا

دے۔ اباجی پوچھیں تو کہہ دینا کہ بیماری آگئی تھی۔

ذبح نہ کرتا تو سب مر جاتیں اور منگوانے کو کہیں تو

گاؤں میں سیلاب لے آتا۔ کہنا سب بہہ گیا۔ کچھ

نہیں بچا۔“

”جی مالک جو آپ کی مرضی۔“

”اب دفع ہو یہاں سے۔“ پنگ پانگ گیند کی

طرح کرمو جیسے تپہ کھا کر بھاگا۔ سب نے سکون کا

سانس لیا۔

”یہ ہی سنو لیا تھا دیکھنا اب آگے سب ٹھیک

رہے گا۔“ تینوں بہنوں نے تائید کی۔ بھائیوں نے

رات کے لیے کمریں کس لیں۔

ڈنر کے بعد اباجی کو کمرے سے باہر لا کر صوفے

پر بٹھا دیا گیا۔ دھل دھلا کر اباجی میں پھر سے نئی

زندگی دوڑ گئی، جی ہاں پھر سے۔

”نتیجہ بھگت لیا اباجی آپ نے اپنی مرضی

کرنے کا۔“ سجاد نے شروعات کی۔ پھر سب نے

حصہ ڈالا۔

”ہم تو جو کہتے تھے آپ ہمیشہ ٹال دیتے تھے۔“

بلال بولا۔

”ڈاکٹر نے دیکھا کیا کہا ہے کہ بد پرہیزی کی

وجہ سے شوگر آپ کی بڑھ گئی۔ کو لیسٹرول آپ کا زیادہ

تھا۔“ رافقہ نے ٹو کا۔

”شکر کریں آپ کی ٹانگیں کتنے سے بچ گئیں

ورنہ ڈاکٹر نے تو آپ کی بے ہوشی کے دوران یہ خبر

بھی سنا دی تھی ہمیں۔“ رابعہ نے ڈرایا۔

”ہم ہی جانتے ہیں کہ ہم نے یہ چار مہینے کس

طرح گزارے ہیں۔“ طلال بولا۔

”لیکن افسوس اباجی کے آپ ہمارے ساتھ

ہمیشہ سوتیلوں والا سلوک کرتے رہے ہیں۔ بہت

افسوس ہے۔“ ظہیر نے کہا۔

لندن والی بہن نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا۔

اشارہ تھا کہ بہت ہو گئی۔ اب بس کرو، لیکن یہ طوفان

اب کہاں تھمنے والا تھا۔

”وزن آپ نے گوشت کھا کھا کر حد سے

زیادہ بڑھالیا۔ اوپر سے سر کے ساتھ بھنڈوں کو رگڑنے

کی کیا ضرورت تھی۔ ہمیں پتا بھی نہیں اور آٹھ مہینے

سے آپ کیمیکل زدہ آنکھیں لیے محوم رہے ہیں۔“

”ڈاکٹر نے بتایا ورنہ ہمارے تو فرشتوں کو بھی

علم نہ ہوتا۔ کرموں کے ساتھ جا کر چپکے چپکے علاج

کرواتے رہے ہیں۔“

”یہ عمر گھر پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کی ہوتی ہے۔

اور آپ ہیں کہ بھی ادھر، بھی ادھر جو بچہ باز پرس کرتا

ہے آپ اسے عاق کر دینے، گھر سے نکال دینے کی

دھمکی دے ڈالتے ہیں۔ حالانکہ جانتے بھی ہیں کہ

بچوں میں بھی آپ کا ہی خون ہے۔ ایک بار چلے گئے

تو زندگی بھر واپس نہیں آئیں گے۔“ سجاد کو خاموش

ہو جانا پڑا۔ باقی سب بہن بھائیوں نے مل کر گلا

صاف کیا تھا اور کھٹکھار تھا۔

صوفے میں دھنسنے والی اباجی بڑی براہِ راست خاموشی

لیے۔ اپنے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں کی سمجھتی سن

رہے تھے۔ سامنے نی دی پر بڑی مدھم آواز میں کوئی

گیت چل رہا تھا۔ کسی نیم اندھیرے کلب کا منظر تھا

درمیان میں بڑی پیاری سی لڑکی بیٹھی پیا نو بجاتی، بیٹھی

دھنیں نکال رہی تھی اسی کے ارد گرد چاروں طرف لگی

گول میزوں پر امراءِ تاش کی بازیاں سجائے بیٹھے

تھے۔ بڑا ہی دلکش منظر تھا۔ اباجی احتیاط کا گھڑدھر پہ

اٹھائے اس میں گم ہونے لگے تھے۔

”وعدہ کریں اباجی کہ آئندہ آپ بلا وجہ گھر

سے باہر نہیں جائیں گے۔“ سب نے مشترکہ بیعت

لینی چاہی دوسری طرف خاموش رہی سب نے اباجی

کو یوں نی دی میں گم دیکھا تو اپنی باتوں کی بے قدری

کا احساس ہوا۔ دلیلیں بے نتیجہ بے ثمر ہو گئیں۔ بچوں

کو جھڑکا گیا۔ نی دی کو فوراً بند کر دیا گیا۔ اسکرین بلیک

ہو گئی لیکن منظر کہیں اباجی کی بوڑھی کیمیکل زدہ،

آنکھوں میں ہی مرسم ہو کر رہ گیا۔ وہ تو تھے پانی سے

بھی زیادہ یہاں ڈوب چکے تھے گیت میں نی دی کیا

بند ہونا تھا۔ کیبل کا کنکشن بھی کاٹ دیا جاتا تو اب

کیا فائدہ تھا۔ اس بات کا اندازہ سب گھر والوں کو

ٹھیک دو ماہ بعد ہوا۔

اباجی نے سب سے وعدہ کر لیا کہ اب وہ غیر

ضروری گھر سے باہر نہیں جائیں گے۔ اس وعدے کی

پاسداری کتنے انوکھے ڈھب سے ہونے والی تھی،

ساتوں میں سے کسی کو گمان تک نہ تھا۔ اگلے دن وکیل

اور مستری اکٹھے گھر میں آئے۔ وکیل گھر کے

کاغذات بچوں کے نام کھنڈل کرنے اور مستری تیسری

منزل بنانے۔

”ڈیکھ لو..... ٹھوکر کھا کر ہی اندازہ ہوتا ہے

انسان کو۔“ ظہیر نے اپنی بیوی سے کہا۔

”تیسری منزل، بخوار ہے ہیں۔ احساس ہو ہی

گیا ہے کہ سجاد بھائی، بلال بھائی کے بچوں کے لیے

بھی اب پورشن کی ضرورت ہے۔“ کچھ ایسی ہی

سوچ سجاد، بلال اور ان کی بیویاں بھی رکھتی تھیں۔

”آپ کمرے اور باتھ روم تو پھر اپنی مرضی

کے بنوائیں یا پھر کم از کم نقشہ ہی دیکھ لیں۔“

”رہنے، دو اب اباجی جو بھی تجھے دیں۔“

”لیکن اباجی کے پاس پیسے کہاں سے آئے

ہوں گے۔ ہیں، رائے وٹڈ والی بانی دودو کانیں بھی تو

نہیں بچ دیں۔“

”دو اور فکس ڈیپازٹ تھے نا۔ شاید وہ ہی

ہوں۔“

”چودہ لاکھ میں کہاں بنتے ہیں آج کل گھر

سجاد۔“

”اباجی نے بچا کر بھی تو رکھے ہوں گے نا

تھوڑے بہت۔“ سجاد نے بیوی کو تسلی دی اور یوں کسی

کو پتا ہی نہ چلا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

سجاد، بلال نے تو کارپٹ، فرنیچر وغیرہ بھی

دیکھنا شروع کر دیا اور گھر میں دھنوں کی بیویوں نے

کمروں کے نت نئے ڈیزائن، کلر کا مینیشن تک منتخب

کر لیا، بہنوں کے الگ پیغام آ گئے کہ جب جب وہ

آیا کریں گی۔ اوپر کے نئے پورشن میں ہی رہا کریں

گی۔ اور یہ بھی کہ گانا بندھوانے کی رسم میں وہ سونے

کے جھکے لیں گی۔ خیر سجاد، بلال نے ہنستے ہوئے ہاں

بھی بھری تھی خوشی ہی اتنی بڑی مل گئی تھی انہیں اس

غبارے کی ہوادو ماہ بعد لگی۔

بچوں کے نام گھر کی رجسٹری کے کاغذات آ

چکے تھے۔ اور اوپر کی تیسری منزل بنا کر مزدور بھی جا

چکے تھے۔ کمرے وغیرہ تو تھے نہیں۔ بس ایک ہال سا

تھا اور ساتھ ایک لکڑی باتھ روم بھی..... اس ہال نما

تیسری منزل کی سیڑھیاں بھی باہر کو علیحدہ سے لٹاکی گئی

تھیں۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا..... پھر کرمو نے ہی

سمجھایا سب۔

وکیل رجسٹری تھا کر گیا تو ساتوں فی الحال سب

کچھ بھول بھال کر خوش اور مطمئن سے ہو گئے۔ لیکن

اباجی نے اوپر کے ہال کی بابت کچھ.....

— نہ بتایا اور نہ ہی رائے وٹڈ والی دودو کانوں کے

بارے میں۔ باہر آئے ایک ٹرک نے سارا معاملہ حل

کر دیا۔

کرمو جس نے خیالی سیلاب میں سارے

مرغے، مرغیاں، بکرے بہا دیے تھے اور ان کے

ساتھ ساتھ خود بھی بہہ گیا تھا) نے باہر آئے ایک ٹرک

اور اس میں لدے عجیب و غریب سامان کے بارے

میں سب کو بتا کر گویا کوئی خطرے کا الارم پہلے ہی بجا

دیا۔ گھڑیاں نے ایک ایک کر کے چودہ ٹن پورے

کیے۔ سب باہر کو لپکے۔

گیٹ سے منہ موڑے اور ان سب کو منہ

چڑاتے ٹرک میں سے انتہائی مہنگی کرسیاں اور ٹیبل

اُتر رہے تھے۔



ماوش طالب

پس از سیدہ کے اور ہے

زرینہ کو اس کی بیوی ہونے کا شرف حاصل تھا، مرغان مرغ سی، دلی پتی، دھیمابولتی اور اونچا سنتی کہ سسرال اور شوہر کی طرف سے ہونے والی لعن طعن اور بدسلوکی نے اس کی قوت سماعت پر کچھ مثبت اثرات نہ مرتب کیے تھے۔ یوں تو غلام دین نے اپنی ساری اولاد کو مقدور بھرتازوں سے پالنے کی کوشش کی تھی مگر آخری نمبر والے بیٹا اور بیٹی تو مانو آنکھ کا تارا تھے، یہ ہی وجہ تھی کہ وسائل اور آمدن نہ ہونے کے باوجود بالترتیب سترہ اور اٹھارہ سالہ گڑیا اور سلجوق کی خواہش پر اسی کالج میں ان کا داخلہ کروایا،

غلام دین بیس برسوں سے ایک کالج میں چوکیدار تھا، پکا رنگ، بڑی اور لال لالی آنکھیں کالے اور سفید بالوں کی ابھی ہوئی داڑھی، لمبا قد مگر بھاری جسم اور توند جو دردی کی پتلون کسنے سے مزید نمایاں ہو جاتی۔ چاق و چوبند اور ایمان دار غلام دین..... جسے اللہ نے کافی نواز رکھا تھا اولاد سے، خیر سے چار بیٹیاں اور تین بیٹے..... ساری آگے پیچھے جوانی کو چھوٹی، ساری دنیا کہتی تھی، غلام دین کی اولاد بڑی نیک ہے، پاکردار اور بااخلاق غلام دین کا سینہ پھول جاتا اور باپچیں یہاں سے وہاں چر جاتیں۔

مینگے واسن گلاسوں کے سیٹ، کراکری، باربی کیو کی مکمل رینج، ٹیبل کے اعلیٰ کور، چھریاں، کانٹے، پیچ، غرض اباجی نے گھر میں دل لگانے کا پورا سامان اکٹھا کر لیا تھا۔ آخر میں بس ایک چیز بچی رہ گئی۔ جس پر سب چکرا کر گرتے گرتے بچے۔

”بوجھئے کیا؟؟؟“

”پیانو.....“ ڈھکن اٹھائے بنا ہی سب کے ایک انگ کے تاریخ اٹھے اور یہ دھن مدھن ہرگز نہیں تھی۔ سجاد، بلال، رافیہ، رابعہ، طلال، ظہیر، فرح ایک دو بے کوپکارا گیا۔ کرموبلند آواز سے ہنسنے لگا۔

”اسے بھی اوپر تیسری منزل پر پہنچا دو۔“ اباجی نے مزدوروں سے کہا۔

”ظہیر میں تجھ سے کیا وعدہ کبھی نہیں توڑوں گا۔ کبھی جوا نہیں کھیلوں گا۔ صرف وقت گزاری کے لیے بازی..... بس صرف بازی..... خالی خالی بازی۔“ ان سب کو خالی خالی کر کے اباجی پیانو کے پیچھے پیچھے خود بھی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ رجسٹری سجاد بھائی کے ہاتھ سے اڑ کر پروان چڑھتی تیل پر جا گئی۔ ایک دو بے کو دیکھ کر سب نے ہونق چہروں کو خاموش زبان کے ساتھ اپنے اپنے دل کا حال کہہ سنایا۔ ایک دو بے کی قسمت پر ماتم بھی کر لیا اور رو بھی لیے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں۔

چوتھی منزل پر پہنچے مور شور کر رہے تھے اور ان کی آواز پر چاوی ایک اور آواز بھی تھی۔ جوتھنے میں نہیں آ رہی تھی..... کرمو کی ہنسی کی آواز، جواب آسمان چیرنے لگی تھی۔ پندرہ منٹ سے وہ مسلسل ہنس رہا تھا۔ ٹرک واپس جا چکا تھا۔ سب سامان دے کر اور ان سب کا سکون ٹوٹ کر قسمت کی ایسی قسم ظریفی۔ کرمود ہرا ہوا جا رہا تھا۔ ہنس ہنس کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ وہ باغ میں چت لیٹ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

کم بخت اتنے بلند بانگ قہقہے لگا رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی غم زدہ چہرے ایک دو بے کو دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔

”ان سب کو باہری سیڑھیوں سے چڑھا کر اوپر ہال میں پہنچا دو۔“ اباجی ٹرک کے مزدوروں کو چیف مسٹر کی طرح ہدایات دے رہے تھے۔

”یہ سب کیا ہے اباجی!“ پہلی رات کی بیوہ کا روپ دھارے ظہیر نے پوچھا۔ دل تو گواہی دے ہی رہا تھا کہ اب کچھ بھی پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

”ہاں بیٹے، اب میں گھر سے باہر نہیں جاؤں گا۔ تم سب سے کیا وعدہ جمھاؤں گا۔ گھر پر ہی رہوں گا۔ دوستوں کو گھر پر ہی بلاؤں گا۔ اسی لیے تو میں نے تیسری منزل تیار کروائی ہے۔“

”کیا؟ تیسری منزل.....؟؟؟“ سب چلائے کوئی اونچی لہروں کا سونامی آیا نہ آتش فشاں پھٹا۔ پھر بھی سب نے خود کو سلگتے لاوے میں جلتے ہوئے پایا۔ ساکت جسموں کے ساتھ قیامت کے روز کی افراتفری پھیل گئی۔ سب بکھر گئے۔ ویران آنکھوں میں ہلکری سفاکیاں۔ رقم ہو گئیں۔ ہوا میں اڑتی چیزوں نے بھی اس گھر پر سے اپنے راستے بدل لیے۔ فضا میں خاموشی چھا گئی۔ سوائے کرمو کی پھنسی بھٹن ہنسی کے۔

ٹرک سے اب ایل سی ڈی اتر رہی تھی۔ بہت بڑے سائز کی پھر تین چار مہنگی مہنگی پیننگز اتریں چھوٹا فرق، اے سی، پونٹ جو سائز کا کیرم بورڈ، لوڈو، تاش کے پکٹ، شیشے والی بڑی شطرنج، گلدان، پھول، ڈسکولائٹس، دیو ہیکل ساؤنڈ سسٹم، جو جب چلے تو کانوں کو اپنی آواز بھی سنائی نہ دے۔

برفیلے چہرے دل ہی دل میں سارے پیسوں کا حساب کتاب لگانے لگے۔

”ایک لاکھ، دو لاکھ..... تین، چار، چھ، دس، پندرہ، بیس لاکھ۔“

”بیس لاکھ؟؟؟“ کرمو زرا دل کھول کر ہنسنے لگا۔

کوشی کی رجسٹری بڑے بھیا کے ہاتھ میں تھی اور رائے ونڈ والی دودکانیں ٹرک میں فٹ ہوئی پڑی تھیں۔ سامان تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور کرمو کی ہنسی تھی کہ ٹھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔

شام تک ابا اماں کو خبر مل گئی، سچ رستے سے مڑنا پڑا۔ غلام دین کے اندر ایسی پکڑ دھکڑ چلی کہ کچھ بھانگی نہ دیتا تھا۔ ہاتھوں میں لرزش..... اور چہرے پر لہجوں میں مردنی چھا گئی، دور کہیں دل سے آواز آتی تھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا یہ ضرور کوئی غلط فہمی ہے۔

”میری بیٹی ایسا نہیں کر سکتی..... میری بیٹی ایسا.....“ جس وقت اس نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا، دماغ کے اندر اتنی شدید تکرار..... تھی کہ وہ دروازے پر ہی ڈھس گیا۔

☆☆☆

”تم لوگوں سے ویسے اسی بات کی توقع کی جاسکتی ہے، غلام دین یہاں ہوتا تو وہ لڑکی بھی یوں نہ بھاگ پاتی۔ تم میں سے کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ لڑکا اس کا بھائی ہے یا کوئی اور..... صد السوس، رکھا کس کام کے لیے ہے میں نے تم سب کو؟“

”اور لڑکی بھی کوئی اور نہیں غلام دین کی بیٹی..... منصور! تم مس اسارہ کو بھیجو میرے دفتر

کہ اعتماد اور کامیابی کا غلط فائدہ اٹھایا جائے۔

☆☆☆

یہ سالانہ امتحانی نتائج کے کچھ مہینوں بعد کی بات تھی، اس وقت کالج کے اندر کارڈورز میں مکمل خاموشی تھی، جب کہ کمرہ جماعت اساتذہ اور طلباء کی پُر مغز بحث سے گونج رہے تھے۔ منصور حسب معمول پرنسپل کے دفتر کے باہر سوئی جاگی کیفیت میں پہرہ دے رہا تھا، جب وہ بے پاؤں سیڑھیاں اترتی تھیں نہ نامی ایک طالبہ نے اسے پوری طرح بیدار کر دیا۔

میرون چادر میں خود کو حتی الامکان چھپائے وہ آخری سیڑھی اتر کر مڑنے والی تھی، جب منصور نے جمائی لیتے ہوئے اسے روکا، طالبہ ٹھٹک کر رہی۔

”ہاں جی بیٹا! کدھر جا رہی ہو؟“ لڑکی کو دیکھ کر وہ چونکا اور اپنے خاص مقامی لہجے میں کہا۔

”انکل! ہاف لیوٹی ہے میڈم سے، گھر جا رہی ہوں، ابا بیمار ہے نا۔“ وہ پریشان حال اور گھبراہٹ ہوئی تھی۔

”اچھا اچھا، جاؤ۔“ منصور پھر سے اونگھنے لگا۔

میرون دروازے پر پہنچی تو چوکیدار نے اجازت دے دی کہ اس کا بھائی اسے لے جانے کے لیے آیا کھڑا تھا۔

☆☆☆

غلام دین اور زرینہ دونوں کے قیام کے لیے بھگ جانے کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ گڑیا نے سلجوق کے ساتھ ہی واپس آنا تھا کالج سے..... مگر دو بج رہے تھے جب سلجوق حواس باختہ اکیلا گھر میں داخل ہوا۔

”آپا! گڑیا بھاگ گئی۔“

”کیا بکواس کر رہا ہے تو سلجوق، دماغ ٹھک ہے؟“ سلیمہ آقا تو بیل میں غصے کی تصویر بن گئیں مگر جب سلجوق کی دی گئی اطلاع سو فیصد درست نکلی تو اسی تصویر میں بے بسی کے رنگ بھی تیزی سے ابھرنے لگے۔

کی باتیں سننا وغیرہ۔

اماں کی بڑی کالی چادر لپیٹ کر گڑیا بھی ابا اور سلجوق کے ساتھ ہی نکلتی تھی لہذا لانے لے جانے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

آہستہ آہستہ گڑیا نے کالج کے ماحول کو سمجھنا شروع کر دیا تھا، وہ باپ کی طرح ہی ہوشیار اور کسی حد تک چرب زبان بھی واقع ہوئی تھی، سوائی ذہانت اور حاضر جوابی کے باعث جلد ہی اساتذہ کی پسندیدہ ٹھہری۔ ہفتہ وار، سہ ماہی اور ششماہی پرچوں کی محنت و مشقت سے ہوتے ہوئے سالانہ امتحانات میں اس نے دوم پوزیشن حاصل کی۔ غلام دین کا تو بس نہ چلتا تھا کہ ہواؤں میں اڑنے لگے یہ الگ بات کہ ہلکی ہوا اس کا بھاری وجود اٹھانے سے قاصر تھی۔

گڑیا اپنی کامیابی پر نازاں، اٹھلاتی پھرتی تھی

وہ لڑکیاں جن کے شاہانہ انداز دیکھ کر پہلے وہ بظاہر بے نیاز مگر اندر ہی اندر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی تھی اب اس کا اتنا شاندار نتیجہ دیکھ کر وہ خود سب کی سب انکشت بدindaں تھیں۔ دوسری طرف غلام دین کے پاس موقع تھا منصور کلرک کو نیچا دیکھانے کا کہ اس کی اپنی بیٹی تو اوسط درجے کی طالبہ تھی۔

”اب بولو منصور، لائی ہے کہ نہیں ہماری بیٹی تمہ، اب تو بات بن گئی نا۔“ شیریں لہجے میں ڈوبا طنز غلام دین نے اس سے کیا اور منصور کے لب سل گئے، اللہ جانے دل میں کیا تھا سبکی کا احساس، حسد یا رقابت.....

خیر یہ شوشا بھی کچھ دن تک لگا، غلام دین پہلے کی طرح اپنی ڈیوٹی پر کمر بستہ تھا اور گڑیا جو لگتا تھا اب گڑیا نہیں رہی کہ پڑھائی میں طاق تو پہلے ہی تھی اب اپنی امیر کیرئیر جماعتوں کو جواب دینے سے بھی نہیں ہٹتی تھی پھر اساتذہ کا دیا گیا اعتماد، اس کی شخصیت کو اور نکھارتا چلا گیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں

جہاں وہ نوکری کرتا تھا۔ کچھ اس کی برسوں پرانی نوکری اور محنت و ایمان داری کا صلہ کہ اس کے بچوں کو آدمی سے بھی آدمی فیس پر داخلہ مل گیا۔ حالانکہ بڑے بچے اپنے اپنے شوق کے پیش نظر ٹرل یا میٹرک ہی کر سکتے تھے مگر ان دونوں کا آگے بڑھنے کا جذبہ دیکھ کر غلام دین کو فخر محسوس ہوا، اسے یقین تھا کہ اس کے یہ بچے بہت آگے جائیں گے اور ضرور اس کا نام روشن کریں گے۔

کالج میں مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اس کے بیٹا بیٹی کا داخلہ بھی کالج میں ہو گیا ہے سو بدلے میں مبارک باد اور نیک تمنا میں وصول کیں، تاہم منصور کلرک کے رویے میں حسد کا کیلا ذائقہ محسوس ہوا۔

”کالج میں داخلہ ہونا خاص بات نہیں ہے، مزہ تو تب جب کوئی انعام کوئی تمغہ بھی وصول ہو۔“ اسے تکلیف تو بہت پہنچی مگر غلام دین جلد باز نہ تھا لہذا اس کے روکے انداز کا جواب کسی اور وقت تک ٹال دیا۔

☆☆☆

کلاسوں کا آغاز ہوا تو دونوں کے پاس روزی نت نئے قصے ہوتے، غلام دین چونکہ گڑیا کے گیمپس میں ہی چوکیدار کرتا تھا لہذا دونوں کو بڑا ہی سکون تھا۔ غلام دین کالج کی تقریباً ہر لڑکی کے چال چلن سے واقف تھا، وہ گیٹ پر بڑی ذمہ داری سے پہرہ دیتا تھا۔ لڑکی کے انداز و اطوار سے ہی بتا دیتا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ آئی ہے یا کسی اور کے ساتھ..... مگر پھر بھی اکثر واپسی پر کچھ لڑکیاں حیلہ بہانوں سے کالج کی مخصوص دین استعمال کرنے کے بجائے ”ادھر ادھر“ ہو جاتی تھیں۔ وہ اس بات سے بڑا عاجز رہتا تھا، جب ہر تیسرے دن لڑکیاں، اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگتی ہوئی پکڑی جاتی تھیں پھر استانیوں کو بتانا، والدین کو قائل کرنا اور سمجھانا، بھاگنے میں کامیابی ہو جانے کی صورت میں ٹیچر

سوچ نگر کی دانی



رحیمہ جمیل

قیمت

میں۔“ میڈم غصے سے پھنکارتی واپس دفتر میں جا کر بیٹھ گئی۔

”اللہ جانے آج کی نئی پود کو کیا ہو گیا ہے، یہ لڑکے لڑکیاں اتنے اٹھرے ہو گئے ہیں اور گڑیا تو غلام دین کی بیٹی..... اتنی لائق اتنی سمجھ دار.....“ ان کی بڑ بڑاہٹ مس اسرار کے آنے تک جاری رہی۔ غلام دین اس سے اگلے دن آخری بار کاغذ لکھا تھا، ترجم، ذلت اور تفت..... کیا کیا تھا لوگوں کی آنکھوں میں اس کے لیے..... مگر اسے صرف عینی شاہدین سے تصدیق چاہیے تھی۔ گڑیا کی سہیلیاں..... پیچرز..... چوکیدار.....

”انکل! وہ کافی دنوں سے کسی لڑکے سے بات کرتی تھی اور ہمیں کہتی تھی کہ میرے امی ابو کو پتا ہے۔“

”غلام دین صاحب! پڑھائی میں تو وہ زبردست تھی مگر کچھ دنوں سے لیکچرزدھیان سے نہیں سنتی تھی، میں نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ”میم! گھر میں کچھ مسئلے ہیں۔“

”یار! مجھے لگا تھا وہ نوجوان لڑکا تمہارا بیٹا.....“ دوسرے چوکیدار کو اس کی سرخ رنگت دیکھ کر خاموش ہونا پڑا، گیٹ سے نکلتے ہوئے منصور سے بھی سامنا ہوا جس کی آنکھوں سے تسخّر جھلکا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

”ہونہہ! تمہارے لڑکا تو تمہاری ہونہار بیٹی نے لے کر تمہارے منہ پر مار دیا ہے غلام دین! اب کیا کہتے ہو؟“ وہ نظریں جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ گھر پہنچا تو زرینہ آہ دیکا کرنے لگی۔

”ارے بچ تو بڑے چاؤ سے میری تیز رنگی کی ستاروں والی چادر نکلا کر لے کر گئی تھی، کہہ رہی تھی اماں آج کلاس میں چھوٹی سے پالٹی (پارٹی) ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس کی نیت اس چادر کو داغ دار کرنے کی ہے..... کیا کر دیا تو نے گڑیا ہمارے ساتھ۔“ سلو کے ابا! ہمارے ساتھ کیوں ہوا یہ.....

ہماری اولاد تو بہت نیک تھی۔ ارے ہم نے تو کسی کی بیٹی کے ساتھ برا نہیں کیا، بولو سلو کے ابا..... بولو.....“ اور غلام دین ٹھنک گیا، زرینہ تو محض تسلی بخش تصدیق ہی چاہتی تھی مگر غلام دین کچھ بول نہ سکا حالانکہ کے زرینہ کے ”کیوں“ کا جواب اس کے پاس تھا، صرف اسی کے پاس.....

☆ ☆ ☆ صدیاں نہیں ابھی کچھ برس ہی تو گزرے تھے، پنجم جماعت قبل ایک بیس سالہ اڑیل نوجوان ہائی اسکول سے گاؤں کی ایک لڑکی بھاگ کر لے گیا تھا۔ یہ اونچی ذات والوں کے لیے بڑی جگہ ہنسائی کی بات تھی، ان کی غیرت پر کاری ضرب لگانے والا اس کا کون مائی کالال پیدا ہو گیا تھا۔ پتا لگانے کے لیے گلی گلی اسے ڈھونڈا گیا، وہ نوجوان پہلے اسے اپنے والدین کے گھر لے گیا، فریاد کی کہ انہیں کچھ دن یہاں رہنے کی اجازت دے دی جائے مگر فریاد وری نہ ہو سکی ماں نے صاف کہہ دیا۔

”تو کیوں غیروں کا گندا اٹھا کے لے آیا اسے چھوڑ آ واپس، میں تجھے اس سے بڑھ کر دوہٹی لادوں گی۔“ لڑکی ہلکتی جاتی تھی کہ اب کچھ بھی ہو، جینا مرنا تیرے سنگ ہے، مجھے کسی کے دباؤ میں آ کر چھوڑنا نہیں۔“

پھر وہ اسے لے کر دوسرے گاؤں کی طرف جانے لگا کہ راستے میں لڑکی کے خزانہ بھائیوں نے ان دونوں کو آلیا۔ کم بخت لڑکی واسطے دیتی رہی مگر نوجوان جو اس کی محبت کا خراج تو وصول کر رہی تھا، مقابل کی دھمکیوں سے دب کر تین الفاظ کہہ ڈالے، اب وہ کرم چلی جانے یا اس کے غیرت مند بھائی۔

نوجوان جان بچ جانے پر اٹے پاؤں بھاگا اور ماں کے قدموں تلے بیٹھ گیا، بھولی ماں نے اپنے لال کے سات خون معاف کر دینے تھے، محض ایک کچے دھاگے سے بندھا نکاح ہی ٹوٹا تھا۔

کسی کی جان جاتی یا عزت..... یہ اتنی غور طلب بات تو نہیں تھی۔ اور وہ مائی کالال کوئی اور نہیں غلام دین ہی تو تھا.....

☆ ☆ ☆ غلام دین صحن کے وسط میں رکھی چار پائی پر بیٹھا سودوزیاں کے بیچ گھن چکر بن گیا تھا۔ ”واہ ری قدرت! تو نے میرا کیا میرے سامنے لا کر رکھ ہی دیا آخر، اب تو سکون مل جانا چاہیے مجھے..... تو پھر مجھے سکون کیوں نہیں مل رہا کہ سزا تو پالی میں نے بھی اپنے کیے کی۔“ اسی سکون کو محسوس کرنے کی خاطر اس نے گھر والوں کو تنبیہ کی کہ اب کوئی اس گھر میں گڑیا کا نام نہیں لے گا۔

مگر خود وہ تین مہینوں تک سوگ مناتا رہا، اس غریب کے سارے خواب کنڈی ڈنڈے تلے پس گئے تھے۔ اللہ جانے بد بخت کہاں ہوگی، اس لڑکے نے میری بیٹی کے ساتھ..... اس سے آگے اگر کچھ سوچتا تو شاید اس سے اگلی سانس بھی نہ لے پاتا۔ مکافات عمل کیا ہوتا ہے؟ یہ کوئی غلام دین سے پوچھتا۔

☆ ☆ ☆ اپنے اربابان خوب پورے کر چکنے کے بعد جب زندگی کی حقیقتیں آشکار ہوئیں تو اسے لگا جیسے فلانچم اپنی تمام تر کڑواہٹ اور پھیکے پن کے ساتھ آ کر اس کی زندگی کی ساری محاسن نچوڑ لے گیا ہے۔ وہ جس کے جھانسنے میں آ کر اس نے آسمان کو چھونا چاہا تھا وہ تو ڈال ڈال جی کلیاں توڑنے کا ماہر نکلا تھا، سو سارے خواب سراب ہوئے۔ اس نمائی کے ساتھ نکاح کا بیج نہ جانے کیسے پک گیا کہ پھر چند دنوں تک اس کے اندر کوئیل بھی پھوٹ پڑی اور گیارہ ماہ بعد سندس نے آ کر گڑیا کی گود ہری کر دی۔ مرد اپنی عورت کو شاذ ہی کچھ عطا کرتا ہے اور اگر عنایت کر دے تو پھر احسان جتائے بغیر بھی اسے سکون میسر

نہیں آتا مگر یہ ایک واحد تحفہ ہے جس کا مرد اپنی عورت کو احسان نہیں جتاتا اور گڑیا کے مرد نے بھی اعلان ظفر فی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ تمہاری اولاد ہے جیسے مرضی پالو..... پھر اس نے سوچا واقعی غلطی میری ہے کہ نو ماہ اپنے پیٹ میں حفاظت سے رکھے رکھا، اب خیمہ زہ بھی تو مجھے ہی بھگتنا ہے، لہذا درد کی ٹھوکروں کے بعد اسے نوکری مل گئی۔ آیا بننا اس کے لیے بڑا سود مند رہا، یہ الگ بات کہ وہ سمجھ نہ سکی کہ اپنا بچہ پالنے کے لیے دوسروں کے بچوں کی دیکھ بھال کر رہی ہے یا دوسروں کے بچے سنبھالنے کے سبب اس کا اپنا جتنا بھی پلتا جا رہا ہے۔“

اور شاید دوسری والی بات حقیقت کے زیادہ قریب تھی۔

کچھ زیادہ نہیں فقط اسے تب تکلیف ہوتی تھی جب اپنی ہم عمر لڑکیوں کو اتنی بے فکری سے کد کڑے لگاتے دیکھتی، وہ بھی تو ایسی ہی چمت تلے، ان ہی چادر یواروں اور کھلے کراؤنڈ میں سرشاری سے گھومتی تھی، پڑھتی تھی بے فکرے قہقہے لگاتی تھی۔ کسی مس کے بچے کا فیڈر بناتے ہوئے آنکھوں سے ٹپکتے آنسو جب سفید سفوف میں گھل جاتے تو علیحدہ سے پانی ملانے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

جب کوئی ٹیچر اپنی ساتھی سے کلاس کے نالائق بچوں کے حوالے سے بات کر رہی ہوتی تو دل چاہتا کہ فوراً جائے اور بتائے کہ.....

”مجھے دیکھیں مس جی! مجھے ایک موقع دے کر دیکھیں اور اپنی کلاس میں بیٹھنے دیں کہ کبھی میں بھی اپنے والدین اور اساتذہ کا فخر ہوا کرتی تھی۔“ کچھ زیادہ نہیں فقط اتنی سی تکلیف ہوتی تھی، یہ الگ بات کہ بار بار ہوتی تھی، ہر روز ہوتی تھی اور کبھی ہر لمحہ..... ہر وقت.....

☆ ☆ ☆ جونیر کلرک چھٹی پر تھی لہذا ایک ٹیچر کا پیغام دینے کی خاطر غلام دین کو اسٹاف روم جانا پڑا، جہاں



بار اپنا ماضی دیکھا تھا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ پرہیز
اسے پہلے تو کڑی سے نکالتی ہیں یا آیا کوئی چلن کریں
گی..... مگر بھلا ہوس فضیلہ کا کہ جنہوں نے گڑیا کی
پوری اور سچی کہانی سن کر اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ
جب چاہے دوبارہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے اور یہ
کہ اس معاملے میں وہ خود بھی اس کی مدد کریں گی
اور.....

گڑیا نے اس لمحے سوچا تھا انسان کس قدر
نادان اور جلد باز ہے کہ جس سے وہ بھاگتا ہے،
جان چھڑاتا ہے وہ شے بھی اسی شدت سے اس کا
پچھا کرتی ہے، اسے پانے کے لیے لپکتی ہے..... اور
جس چیز کے پیچھے ”انسان“ بے جا تک و دو کرتا ہے
اسے پانے کے لیے رسوائی مول لیتا ہے، وہ چیز اتنی ہی
اس سے دور چلی جاتی ہے۔ اگر مل بھی جائے تو سکون و
دخوشی سے خالی، بے وزن، بے کار برتن کی مانند۔
گھر والوں سے معافی طلبانی اور صلح صفائی کے
بعد اس نے وہاں آنا جانا شروع کر دیا تھا، گوکہ ابا اس
کے پروانے کی طرح منڈلائی طبیعت کے مالک
شوہر کو ہرگز پسند نہ کرتے تھے مگر بیٹی کا گھر آباد رکھنے
کے واسطے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔

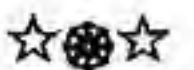
”ابا! کالج میں مس کہتی تھیں کہ ماں باپ کا کیا
اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے اور کبھی کبھار والدین کے کیے کی
سزا اولاد کی صورت انہیں ملتی ہے۔ مجھے تو بس ایک
بی فکر رہتی ہے کیا سندس بھی بڑی ہو کر میرے نقش
قدم پر چلے گی؟“

غلام دین لرز کر رہ گیا تھا گڑیا کی بات سن کر۔
بڑی بچے کی بات اس وقت اس کی سمجھ میں آئی تھی
کہ نسل صرف ماں کے ہاتھوں ہی نہیں سنورتی، باپ
بھی نسلوں کی بربادی و تعمیر میں برابر کا حصہ دار ہوتا
ہے، آخر کو خون نے تو سات پشتوں تک اثر دکھانا ہی
ہوتا ہے..... ہے نا؟



اساتذہ اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے ایک میجر
نے آیا کو مخاطب کیا۔
”شمینہ! یہ برتن دھو دو اور چائے بنا لاؤ۔“ غلام
دین نے دروازے پر کھڑے کھڑے آواز کی سمت
دیکھا اور پھر وہ جیسے بھول گیا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔
اشاف روم میں بیٹھے اساتذہ بھی اسے دیکھتے اور بھی
شمینہ کو جو اپنا منہ چھپانے کی فکر میں ہلکان ہو رہی
تھی۔

ہوتا ہے نا کبھی ایسا جب آپ کسی اپنے کی
امیدوں پر پورا نہیں اتر پاتے۔ جب آپ اپنے
پیاروں، بہت پیاروں کی آنکھ میں دھول جھونک
دیتے ہیں تو پھر آپ ان کی نظروں سے بھی گر جاتے
ہیں اور کس اذیت سے گزرتے ہیں۔ آپ جب
عقلی کے احساس کی لہر آپ کے وجود سے ٹکراتی ہے
اور یہ ہی وقت ہوتا ہے جب آپ اپنی نظروں سے
بھی گر جاتے ہیں۔ گڑیا اور غلام دین اس وقت اسی
اذیت کی کیفیت سے دوچار تھے، وہ دونوں اس
وقت ایک ایسے قلعے میں قید تھے جہاں چاروں
طرف پچھتاؤں اور اذیت نے محاصرہ کر رکھا تھا۔
شمینہ عرف گڑیا ابھی کچھ دن پہلے ہی تو کالج
میں بطور آیا لگی تھی۔ کالج کے نچلے اشاف میں خبر
پھیلی تھی، سب ہی سے نئی آیا کی ملاقات ہوئی تھی مگر
غلام دین کو کسی سے ملنے یا بے تکلف ہونے کی
ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی کہ اب وہ ایک ان دیکھے
خول میں بند ہو کر رہنے لگا تھا مگر اس کے وہم و گمان
میں بھی نہ تھا کہ نئی آنے والی آیا کوئی اور نہیں بلکہ اس
کی چھٹی اور لاڈلی بیٹی ہوگی مگر اب پچھلے سارے
وہم، شک اور کاش مجسم ہو کر اس کے سامنے کھڑے
تھے۔



پھر اگلے دو دنوں میں پورے کالج میں بات
پھیل گئی کہ آیا شمینہ، چوکیدار غلام دین کی بھاگی ہوئی
بیٹی ہے مگر غلام دین کو پروا نہیں تھی۔ اس نے تو اسی
دن اپنی بیٹی کو معاف کر دیا تھا جس دن آئینے میں پہلی



لکھنؤ

تیز برقی بارش اور سماعتوں میں کسی کے تیز چہیتے جملے، یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں بمین آفندی اور سمیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہر ماہ یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہر ماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

بمین آفندی، آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا خان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں۔ تالی جان، بمین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں، ان کی بیوی شمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہو جانے کی وجہ سے مہر ماہ کا رابطہ نمبر سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ وقار آفندی اور زرنگار آفندی کی محبت اور آفندی کی بے بسی کے بارے میں سوچتی رہ جاتی ہے۔

وہ موحد کے آفس میں رابطہ کر کے اس سے ملنے کا کہتی ہے کہ وہ گھر آ کر بات کرنے کا کہتا ہے۔ وہ اس کے آفس پہنچ کر اس کے سامنے نمبر کی داستان سن کر اس سے ہمدردی محسوس کرنے کا کہتی ہے۔ موحد کہتا ہے کہ اس کی پوری کہانی سن کر فیصلہ کرنا کہ وہ کس چیز کا حق دار ہے۔ سزا یا معافی۔

ملاح نے ڈرائیور کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔ اور کبیر کے لیے اس کے دل میں شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ کبیر اسے کالج سے واپسی پر لینے آتا ہے اور اپنے گھر لے جا کر اسے اپنی ماں، بہنوں سے ملاتا ہے۔ نمبر فون پر مہر ماہ کو اپنی ادھوری کہانی سناتا ہے۔ آغا جان مہر ماہ سے بات کرتے ہیں۔ اور نمبر سے نکاح قائم رکھنے پر اسے سخت سست سناتے ہیں۔ وہ نمبر کی حمایت کرتی ہے تو وہ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ مہر ماہ فون پر نمبر سے کہتی ہے کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ ہامی بھر لیتا ہے۔ ملاح، موحد سے مدد مانگتی ہے۔ وہ اس کے لیے کوئی رشتہ لاتا ہے۔ ملاح ناراض ہو جاتی ہے۔

مہر ماہ، نمبر آفندی سے ملنے کبیر کے ساتھ جاتی ہے اور اسے باہر انتظار کرنے کا کہہ کر ریسیورنٹ کے اندر چلی جاتی ہے پہلے سے بک کی ہوئی ٹیبل پر اس کا انتظار کرتی ہے۔ کہ اچانک ایک آواز پر چونک جاتی ہے۔

زرنگار کی کہانی جان کر مہر ماہ آفندی ہاؤس والوں کی بے بسی اور کبیر پر دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ موحد کو بلا کر اس سے بات کرتی ہے۔

موحد ملاحہ کے لیے رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔ تو ملاحہ بہت افسردہ ہوتی ہے۔ وہ کبیر کو چاہتی ہے۔ موحدا سے ہے کہ کبیر گھر چھوڑ گیا ہے اور اس نے آفس سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات بھی چرائ لیے ہیں۔
نمیر آفندی مہر ماہ کو راستے میں ملتا ہے۔ وہ اسے تھمڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔
موحد ملاحہ کے لیے جو رشتہ لاتا ہے۔ ان کی شان و شوکت دیکھ کر سارہ چچی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ جبکہ مدید پریشان ہے۔

تیسویں قسط

”شدید مینٹل اسٹریس (ذہنی دباؤ) کی وجہ سے دل پر بھی دباؤ پڑا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کریں کہ ان کی جان بچ گئی۔ ورنہ اس عمر میں ہارٹ ایک ہو یا نروس بریک ڈاؤن، خطرناک ثابت ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر دواؤں کے نسخے لکھ مسکن دوائیں لکھتے ہوئے تادیبی انداز میں مبین آفندی کو بتا رہا تھا۔ آج مسلسل تین دن کی سیریس شن کے بعد آغا جان کی طبیعت سنبھلی تھی۔

”اور اب کوشش کریں کہ گھریلو پریشانیوں سے مریض کو بچائیں تاکہ وہ اسٹریس فری رہیں۔“ ڈاکٹر نے رض نبھا دیا جبکہ اثبات میں سر ہلاتے مبین آفندی دل ہی دل میں گھر میں موجود مستقل اسٹریس (موحد کی) کو کوس رہے تھے جس کی وجہ سے آج آغا جان اسپتال میں تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ اس دوران مبین اور آفندی کی ناگواری جھیلنے اور باتیں سننے کے باوجود ساری بھاگ دوڑ خاموشی مگر پوری ذمہ داری کے ساتھ نے ہی کی تھی۔ آغا جان کو اسپتال لانے سے لے کر ایمر جنسی میں ڈاکٹر تک کو آدمی رات تک لائن حاضر رہا۔ اب تک کہ ان کی حالت خطرے سے باہر نہ ہوگئی لیکن اتنی مہربانی ضرور کی کہ اب جبکہ آغا جان کو ہوش آچکا تھا ان کے سامنے نہیں آیا۔ جس پر دونوں بھائیوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

☆☆☆

”آغا جان کو چاہیے کہ شمرہ اور موحدا کو واپسی کا راستہ دکھائیں۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا ناگن بن کر لوٹی رہ۔ سنبولیا تیار کیا ہوا ہے اس نے ہمیں ڈسنے کے لیے۔“ صدیقہ بیگم نے نفرت سے کہا تو مبین صاحب نے کی۔

”اب یہ سب آغا جان کے سامنے کہنا مت شروع کر دینا۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے انہیں پریشان کرنے

”وہی تو کہہ رہی ہوں، جو مستقل پریشانی ہے اسے ختم کریں آپ اور مہر کو واپس بلائیں۔ اس کی وہاں کی کیا تک بتی ہے اب۔“ صدیقہ بیگم دونوں بیٹیوں سے برگشتہ ہو رہی تھیں۔

”ہماری تو اولاد نے ہی ہمیں خوار کر رکھا ہے۔ اس سے تو اچھا تھا چپ چاپ طلال ہی کے ساتھ رخصت ہوتے مہر کو۔ موحدا کے ساتھ بھی تو نکاح پر ہی نکاح کیا نا۔“

ان کی باتیں سن کر مبین صاحب کا سر جھٹکنے لگا۔ ”خدا کا واسطہ ہے، چپ ہو جاؤ تھوڑی دیر کے لیے۔“

”مہرے چپ ہونے سے قسمت بدلے گی اور نہ ہی حالات۔“ وہ چپ ہوتے ہوئے بھی عادت سے ہنسنے لگی۔ ”آپ جیل کروائیں موحدا کو یا تھپا لیا جائے گا۔“ وہ دھیمی پڑیں۔

”آپ جیل کروائیں موحدا کو یا تھپا لیا جائے گا۔“ وہ دھیمی پڑیں۔

”کیسے جیل کروادوں؟ آغا جان نے پاور آف اتارنی اس کے نام کر رکھی تھی۔ وہ ہر فیصلہ کرنے کا حق رکھتا تھا۔ اپنے پیروں پر انہوں نے خود کلہاڑی ماری ہے۔“ وہ بھنا کر بولے۔
”ایک طرح سے تو آغا جان کا بھی صحیح علاج ہوا۔ ساری عمر پوتے کو روٹے رہے اور اسی پوتے نے دھول چٹائی آکر۔“

”فضول مت بولو۔“ مبین صاحب کو باپ کے روتے کا خیال تھا، تنبیہ کی تو وہ چمک کر بولیں۔
”ایسے ہی..... ساری عمر میری بچیوں کو وہ حیثیت نہ ملی اس گھر میں جو آتے ہی اس شمرہ کے بیٹے کو ملی۔ کیسے سر آنکھوں پر بٹھایا اسے۔ اب وہی بیٹھ کر ان کے بال اور پلکیں نوچ رہا ہے۔“

”اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تو آگے کا سوچنا ہے کہ موحدا سے سارا مال نکلویا کیسے جائے۔“ وہ جانتے تھے کہ لکیر پینے کا مطلب ہے مزید وقت ضائع کرنا اور اس کے وہ محتمل نہیں ہو سکتے تھے۔ سوان کا ذہن مسلسل اسی بات کو سوچ رہا تھا۔
”شمرہ سے بات کریں۔“

”کیا فائدہ..... سب کچھ تو اس الو کے پٹھے کے اکاؤنٹ میں ڈال دیا ہے اس نے۔“ انہوں نے نفرت سے نمیر کا تذکرہ کیا۔ ”اس کے اپنے اکاؤنٹ میں ہوتا تو کسی طور نکلوا ہی لیتے۔ اب تو بہت طریقے سے گھیرنا ہوگا اسے۔“

”نمیر کی ماں ہمارے پاس موجود ہے مبین صاحب۔ اسے استعمال کر سکتے ہیں ہم۔“ انہوں نے شوہر کو مشورہ دیا۔

”موحد جیسے خبیث شخص کا کیا بھروسہ۔ وہ نمیر کے ساتھ مل گیا ہے اور تو اور شمرہ بھی شاید۔“
”شاید نہیں یقیناً۔“ صدیقہ بیگم دانت کچکچا کر بولیں۔ ”شمرہ کو سب پتا ہوگا۔ وہ کبیر والے ڈرامے میں بھی اس کے ساتھ شامل تھی۔“

”چلو، سوچتے ہیں اس بارے میں۔ کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی ہے۔ ہماری ساری عمر کی کمائی لگی ہوئی ہے اس بزنس میں۔ ہمارے ذاتی اکاؤنٹس کو چھوڑ کر، درحقیقت تو سارا مال اکاؤنٹس میں ہی تھا۔ بزنس سرکل چلا رہا تھا سارا روپیہ۔ اب تو ٹھپ ہے سب کچھ۔“ انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا تو صدیقہ بیگم کو بھی اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

☆☆☆

مہر ماہ شدید شاک کی زد میں تھی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ تین ساری حقیقت طلال کو بتانے کی بے وقوفی کر سکتی ہے۔ اور اصل جھٹکا تو اسے طلال کے انداز پر لگا تھا کہ وہ سارے معاملے کا علم ہو جانے کے بعد بھی اسے ورغلا رہا تھا۔ پھر سے ان ہی راستوں پر لوٹنے کی دعوت دے رہا تھا۔ مگر آغا جان کی اچانک طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ذہن سے سب کچھ بھٹک سے اڑ گیا اور دوبارہ بھی یاد نہ آتا اگر آغا جان کے گھر شفٹ ہونے کے بعد ان کی دوبارہ عیادت کے لیے تین تین کے ساتھ آیا طلال، موقع پا کر مہر ماہ کی راہ میں نہ آ جاتا۔ وہ چائے بنا کر پیش کرنے کی ذمہ داری ملاحہ پر چھوڑ کر واپس شمرہ کے پورشن میں جا رہی تھی جب آغا جان کے کمرے سے نکلے ہوئے طلال سے ٹکراؤ ہو گیا۔

وہ تاثرات کو سیاٹ بناتی اسے نظر انداز کر کے نکل جاتی مگر وہ نہ جانے کن طوفانوں کی زد میں آیا ہوا تھا کہ

کسی بھی بات اور اس گھر میں اپنے مقام کی پرواہ کیے بنا، مستعمل انداز میں مہرماہ کا بازو، ہاتھ کی گرفت میں جکڑ کر اسے تقریباً کھینچتا ہوا رہداری کے پچھلے سرے کے موڑ تک لے گیا جو شمرہ کے پورشن سے جا ملتا تھا۔ وہ جو طلال کی اس غیر متوقع بے ہودگی پر حیران اور شکا کڈی اس کے ساتھ کھینچتی چلی گئی تھی، رکتے ہی ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کروایا۔

”ہاؤڈیر یو ٹو بی ہیو لی لائک دس؟ (تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے ایسا رویہ رکھنے کی)“
”شش..... بس، بس کرو مہرماہ! سب جان چکا ہوں میں تمہارے دکھ، تمہاری تکلیف۔ مجھ سے تمہاری بے وفائی تو صرف ایک مجبوری تھی۔“ وہ آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت لیے کہہ رہا تھا۔ جیسے خوف پر خوشی غالب ہو۔

کھودینے کے خوف پر پاپالینے کی خوشی کا تاثر غالب آ رہا تھا۔
مہرماہ کو اس تاثر سے خوف سا آیا مگر وہ لہجے کو سخت کرتے ہوئے درشتی سے بولی۔
”مجھے نہیں پتا تم کیا فضول باتیں کر رہے ہو، تم میرے راستے سے طلال!“
”نہیں مہرماہ! اب نہیں۔ اب میں تمام اصلیت جان گیا ہوں۔ یہ سب تقدیر کا کھیل تھا اور نہ تم تو کبھی مجھ سے بے وفا ہوئی ہی نہیں تھیں۔“ وہ جذباتی ہوا۔

”جو ہوا سو ہوا طلال! اب ہم دونوں کے راستے اور زندگی الگ ہے۔ براہ کرم میرے راستے میں مت آؤ۔“ اس نے سنجیدگی سے کہہ کر جانا چاہا، مگر وہ اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔
”ایک ہو سکتی ہے مہر! میرے نکاح میں تمہاری سگی بہن تو نہیں۔“ وہ بے قراری سے بولا تو مہرماہ کا جی چاہا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے۔

”بی ہو یو ر سیلف طلال! اپنا مقام و مرتبہ دیکھو اس گھر میں اور بات کرنے کا انداز دیکھو۔ اس گھر میں تمہاری ساری عزت و تین کے ساتھ مسلک تمہارے رشتے کی وجہ سے ہے، یہ منہ بولا۔“
”میرا پہلا رشتہ تم سے تھا مہر! اور تم..... تم نے مجھے کیوں نہ بتایا اس افتاد کے بارے میں جو تم پر آن پڑی تھی۔ ہم دونوں مل کر اس کا حل نکال لیتے مگر میں تمہارا انتظار کرتا۔۔۔ ساری زندگی۔“ وہ جذباتیت کی انتہا پر تھا۔ مہرماہ اسے دوبارہ مل سکتی ہے، اس سوچ نے عقل و خرد کو ماؤف کر دیا تھا جیسے۔
مہرماہ دنگ رہ گئی۔

”نمبر کون ہے؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا اس زبردستی کے نکاح کے بارے میں۔“ وہ پوری معلومات کے ساتھ آیا تھا۔ مہرماہ بے جان سی ہو گئی۔

اپنے کمرے سے نکلتے موجد نے جذب سے بھرا یہ لہجہ بہت صاف سنا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوم کر اس طرف آیا اور آتے ہی کالر سے تمام کر دکھائیتے ہوئے طلال کو سامنے دیوار سے لگا دیا۔ وہ اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہیں تھا، گڑبڑا کر صورت حال کو سمجھتا ہی رہ گیا۔

”اس نے نہیں مگر میں نے تمہیں ضرور بتا دیا تھا کہ اس سے دور رہنا، تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تھی میری بات۔“ موجد بولا نہیں غرایا تھا۔

اول جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے طلال نے اپنا کالر چھڑاتے ہوئے موجد کی آنکھوں میں دیکھ کر تلخی سے کہا۔
”تم کس حیثیت سے یہ قدغن لگا رہے ہو مجھ پر؟ کون ہو تم اس کے نقلی شوہر؟“

”بکو اس بند کرو۔“ موجد کا مکا اٹھا مگر مہرماہ نے پوری ہمت جمع کر کے اس کا وہ بازو اپنے دونوں ہاتھوں کی

سخت گرفت میں جکڑ لیا۔

”دفع کرو موجد! جانے دو اسے۔ یہ ہوش میں نہیں ہے۔“

”مارنے دو مہر! میں مکمل حواس میں ہوں اور اس رشتے کی ساری اصلیت جان چکا ہوں۔ اب پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“ طلال نے اطمینان سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اتر آئی تھی۔ موجد نے تمللا کر مہرماہ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا تو وہ بیچ میں آ کر اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اسے دھکیلتی طلال سے پرے لے گئی۔

”دفع کرو موجد! یہ ترین کا شوہر ہے۔ اس گھر کا داماد ہے، یہی سمجھ کر معاف کر دو۔“ اس کی سرخ ہوتی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، نرم مگر تینبی انداز میں کہا تو وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔
”مہر! وہ رشتہ تو مجبوری کا ہے، تم ساتھ دو تو میں.....“ طلال یہ موقع گنوا نا نہیں چاہتا تھا مگر مہرماہ نے اس کا مطلب سمجھ کر درمیان سے ہی اونچی آواز میں ٹوک دیا۔

”وہ رشتہ مجبوری کا ہو سکتا ہے مگر.....“ وہ کہتے ہوئے رکی پھر بہت ہمت کر کے موجد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اسے ذرا اونچا کیا۔ ”مگر یہ رشتہ مجبوری نہیں ہے طلال!“
”مت بھولو کہ تم کسی اور کے ساتھ ایک زبردستی کے بندھن میں بندھی ہو۔ اس شخص کے ساتھ تو تمہارا کوئی تعلق ہی نہیں۔“

”میرا ہر تعلق اسی تک آتا ہے طلال! آج تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔ تمہیں تو میں نے اسی روز دل سے نکال دیا تھا جس دن تم نے ترین سے شادی کی تھی۔“ وہ اپنے ہر لفظ پر زور دے کر بولی تو پیچھے کھڑے موجد کے دل میں ٹھنڈک سی اترتی چلی گئی۔

”میں اسے چھوڑ دوں گا مہر!“ طلال نے فی الفور فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔
”مگر مجھے اترن کی عادت نہیں ہے طلال!“ مہرماہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر جتانے والے انداز میں قطعیت سمو کر بولی تو وہ جہاں کا تھاں رہ گیا۔

”اور اگر تم ہم سے کوئی تعلق رکھنا چاہتے ہو تو وہ یہی ہو سکتا ہے کہ تم میری کزن کے شوہر اور اس گھر کے داماد ہو اور بس..... آئندہ میری راہ میں آؤ گے تو میں پرانی دوستی کا بھی لحاظ نہیں کروں گی۔ اگلی بار شاید موجد کے بجائے مجھے تم پر ہاتھ اٹھانا پڑے کیونکہ میں بھی تمہاری بدتمیزی کو برداشت نہیں کروں گی۔“

”چہ خود ووب.....“ وہ بے درپے ملنے والے تکلیف دہ جھکوں سے سنبھل کر جی واسپہزاء سے بولا۔
”تو بات یہ تھی مہرماہ آفندی کہ تم دل سے میرے لیے مخلص نہیں ہی نہیں۔ نیمیر آفندی کا تو بہانہ مل گیا تھا تمہیں۔ درحقیقت یہ شخص دیوار بنا تھا ہمارے درمیان۔“ طلال کی جذباتی طبیعت، پھر سے بھڑک کر بولا تو موجد کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی وہ طلال کی طرف رخ کرتے ہوئے سرد مہری سے بولی۔

”تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو طلال! کیا اب میں سمجھ لوں کہ تم دوبارہ ہمارے راستے میں نہیں آؤ گے؟ کیونکہ کسی کی راہ کھولنی کرنے والے اکثر اپنا ہی راستہ بھول جایا کرتے ہیں۔“

وہ آنکھوں میں شعلے لیے پیروں تلے زمین رو نہتا باہر نکلا تھا۔ مہرماہ نے گہری سانس بھری۔ موجد نے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ سرد تاثرات لیے اس کی طرف ہٹتی۔

”یہ کیا تماشا شروع کیا ہے اس نے پھر سے؟“ وہ ناگواری سے پوچھ رہا تھا۔

”وہی..... جس کی شروعات تم لوگوں نے کی تھی۔ تین نے حقیقت بتادی اسے تو وہ دوبارہ اپنا پروپوزل لے آیا۔“ کاٹ دار لہجے میں جواب دیا تو موحد لمحہ بھر کو چپ رہ گیا۔ مہرماہ نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

”تمہارے دل میں بہت درد تھا نامیر آفندی کا۔ شرہ آنٹی کا بیٹا ہو کر بھی تم نے وقار آفندی کی موت کا بدلہ لیا۔ اب میں واپس جا رہی ہوں اسے گھر، تم لوگ مل بیٹھ کر آگے کی کہانی سوچ لو کہ زرنکار آنٹی کا کیا کرنا ہے۔“ وہ آزدگی بھرے لہجے میں کہتی چلی گئی۔ موحد دوسرے ہاتھ پر مکا مار کر رہ گیا۔

☆☆☆

کبیر کی آمد نے گھر والوں کو تو ششدر ہی کر دیا تھا۔ فرزند دوڑتی ہوئی ملاحہ کو بتانے بھاگی تو وہ یونہی دل پہ ہاتھ رکھے، بے یقینی سے فق ہوتا چہرہ لیے نیگے وں ہی بھاگتی چلی آئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں موجود تھا اور اندر صدیقہ بیگم داخل ہو رہی تھیں۔ ملاحہ پردہ پکڑے ہیں دہلیز پر کھڑی ہو گئی۔ نظریں تھیں کہ جھروکے سے دیکھتیں مگر سیراب ہونے میں ہی نہ آتی تھیں۔ اونچا لمبا ناندار مرد..... جس کو اللہ نے گویا شربت کے رنگ سی طسماتی آنکھوں سے نوازا تھا۔ ملاحہ منجمد تھی۔

”آغا جان کی طبیعت کی خرابی کا پتا چلا تھا، سوچا عیادت کر لوں۔“ وہ احتراماً کھڑا ہوا تھا۔ صدیقہ بیگم نے ملگتی نظر اس پر ڈالی اور کڑے لہجے میں بولیں۔

”تمہیں تو اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے بھی ہزار بار سوچنا چاہیے تھا۔ جس کی عزت کا بھی پاس نہیں رکھا گیا تم سے۔“

”الحمد للہ، میں نے ہمیشہ اس گھر کی عزت کا اپنی عزت کی طرح خیال رکھا ہے۔ مجھے یہاں آتے ہوئے کسی قسم کا ذر خوف یا شرمندگی ہرگز نہیں تھی۔“ وہ ادب سے بولا تو صدیقہ بیگم کا پارہ ہانپی ہونے لگا۔

”بے شرموں کی یہی نشانی ہوا کرتی ہے، انہیں اپنے کیے پر کوئی شرمندگی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کی آنکھ میں نیا ہوتی ہے۔“ وہ طنز سے بولیں تو کبیر خان کا چہرہ ضبط سے لال ہوا۔

”میں یہاں صرف آغا جان کی عیادت کے لیے آیا ہوں، ان سب باتوں کا جواب کسی اور وقت طلب کر لیجئے گا۔“ صدیقہ بیگم کا دماغ گھوم گیا۔

”بات تو تم سے بعد میں ہوگی۔ پہلے تم وہ سارا پیسہ واپس کرو جو موحد کو مہرہ بنا کر نکلوایا ہے تم نے۔“

”میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا، ہم دونوں میں ڈیل ہوئی تھی۔ انہوں نے میری زمین خرید کر مجھے رقم ادا کی ہے اور بس۔“

”بڑا اچھا کیا تم نے، شرم تو نہیں آئی ہوگی، جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ جس گھر میں تمہیں عزتوں کا رکھوالا بنایا گیا وہیں پر نقب لگائی تم نے۔“

صدیقہ بیگم کسی کا بھی دماغ خراب کرنے میں مہارت رکھتی تھیں یہ تو اللہ ہی جانتا تھا کہ کبیر کس طرح ضبط کیے ہوئے تھا۔

”میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں اور میں یہ سب باتیں سوچ کر نہیں آیا تھا اور رہی شادی کے پروپوزل کی بات تو شادی کا پیغام تو کسی گھر میں بھیجا جاسکتا ہے۔“

صدیقہ بیگم تلملا اٹھیں۔ ”آدی کو پہلے اپنی حیثیت دیکھنی چاہیے پھر کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔“

”الحمد للہ..... اللہ کا بڑا احسان ہے مجھ پر، پیسہ جائیداد سب کچھ ہے میرے پاس۔“ وہ دنیا کا مطمئن ترین

انسان دکھائی دے رہا تھا۔

دفعتاً صدیقہ بیگم کو اپنے بینک اکاؤنٹس یاد آئے جنہیں موحد نے خالی کر ڈالا تھا۔ انہیں گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ ان کے سامنے بیٹھا ان کا ڈرائیور آج لاکھوں کی پراپرٹی اور رقم کا مالک تھا اور وہ لوگ شاید خالی ہاتھ ہو چکے تھے۔ اسی وقت موحد ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، ملاحہ خاموشی سے ایک طرف ہو گئی مگر واپس نہیں پٹی۔ اس کا دل تو اندر بیٹھے کبیر خان میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر گرجوٹی سے موحد سے ملا، تائی جان کی آنکھیں جلنے لگیں۔

”اس سے کہو یہ یہاں سے واپس چلا جائے۔ تمہاری مہربانی سے پہلے ہی آغا جان موت کو چھو کر واپس آئے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اب کی بار انہیں یہ موقع بھی نہ ملے۔“

تائی جان نے موحد کو بھی رگید ڈالا۔

”گھر آئے ہوئے مہمان کی عزت کرنی چاہیے اور کبیر تو اس گھر کا ایک فرد رہا ہے جس پر سب سے زیادہ اعتبار کیا جاتا تھا۔ آغا جان نے اسے اپنا دست راست بنا رکھا تھا۔ اتنی جلدی بھول گئے آپ لوگ۔“ موحد نے سختی سے انہیں یاد دلایا تو وہ چیخ کر بولیں۔

”اور اس نے اسی اعتبار کا خون کیا ہے، یہ بھی یاد ہے ہم سب کو اور تم خود کیا ہو موحد! تم نے تو ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔“

”حق دار کو اس کا حق دینے کو اگر آپ چھرا گھونپنا سمجھتی ہیں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔“ وہ بے رخی سے بولا تو صدیقہ جھلبلا کر بولیں۔

”بہر حال آج اس کی سب غلط فہمیاں دور کر کے بھیجنا اور خوش فہمیاں بھی۔ آغا جان کسی سے نہیں ملیں گے۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہوا ہے۔“ پھر لفظوں کو چبا کر سختی سے بولیں۔ ”خاص طور پر دھوکے بازوں سے۔“ وہ تنہائی ہوئی باہر نکل گئیں۔ ان کے نکلنے سے پہلے ہی ملاحہ تیزی سے وہاں سے ہٹ چکی تھی۔

موحد گہری سانس بھرتا ہوا کبیر کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”مجھے پتا تھا یہی ہوگا۔“ کبیر آزدگی سے بولا۔

”ہونے پر چھپتانے سے بہتر ہے کہ آگے کی راہ نکالی جائے۔“ موحد نے تادیبی انداز میں کہا۔

”میں ان لوگوں کی فطرت سالوں سے جانتا ہوں۔ اپنے لیول سے نیچے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے یہ۔“

”اب دیکھیں گے ان شاء اللہ..... کیونکہ یہ لوگ اب اس لیول سے کافی نیچے آ چکے ہیں۔“ موحد مسکرایا۔

”آغا جان کی طبیعت کیسی ہے اب؟“

”پہلے سے بہتر ہیں، سننے میں آیا ہے۔ میں تو خیر ابھی تک ان کے پاس نہیں گیا۔“ موحد نے شانے جھٹکے پھر وہ کبیر کا پریشان چہرہ دیکھ کر اسے تسلی دینے کی خاطر مسکرا کر بولا۔

”تم قلمت کرو۔ تمہارے دل کی دنیا دیران نہیں ہوگی ان شاء اللہ۔ شادی کی تیاری شروع کرو تم بس، ان سب کو راضی کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

کبیر بے ساختہ مسکرا دیا۔ موحد کہہ رہا تھا تو پھر اللہ کی مدد سے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

”میں چلتا ہوں پھر، آغا جان سے تو ملاقات نہیں ہو سکے گی اب۔“ کبیر نے اٹھنے کی کوشش کی تو موحد نے روک دیا۔

”بیٹھو ابھی، چائے پی کر جانا۔“

”ہاں..... میں کون سا سیرال آیا ہوں جو میری تواضع کی جائے گی۔“ وہ پر حرا لہجے میں بولا تو کام والی

کے ہاتھ اندر چائے اور لوازمات کی ٹرائی بھیجے ہوئے باہر کھڑی ملاح کا دل سبک رفتاری سے دھڑکا۔ چائے کی ٹرائی دیکھ کر موحّد ہنس دیا۔

”اس گھر میں آپ کا دوٹ بہت مضبوط ہے خان صاحب!“ کبیر کے دل میں ایک نظر اس خوش رو کو دیکھنے کی آرزو چل چل گئی مگر محض مسکرا کر چپ ہو رہا۔ اس کے ہاتھ کی خوشبودار چائے تل گئی فی الحال تو یہی بہت تھا۔

☆☆☆

لاؤنج میں شمرہ اور موحّد موجود تھے۔ یہ حاضری مبین اور سہیل آفندی صاحب کی طلبی پر ہوئی تھی۔

”تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ تم سارا پیسہ واپس اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کر دو موحّد ورنہ مجبوراً مجھے ٹیڑھی انگلی استعمال کرنا پڑے گی۔“ سہیل آفندی نے سخت لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیا۔

”تو آپ پہلے ہی ٹیڑھی انگلی کا استعمال کر لیں پھر۔“

”فضول باتیں مت کرو۔ ہماری زندگی بھر کی کمائی بھی یہ بزنس۔ جسے تم نے تھپ کر دیا ہے۔ اکاؤنٹس خالی پڑے ہیں، واجبات کی ادائیگی کہاں سے ہوگی؟“

”لیکن وہ سارا پیسہ تو اب میرے اختیار میں نہیں ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”تمہارا نمبر سے کیا تعلق ہے؟“ مبین آفندی نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔

”وہ وقار کا بیٹا ہے بھائی صاحب!“ شمرہ نے انہیں جتایا۔

”میری سمجھ میں اب ساری بات آگئی ہے، تم دونوں اس سارے قصے میں شامل ہو۔ نمبر کو جانتے ہو تو پھر مہرماہ کے نکاح میں بھی شامل۔ ہو گے تم لوگ۔“ مبین صاحب کا خون کھولا۔

”مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اس بارے میں۔ اس بات پر میں قسم اٹھا سکتی ہوں۔“ شمرہ ناراضی سے بولیں۔

”آج کبیر آیا تھا۔“ موحّد نے ایک قطعی غیر متعلق بات کی۔

”ہم گھر میں نہیں تھے ورنہ وہ زندہ واپس نہ جاتا۔“ سہیل بھڑکے۔

”کیوں..... اس نے کیا گناہ کر دیا ہے؟ کسی کے گھر رشتہ بھیجتا جرم نہیں۔“ موحّد نے حیرت کی اداکاری کی تو مبین جھلبلائے۔

”تمہاری بہن ہوتی تو میں دیکھتا کہ کیسے تم اس ڈرائیور سے اس کا رشتہ کرتے۔“

”ملاح میری بہن ہی ہے تایا جان! اسی لیے میں نے اس کے لیے ایک بہترین فیصلہ کیا ہے۔ آپ ملاح سے کیوں نہیں پوچھ لیتے، وہ اعتراض کرے تو ہم پیچھے ہٹ جائیں گے۔“ وہ اطمینان سے کہتا ہوا ان کو پیش کش کر رہا تھا۔ ان کا دل چاہا دو تین تھپڑ لگا دیں اس خود سر کو مگر بعض باتیں صرف سوچی ہی جاسکتی ہیں۔

”محمل میں ٹاٹ کے پوند نہیں لگائے جاتے۔“ سہیل نے نفرت سے کہا۔

”اب تو آپ لوگ بھی اسی پوزیشن میں آچکے ہیں تایا جان! بقول آپ کے بزنس تھپ ہو گیا ہے تو پھر یہ مصنوعی شان و شوکت کا پرچار کیوں؟ آپ کے جتنا پیسہ تو اب کبیر کے پاس بھی ہے بلکہ زمینیں بھی ہیں۔“ موحّد محفوظ ہوتے ہوئے بولا تو سہیل صاحب کا چہرہ غصے سے لال ہوا جبکہ مبین آفندی نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”آپ ملاح کا رشتہ ہو جانے دیں، وہ بہت خوش رہے گی۔ آپ کو تائی جان نے بتایا نہیں کہ وہ راضی ہے اس رشتے پر؟“ وہ بھولپن سے بولا تو مبین آفندی صاحب کو چار سو چالیس دولٹ کا جھٹکا لگا۔

”کک..... کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ..... تائی جان جانتی تھیں کہ ملاح اس پروپوزل سے خوش ہے پھر اس انکار کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”بکو اس مت کرو۔“

”موحد سچ کہہ رہا ہے۔ اعتراض صرف آپ لوگوں کی طرف سے ہے ملاح کی طرف سے نہیں۔“ شمرہ

سنجیدگی سے بولیں تو مبین صاحب کی پیشانی دھک اٹھی۔

”آپ چاہیں تو تائی جان سے پوچھ سکتے ہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”تم ان فضول باتوں کو چھوڑو اور سیدھے معاملے پر آؤ اور یہ بتاؤ کہ بینک کا پیسہ کب لوٹا رہے ہو؟“ انہوں نے سختی سے کہا۔

”وہ پیسہ اس کے حق دار تک پہنچ چکا ہے۔ چودہ سالوں میں آپ لوگ اپنے حق کا پیسہ کھا چکے ہیں۔ یہ وقار آفندی اور اس کے بیٹے کا حصہ تھا جو میں نے ایمان داری سے اسے ادا کر دیا ہے۔“ موحّد کا اطمینان قابل دید تھا۔

”تم ہوتے کون ہو اس طرح کے فیصلے کرنے والے، ہمارا پیسہ، ہماری جائیداد، ہم اسے رکھیں یا آگ لگائیں، تمہیں اس سے کیا مطلب، تم اگر سیدھی طرح سے نہ مانے تو مجھے مجبوراً پولیس کی مدد کرنی پڑے گی۔“ سہیل آفندی تپ اٹھے۔

”ہاہا..... آپ کے یہاں کی پولیس تو سنا ہے پچاس ساٹھ ہزار میں ہی بک جاتی ہے۔“ موحّد نے محفوظ ہوتے ہوئے کہا تو مبین آفندی بھنا کراٹھ کھڑے ہوئے۔

”یہ تو تمہیں وقت ہی بتائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ سیدھی طرح سے سارا پیسہ واپس اکاؤنٹس میں ڈال دو ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ میرا تم سے کیا رشتہ ہے۔“

”پیسے کی خاطر خون کے رشتوں کو بھلانا آپ کی پرانی اور خاندانی روایت ہے۔ آپ نے تو اپنے دو گے بھائیوں کو بھلا دیا تھا اور سالوں تک ان کے پیسے پر غیاشی کرتے رہے، میں تو پھر بھیجا ہوں آپ کا۔“ موحّد نے سختی سے کہا تو وہ جواب دیے بنا باہر نکل گئے۔

لاؤنج میں اب وہ دونوں ماں بیٹا ہی بیٹھے رہ گئے تھے شمرہ نے پریشانی سے موحّد کی طرف دیکھا اور خفگی سے بولیں۔

”یہ کن چکروں میں پڑ گئے ہو تم موحّد! میں نے تم سے کہا تھا کہ مہرماہ والا قصہ کسی طرح ختم کرو اور تم یہ نیا کھانا کھول کر بیٹھ گئے ہو۔“

”ان کے سارے کھاتے میں ایک ہی ساتھ بند کروں گا، آپ دیکھیے گا۔“ وہ تلخی سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”اور مہرماہ.....؟“ انہوں نے تشویش سے اسے دیکھا۔

”اس کا تو جو فیصلہ ہونا تھا وہ ہو چکا۔“

”اللہ ہی خیر کرے، میرا تو دل بہت گھبرا رہا ہے موحّد!“ وہ واقعی اب پریشان ہو چکی تھیں۔ موحّد نرم لہجے میں انہیں تسلی دینے لگا۔

☆☆☆

آغا جان کے کمرے میں دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ آغا جان کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر تھی مگر اس

جھکے نے ان کے اعصاب کافی کمزور کر دیے تھے، خاص طور پر موحّد کی دھوکا دہی نے ان کا سارا دم غم نکال دیا تھا۔

”موحّد کہاں ہے؟“ انہوں نے بیٹوں سے پوچھا۔
”مگر میں ہی ہے اور کہاں جائے گا۔“ سمیل ناگواری سے بولے۔

”اس سے بات کرو، ہو سکتا ہے کہ وہ غصے کی کیفیت میں یہ بات کہہ رہا ہو اور پیسہ خود اسی کے اکاؤنٹ میں ہو۔“ آغا جان آہستہ آواز میں کہہ رہے تھے۔ مبین آفندی نے سمیل کو اشارہ کر کے اس موضوع پر بات کرنے سے روک دیا اور ان کی بات کا خود بہت نرمی سے جواب دیا۔

”آپ بے فکر رہیں آغا جان! سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ موحّد کے ساتھ ساری باتیں ہو جائیں گی اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہمارا سارا پیسہ واپس اکاؤنٹس میں آ جائے گا۔“

”میں بہت کمزور پڑ گیا ہوں مبین! دو بیٹوں کو کھونٹے کے بعد موحّد کو پایا تو یوں لگا کہ جیسے دونوں بیٹوں کو سود سمیت واپس پالیا ہو مگر اس نے جو کچھ کیا، اس نے میرا دل توڑ دیا ہے اس نے مجھ پر اس عورت کے بیٹے کو ترجیح دی، یہ سوچ میرے دل کو کمزور کیے جاتی ہے۔ مجھے دنیا میں وہ سب سے پیارا ہے اور اس نے مجھ پر ایک طوائف زادے کو فوقیت دی۔“ وہ دکھ کی انتہا پر تھے۔

”دفع کریں آغا جان! وہ اس قابض ہی نہیں کہ اسے اتنے اونچے مقام پر رکھا جائے اس کا لالچ صرف اور صرف پیسہ تھا جو وہ دھوکے سے کھوا چکا ہے حالانکہ اگر وہ سمجھتا تو یہ سب کچھ اسی کا تھا۔“ سمیل آفندی نے غمی سے کہا۔

”تم نے مہرماہ سے بات کی، اس غبیث شخص کا کوئی فون آیا یا نہیں؟ اب تو وہ کسی طریقے سے بھی سہی مگر اپنا حصہ لے چکا ہے۔“ آغا جان نے پوچھا۔

”ہاں اب میں مہرماہ سے بات کروں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ وہ سیدھے طریقے سے نہ مانا تو اگر اس کی ماں کو پولیس میں دینا پڑا تو وہ دیں گے۔“ مبین آفندی نے غرور سے کہا۔ درحقیقت انہوں نے یہی سوچ رکھا تھا۔
”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے گھر پر ایسی آفات آجائیں گی۔ آپ اندازہ کریں، موحّد واقعی آستین کا سانپ ثابت ہوا ہے۔ اگر وہ میر کو اس کا حصہ دے سکتا ہے تو کیا وہ مہرماہ اور اس کے نکاح کی سازش میں شریک نہ ہوگا۔“ سمیل آفندی نے غصے سے کہا۔

”میری مہرماہ سے بات ہوئی تھی، اس کا کہنا ہے کہ موحّد نے میر سے طلاق دلوانے کی خاطر یہ پیسہ اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروایا ہے۔“ مبین آفندی نے بتایا تو سمیل نے سر ہٹکا جیسے۔ ان کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔
”مجھے تو اب کسی بھی بات پر یقین نہیں آتا اگر ایسا کچھ ہوتا تو کیا وہ مجھ سے بات نہ کرنا ہم بھی تو یہی چاہتے تھے کہ مہرماہ کو اس شخص سے نجات مل جائے۔“ آغا جان نے تاسف سے کہا۔

”اس شخص کی کسی بھی بات کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ جو شخص بزنس اکاؤنٹس خالی کر سکتا ہے وہ کسی بھی طور قابل اعتبار نہیں۔“ سمیل آفندی نے قطعی انداز میں کہا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آغا جان پھر سے موحّد کی باتوں میں آجائیں یا اس پر پھر سے بھروسہ کرنے لگیں۔ آغا جان تھک کر خاموش ہو گئے اور سر ہٹکے پر ڈال دیا اور حقیقت وہ خود کو کمزور محسوس کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

وہ شاپنگ سے فارغ ہو کر ابھی آکس کریم پارلر میں داخل ہو کر کرسی پر بیٹھی ہی تھی جب اس کے صحن سامنے نمیر آفندی آکر بیٹھا۔ مہرماہ نے لب بچھے، پیشانی پر غصے سے تل پڑ گئے۔
”شاپنگ کرنے آئی تھیں؟“

”نہیں، ہر دوں کی مضبوطی چیک کر رہی تھی چل پھر کر۔“ وہ سلی تو بے اختیار اس کا ہتھکڑہ گونج اٹھا۔

”شٹ اپ.....“ مہرماہ نے اسے گھورا تو وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے مسکرایا اور اس کی یہ مسکراہٹ..... مہرماہ نے بے اختیار نظر ہٹا لی۔

وہ آکس کریم کا آرڈر دے کر آیا تو مہرماہ ساکت بیٹھی تھی۔ وہ بھی سنجیدہ سا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”اب تو تمہیں سب کچھ مل چکا ہے۔ اب مجھے آزاد کر دو۔“

”مجھے آفندی ہاؤس سے جو بھی ملا ہے اس میں سے کچھ بھی واپس نہ کرنے کا عہد ہے میرا۔ یہ سب میرا حق تھا۔“ وہ سرد لہجے میں بولا۔

”مگر میں ان چیزوں میں شامل نہیں ہوں۔“ وہ تملائی۔

”میرے قبضے میں جو آگیا، اب وہ میرا ہوا مہرماہ! وہ جیسے لطف لیتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”مجھے تم واقعی مظلوم لگے تھے مگر جس مقام پر تم میرے گھر والوں کو لے آئے ہو، تمہارا اور ان کا ہڈا برابر ہو گیا ہے۔ میری ہمدردی ختم ہو گئی ہے۔“ وہ تاسف بھرے غصے سے بولی۔

”ان پر تو یہ مشکلیں اب آئی ہیں..... میں تو پلائی ان ہی حالات میں ہوں۔“

”اللہ نے تمہیں ان تکلیفوں کے بدلے میں ایک اچھی زندگی دے تو دی گئی پھر بھی تم نے اس نفرت کا بدلہ لیا۔“

”مرا باپ بنا علاج کے مرا ہے۔ میری ماں کی حالت تم دیکھ ہی رہی ہو، میں اپنی پہچان کے ساتھ ان کے گلے لگ سکتی نہیں پاتا۔ غیروں نے اپنا کر پالا ہے مجھے۔ مگر تو کیا آفندی نے ہماری پوری زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا تھا اور تم ان پر ترس کھا رہی ہو۔“ وہ ناپسندیدگی سے بولا۔

”جب ظالم اور مظلوم ایک ہی پلڑے میں آجائیں تو ہمدردی کسی ایک کے ساتھ بھی نہیں رہتی۔“

”میں ظالم ہی تو بن نہیں پایا اور نہ ہی سیدھا جا کر تمہارے آغا جان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں ان کی حالت کی پرواہ کیے۔“ وہ رخ ہوا۔ نجائے کون صحیح تھا اور کون غلط۔ مہرماہ نے گہری سانس بھری اور تھکے ہوئے انداز میں بولی۔

”کچھ کم بھی نہیں کیا تم نے۔ اب معاف کر دو سب کو پلیز۔“

”معاف ہی تو کیا ہوا ہے مہرماہ آفندی اور نہ حالات اس سے زیادہ بُرے ہوتے۔“ وہ پرسکون تھا مگر آنکھوں میں کروٹیں لیتا اضطراب، مہرماہ کو نظر آ رہا تھا۔

”معاف ہی تو نہیں کرتا بندہ، اپنے اوپر ہونے والے ظلم پر بہت چیخا چلاتا ہے لیکن جب موقع ملے تو معافی دینے میں ”تھوڑا“..... بن جاتا ہے بالکل ظالم ہی کی طرح۔“ وہ آزدگی سے پیکا سا مسکرا کر

اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ نمیر نے سنہری سا روپ اپنی نگاہ میں جذب کیا تو ان آنکھوں کی اداسی کو بھی دل پر بوجھ کی صورت گرتا پایا۔ آکس کریم آگئی تھی مگر مہرماہ کا دل ہی نہیں کر رہا تھا کہ اس میں سے ایک بھی جھج لے۔

”میں نے جو تمہارے ساتھ کیا ہے، میں اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں مہرماہ!“ کتنی ہی دیر آکس کپ میں جھج

جلانے کے بعد نمبر نے ایک دم کپ پرے دھلیچے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تو دکھ کی کیفیت میں گھر کر اے۔ دیکھتے ہوئے مہرماہ کی آنکھیں بھر آئیں۔
”میں تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا مہرا“ اس کی آواز سرگوشی سے ہرگز بلند نہ تھی مگر مہرماہ نے بخوبی سنی۔ اس کا دل تھم سا گیا تھا جیسے۔

”ترس مت کھاؤ مجھ پر نمبر! ویسے ہی جیسے زبردستی کے نکاح کے وقت نہیں کھایا تھا۔“ وہ بھڑک کر رندے ہوئے لہجے میں بولی تو آنکھیں چمک گئیں جنہیں اس نے ہتھیلیوں سے رگڑ ڈالا۔

”یہ ترس نہیں ہے مہرماہ!“ وہ فی الفور بولا تو لہجہ جذب سے بھر پور تھا۔
”میں نہیں جانتا کہ میرے دل کے بدلنے کی وجہ کیا ہے مگر تمہارے معاملے میں میرا دل بدل گیا ہے۔ مگر خود کو تمہارا مجرم پاتا ہوں۔ سزا دینے کا تمہیں اختیار ہے مہرماہ! جو چاہے دے لو، اف تک نہیں کروں گا مگر طلاق..... نہیں..... کسی بھی صورت نہیں۔“ اس کا انداز اٹل تھا، قطعی اور مضبوط۔ مہرماہ دکھ اور بے یقینی کی گہری کھائی میں گرتی چلی گئی۔

”تم..... جو نے شخص اتم نے کہا تھا کہ حصہ ملے ہی تم مجھے آزاد کر دو گے۔“ اسے طیش آیا۔ ”اور تم کیا سمجھتے ہو تمہارے معافی پاندامت کے ان کھسے پٹے الفاظ سے میرے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا، کیا میری زندگی پھر سے اسی فیر میں لوٹ سکتی ہے؟“

”زندگی بھر سزا دیتی رہنا مہرماہ! کھانا اف تک نہیں کروں گا۔“ وہ یقین سے بولا۔
”تو سزا کے طور پر تم نے اس نکاح کو نبھانے کا سوچا ہے..... واہ..... خوب۔ اسے میں تمہاری سزا سمجھوں اپنی انسلٹ؟“ وہ استہزاء سے بولی۔

نمبر نے مضطرب ہو کر اپنے بالوں میں ہاتھ پھنسایا اور چہرہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ عام حالات ہوتے اور مہرماہ کی زندگی میں وہ ایک ترو بالا کر دینے والے طوفان کی طرح داخل نہ ہوا ہوتا تو وہ اس شاندار پر سنائی والے بندے کی ہر اسی پر شاید غر کرتی۔ مہرماہ نے نگاہ پھیر لی۔

”تمہارے لیے میرا ساتھ جیسا سزا ہو گا مہرماہ! مگر میں اب تمہیں نفرت سے نہیں محبت سے حاصل کر چاہتا ہوں۔“ (کھلا اعتراف محبت)

”ہا۔۔۔۔۔ اور میری مرضی کی کوئی اہمیت نہ کل تھی تمہارے نزدیک اور نہ آج ہے۔ ہے نا۔“ وہ تلخی سے بولی۔
”ایسا نہیں ہے مہرا! پچھتا رہا ہوں اس لمحے پر جب میں نے بدلے کے لیے تمہیں چننا تھا۔ تمہیں تو محبت کے لیے چننا چاہیے تھا۔“ وہ آگے کو جھک کر کہیاں میز پر نکائے محبت آمیز لہجے میں بولا تو غصے سے اس کو دیکھتی ہوئی مہرماہ چل سی ہوئی۔ رنگت یوں دھک کر سرخ و سنہری ہوئی جیسے جلد کے نیچے کسی نے دیے جلادیے ہوں۔
”شٹ اپ۔“ وہ بہ مشکل بولی۔ پھر اس پر طھوکیا۔

”تم نے تو زندگی کو کھیل ہی بنالیا ہے۔“
”کھیل ہی تو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے تم نے سچا دیا ہے مہرماہ کہ زندگی کھیل نہیں ہوتی۔“ وہ گہری

نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو مہرماہ کی ہتھیلیاں چبچبے لگیں، دل بے ترتیبی سے دھڑکا تو اپنی اس مغلوب کیفیت پر مہرماہ کو خود پر خفا یا اور اس سے زیادہ نمبر آندھی پر جو یوں بے باکی سے اظہار کرنے بیٹھ گیا تھا۔
”تم بتاؤ، کیا کروں جو تمہیں مجھ پر یقین آجائے۔“ نمبر نے یوں پوچھا کہ جیسے وہ آسمان سے زمین پر

کودنے کو کہے کی تو وہ اس کا کہنا ماننے میں ایک لمبے نہ لگائے۔ گا مہرماہ نے جیسی نظروں سے اسے دیکھا اور استہزاء سے بھر پور لہجے میں بولی۔

”آغا جان کا پیسہ واپس کر سکتے ہو؟ میری جوبندی تم نے بے رنگ کی ہے، کیا اس کے رنگ واپس لا سکتے ہو؟“
نمبر چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ مہرماہ نظر چرائے بتاؤ بے حوصلے کے ساتھ سستی نظروں کے ساتھ اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہی۔ وہ اسے اس غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتی تھی کہ شاید وہ اس کے معذرت کے چند لمحوں سے متاثر ہو کر اسے معاف کر چکی ہے۔

”میں دعوے نہیں کروں گا مہرماہ! یہ سب تمہیں وقت بتائے گا کہ نمبر وقار آندی کبھی بھی اتنا ظالم نہیں بن سکا جتنے کہ آندی ہاؤس والے تھے۔“ کافی دیر کے بعد وہ بہت محل کے ساتھ بولا تو مہرماہ کچھ نہیں بولی بس اپنا شاپنگ بیگ اٹھایا اور والٹ ہاتھ میں لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تو پھر ٹھیک ہے نمبر! اب جب ملیں گے جب تم اپنے دعووں میں سچے ثابت ہو گے۔“ جتانے والے لہجے میں کہہ کر وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ نمبر عجیب ہاری ہوئی سی کیفیت میں گمراہیوں پیشا رہ گیا۔

مہرماہ کے دل پر جیسے کسی نے وزنی سل رکھ دی تھی۔ نمبر کی باتوں نے اسے مطمئن کرنے کے بجائے جیسے جلتے ہوئے لاد میں پھینک دیا تھا۔ کس قدر آسانی سے اس نے اپنے کیے کا مداوا ڈھونڈ لیا تھا اور اب کی بار پھر وہ تمام فیصلے اپنی من مرضی سے کر رہا تھا۔ وہ دیکھتے سر کو دہائی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جب صدیقہ بیگم نے اسے آواز دے لی۔ اسے ناچار رکنا پڑا اور نہ وہ اس وقت کسی سے بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تم سے ایک بات کرنی ہے۔“ صدیقہ بیگم نے گہری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ شاپنگ بیگ دوسرے ہاتھ میں چھل کرتے ہوئے ٹھکے ہوئے انداز میں بولی۔

”امی شام کو بات نہیں ہو سکتی۔ ابھی میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔“
”شام کو کرنے والی بات ہوتی تو میں تم سے شام ہی کو کہتی۔“ انہوں نے جتانے والے انداز میں کہا تو مہرماہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی ان کے کمرے کی طرف آگئی۔

”آغا جان کی طبیعت اب پہلے سے بھتر ہے لیکن موصد نے انہیں مارنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔“ انہوں نے اس کے بیٹھتے ہی بات شروع کی۔

”کہا تھا کہ تم واپس آ جاؤ، بے شک تم درکار کی ذمہ داری بھاری ہو ب لیکن پور فن تو شرع ہی کا ہے۔“
”کسی کی اچھی بات بھی دیکھ لیا کریں امی! موصد نے مجھے نمبر سے آزادی دلوانے کی خاطر نمبر کا حصہ اس کے حوالے کیا ہے نا کہ وہ مجھے طلاق دے دے۔“ مہرماہ نے یہ جھوٹ کیوں بولا، وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ ابو کو بھی اس نے یہی کہہ کر فی الحال ٹھٹھا کر دیا تھا۔ صدیقہ بیگم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”یہ تم سے موصد نے کہا ہے؟“
”ظاہر ہے امی! اس کا اور کون سا ایسا مقصد ہو سکتا ہے نمبر کو پیسہ دینے کا، اگر وہ بے ایمانی کرنا چاہتا تو سارا پیسہ اپنے اکاؤنٹ میں ڈالتا۔“

”تو پھر اب نمبر سے رابطہ کیسے ہو گا۔“ یکفخت پر جوش ہو کر بولیں تو مہرماہ ڈھیلی پڑ گئی۔ اسے نمبر کی بات یاد آئی جواب جائیداد میں سے حصہ لے کر بھی ساری عمر مہرماہ کے ساتھ گزارنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہوئی۔ وہ گہرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جب وہ رابطہ کرے گا تو میں آپ کو بتا دوں گی۔“

”میں تو خود انتظار میں ہوں۔ تمہارے ابو کہہ رہے تھے کہ میرے طلاق کے بعد تم چاہو تو موحد کے ساتھ دوبارہ تمہارا رشتہ ہو سکتا ہے کیونکہ بدنامی سے بچنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے، خاندان میں سب تمہارے اور موحد کے نکاح کے بارے میں جانتے ہیں اور پھر کچھ بھی ہو جائے، آغا جان اس سے جتنے بھی ناراض ہوں اس جائیداد کا وارث وہی ہے۔“ انہوں نے رازدارانہ انداز میں کہا تو مہر ماہ کو شدید جھٹکا لگان کی بات سن کر اور ان کی سوچ پر تاسف ہوا۔

”یہ سب آپ سے ابو نے کہا ہے؟“ وہ بے یقینی سے پوچھنے لگی۔

”ہاں تو تمہارا کیا خیال ہے، میں اپنے پاس سے کہہ رہی ہوں۔ آج آغا جان اس سے ناراض ہیں راضی ہوں گے تو سب کچھ اسی کا ہے۔ میرا آفتنی کو تو وہ اپنے پیسوں سے خرید کر گولی بھی نہیں ماریں گے۔“ صدیقہ بیگم نے کہا تو مہر ماہ شاکی نظروں سے انہیں دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے نہیں پتا تھا کہ اس گھر کے لوگوں کے لیے پیسے کی اہمیت انسانوں سے بڑھ کر ہے۔ رشتوں سے بڑھ کر ہے۔“ نزو ٹٹھے مگر مخی بھرے لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

صدیقہ بیگم نے اسے آواز دی مگر وہ نہیں رکی تو وہ غصے سے بڑبڑا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

مبین اور سمیل صاحب نے موحد کو خوب باتیں سنائیں جو وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

”مجھے نہیں پتا کہ تم نے میرا تاتا ترس کیوں کھایا، مہر ماہ کا کہنا ہے کہ تم نے مہر ماہ کو طلاق دلوانے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے مگر میں کسی طور یہ نہیں مان سکتا۔“ مبین آفتنی کی بات سن کر موحد کو بڑے زور کا جھٹکا لگا۔

”یہ آپ سے مہر ماہ نے کہا ہے؟“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اب تم یہ بتاؤ کہ اگر میرا مہر ماہ کو طلاق دے دیتا ہے تو تم اس سے سارا پیسا کیسے نکلاؤ گے؟“

گہری سانس بھرتا موحد سیدھا ہو گیا اور بہت پرسکون انداز میں بولا۔ ”ایک طریقہ ہے بلکہ میری ایک شرط ہے اگر آپ وہ پوری کر دیں تو میرا خدا گواہ ہے کہ میں میرے اکاؤنٹ میں سے سارا پیسہ آپ کو واپس دلوا دوں گا۔“ وہ چیلنج کرتے ہوئے بولا تو دونوں بھائیوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا پھر سمیل آفتنی محتاط انداز میں بولے۔

”اور وہ شرط کیا ہے؟“

موحد نے چند لمحوں خاموش رہ کر جیسے الفاظ سوچے اور پھر آرام سے بولا۔ ”اگر آپ لوگ ملاحہ اور کبیر کی شادی کروادیں تو آپ کو آپ کے اکاؤنٹس سابقہ حالت میں ملیں گے۔“ موحد کی بات سن کر وہ دونوں بھائی یوں اچھلے جیسے اس نے کوئی زوردار دھماکا کر دیا ہو۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوا؟“ مبین آفتنی ناگواری سے بولے تو وہ حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں بولا۔

”اس میں ایسا عجیب کیا ہے، انسان ہی کا بچہ ہے وہ بھی۔“

”انسانوں میں بھی کئی گیز ہوتی ہیں۔ ہر کسی کے ساتھ نہ ہاتھ ملایا جاسکتا ہے نہ رشتہ اور تم ہمیں مجبور نہیں کر سکتے اس شادی پر۔“ مبین آفتنی کا جی چاہ رہا تھا کہ اس سر پھرے کو ٹھونک کے رکھ دیں۔

”جس کئی گیزی میں آپ نے اسے رکھا ہوا تھا وہ اس سے اوپر آچکا ہے۔ اب تو شاید آپ لوگ اس کے برابر ہو گئے ہیں۔ چلیں خیر..... ٹھیک ہے، میں نے تو ایک راستہ بتایا ہے آپ کو۔ اگر آپ کو منظور نہیں تو پھر آپ

اپنے طریقے سے نکلا لیں پیسا، وہی..... انکی ٹیڑھی کر کے۔“ وہ صوفے کے بازوؤں پر زور ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

”اگر اس کی بات سچ ہے اور ملاحہ کی رضامندی شامل ہے اس رشتے میں تو میرے خیال میں آپ کو بھی

سوچنا چاہیے۔“ موحد کے جانے کے بعد سمیل آفتنی دل ہی دل میں سارا حساب کتاب کرنے کے بعد محتاط لفظوں میں بولے تو مبین صاحب نے جھٹکا کھا کر ان کو دیکھا۔

”ہوش میں رہ کر بات کرو سمیل!“ وہ ناگواری سے بولے۔

”یہ ٹمروہ کا کہنا ہے بھائی صاحب! آپ بھابی سے پوچھیں۔“ انہوں نے پہلو ہچایا۔

”ہو بھی تو کیا میں اس ڈرائیور کو اپنی دامادی میں لے لوں۔“ وہ سلگ کر بولے۔

مگر تب سے اب تک وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

تائی جان ان کی بات سن کر ششدر رہ گئیں۔ پھر گویا حواسوں میں آتی ہوئی ناگواری سے بولیں۔

”اس خبیث کی ہمت کیسے ہوئی ایسی بات کرنے کی، منہ تو زد دیتے آپ اس کا۔“

”تو کیا ملاحہ واقعی اس رشتے پر راضی ہے؟“ انہوں نے بدقت پوچھا۔ تو تائی جان کو کرنٹ سا لگا۔ جو ہات

وہ مبین صاحب سے چھپا گئی تھیں۔ وہ آج کھل کر رہی تھیں۔

”وہ تو نادان ہے، نا سمجھ ہے مگر ہم تو آنکھوں دیکھی بھی نہیں نکل سکتے نا۔“ انہوں نے مدافعانہ انداز میں کہا

تو مبین صاحب نے گہری سانس بھری۔

”وہ صرف ہم سب کو نچا دکھانا چاہتا ہے مبین صاحب! آپ اس کی باتوں میں مت آئیں۔ ایک طرف وہ

مہر کو کہتا ہے کہ اس کی میر سے طلاق کروانے کے لیے روپیہ اس کے اکاؤنٹ میں ڈالا ہے اور دوسری طرف اب

شرط رکھ دی کہ ملاحہ اور کبیر کا رشتہ ہوگا تو وہ روپیہ واپس مل جائے گا۔ وقار کا بیٹا جس نے ہمیں بربادی اس لیے

کے لیے کیا ہے۔ وہ بھلا اس کے کہنے پر لوٹائے گا سارا مال۔“

”ہمیں تو بربادی کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے اس لڑکے نے صدیقہ! اب بتاؤ جان اور عزت بچانے کا صرف

ایک ہی راستہ ہو تو کیا کرنا چاہیے؟“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولے تو صدیقہ بیگم آنکھیں پھاڑ کر ان کو دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز پر بالوں کو برش کر کے کچر میں سمیٹتی مہر ماہ چونکی۔

”آ جاؤ۔“ ذہن میں کام والی کے آنے ہی کا خیال تھا مگر موحد کو اندر آتے دیکھ کر وہ دوپٹا پھیلاتی پلٹی۔

”جی فرمائیے؟“

وہ اس کے انداز پر مسکرا دیا اور پہلے حسب معمول نگار کے پاس گیا۔ سر پر پیار لیا اور دعائیں۔ مہر ماہ لب

بھینچے ایسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ ان کا حال احوال پوچھ کر مہر ماہ کی طرف مڑا۔

”کیسی ہو؟“

”شکر ہے اللہ کا، دشمنوں سے بچا کر رکھا ہوا ہے اس نے۔“ وہ خفیف سی ناک چڑھا کر بولی تو کوئی قابل

دید ہی شے لگی۔ موحد بے ساختہ اس کی بات پر ہنسا۔

”تم نے گھر والوں کے سامنے میری حمایت کی، میری پرستاشی کا پاز بیورخ ان کے سامنے پیش کرنے کی

کوشش کی، اس کے لیے شکر یہ۔“ اس کی اگلی بات نے مہر ماہ کو بھک سے اڑا دیا۔

”کیا بلواس ہے یہ؟“
”تم ہی نے تو ان سے کہا ہے کہ نمبر سے تمہیں آزاد کروانے کے لیے میں نے سارا پیسہ اسے دیا ہے۔“ وہ
زیر لب مسکرا رہا تھا۔

”اف.....“ مہرماہ کا دل اس کا منہ نوچنے کو چاہا۔
”اگر تم ملاحظہ والے معاملے میں ہمارے ساتھ فہم نہ ہوتے تو میں تمہیں کبھی منہ نہ لگاتی موصدا حمایت تو دور
کی بات ہے۔“ وہ آنکھوں میں شعلے بھر کر بولی۔
”ہا ہا ہا..... بہت خوب۔“ مظلوظ ہو کر اس نے قہقہہ لگایا۔ بلیو جینز اور سیاہ ٹی شرٹ میں لمبوس وہ دیکھنے کی
چیز لگ رہا تھا مہرماہ تو پہلے بھی اس سے رشتہ داری پر اترانے کو تیار تھی اگر وہ دشمن اول نہ ہوتا تو۔
”اور اگر میں یہ کہوں کہ میں یہ رشتہ کروا سکتا ہوں تو؟“
”تو کیا؟“

”تو یہ کہ مجھے کیا ملے گا جواب میں.....؟“ وہ سنجیدگی سے شرارت کے موڈ میں تھا۔
”یہ تمہارا اور تمہاری بہن کا معاملہ ہے، تم جانو اور وہ جانے۔“ مہرماہ ان آنکھوں کی گہرائی سے خائف ہو کر
رکھائی سے بولی۔

”اگر میں ان دونوں کا رشتہ کروا دوں تو کیا مجھے تمہارا رشتہ نہیں مل سکتا؟“ وہ اس قدر اچانک بولا کہ پہلے تو
مہرماہ کی سمجھ میں بات ہی نہیں آئی اور جب آئی تب وہ ہنسنا شروع ہو گیا گویا مذاق کیا ہو۔ مہرماہ کا جی چاہا کوئی شے
اٹھا کر اس کے سر میں دے مارے۔
”بھاڑ میں جاؤ تم۔“ وہ تھملا کر پلٹی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنا دایاں ہاتھ ایک مضبوط مگر نرم سی گرفت
میں پایا تو قدموں کے ساتھ دھڑکن بھی رک سی گئی۔

”مانا کہ اس کہانی میں موصدا آفندی کہیں نہیں تھا مہر! لیکن اگر تم نے نمبر کو ٹھکرا دیا تب بھی کیا موصدا آفندی تمہارے
لیے قابل قبول نہیں ہوگا؟“ مہرماہ نے بے اختیار اس کا چہرہ دیکھا جہاں شرارت کی کوئی ہلکی سی بھی رمت موجود نہ تھی۔
”میرا دل بہت دکھا ہوا ہے موصدا! اور یقین مانو میں تم دونوں کو ہی ٹھکرانا چاہتی ہوں کیونکہ ان دونوں
ناموں نے مجھے فقط ستایا ہی ہے۔“ وہ گئی سے کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے زرنگار کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔
موصدا اس کی طرف دیکھ کر اوچی آواز میں بولا۔

”ملاحظہ کو خوش خبری سنا دو جا کر مہر! کہ آفندی نے کبیر خان کے ہاتھوں شکست تسلیم کر لی ہے اور اب اسے
بارت لے کر آنے کا اذن دے دیا گیا ہے۔“ مہرماہ کو لگا اس کے کانوں نے کچھ غلط سنا ہے۔ بے اختیار موصدا کو
بے یقینی سے دیکھا تو اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

”تمہیں دیا ایک قول آج پورا ہوا مہرماہ! اب یہ مت کہنا کہ انعام میری مرضی کا نہیں ہوگا۔ تم نے طلال کے
سامنے اعتراف کیا تھا کہ تمہارے سب راستے مجھ تک آتے ہیں۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکراتے ہوئے گہری
بات کر گیا تھا لیکن مہرماہ کچھ ایسی خوشی میں گہری تھی کہ بنا غور کیے موصدا کے جاتے ہی صدیقہ نیگم کی طرف بھاگی
تاکہ بات کی سچائی کا پتا چل سکے۔

☆☆☆

”بس کسی طرح یہ وقت گزر جانے دیں بھائی صاحب! آغا جان کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ نکاح

کر دیں ملاحظہ کا۔ پر اپنی واپس مل جائے تو نکاح کی کیا حیثیت ہے مہر۔“ سہیل آفندی ملاحظہ کا
ایسی بات منہ سے بھی نہ نکالتے اور دولت کو اپنا دین ایمان سمجھنے والوں کے دل و دماغ پر تو مہر کی بات
ہیں۔ مبین آفندی کو کسی بھی بات پر کوئی اعتراض نہیں رہا تھا۔

”کبیر خان تو کیزا کموڑا ہے، بس ہاتھ میں آنے کی دیر ہے، اسے تو چنگی میں سل دیں گے ہم۔“ سہیل
آفندی کو بھی صرف مال ہی سے غرض تھی۔
مگر ہوا وہی کرتا ہے جو اللہ چاہتا ہے زمین والوں کی سازشیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔
کبیر اور ملاحظہ کی تقدیر کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھی تحریر والا صفحہ سامنے آچکا تھا اور اب کوئی ذات
ماسوائے اللہ کے، اسے بدلنے پر قادر نہیں تھی۔

☆☆☆

آغا جان کھل بیڈریسٹ پر تھے۔ ان کا کھانا اور ناشتہ بھی بیڈروم میں ہی جاتا تھا۔ سو کبیر اور ملاحظہ کا نکاح
خاموشی سے کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔
نئی بساط بچھائی جا چکی تھی۔ سب نے اپنے اپنے مہرے سیٹ کر لیے تھے۔ اب جیت کس کا مقدر تھی اور ہار
کس کا نصیب، یہ اللہ ہی جانتا تھا مگر ان سازشوں سے پرے، دودل کھل طور پر، خالص محبت اور ایک دوسرے کی
چاہت سے بھرے ہوئے تھے۔
کبیر اور ملاحظہ کے دل۔

مگر کوئی ان کے لیے کیا سازش بن رہا ہے۔ اس سے وہ دونوں ہی بے خبر تھے۔
لاؤنج میں داخل ہوتا موصدا آفندی پر اسرار انداز میں مسکرا دیا۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خاتون ڈائجسٹ کی طرف سے پیش کیے گئے 4

خاتون ڈائجسٹ



نذیر سمیر
قیمت - 400/- روپے

مستور



فوزیہ سمین
قیمت - 750/- روپے

دل لیک



رضیہ جمیل
قیمت - 300/- روپے

چلمن



نادرہ خاتون
قیمت - 300/- روپے

فون
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37
کابلہ

برہنہ کی تہ



مکمل ناول

وہ تینوں اس بات پر حیران تھیں کہ صبح کی عجیب و غریب مزاج کی ہے۔ محال ہے جو کوئی بھی قصہ یا واقعہ اسے حیرت زدہ کرتا ہو۔
”اُف اللہ..... کیا واقعی.....؟“

ان دو حرفی الفاظ کے ساتھ اس کا منہ حیرت سے کھل جائے۔ ایک دم ٹھس..... سپاٹ چہرہ..... بھلے آپ کہہ کے دیکھ لیں۔

”آج پڑوسن شیرنی کے ہاں ڈلیوری ہوئی تو بے چاری کا پیدا شدہ بچہ مرغی کا تھا۔“

”ہاں تو آج کل سب ہو رہا ہے ناں..... بھئی؟“ ٹکا سا جواب آتا اور ہم اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے۔

”ارے سنو تو صبحی! جلدی آؤ، باہر دادی اور بھیڑیے کی لڑائی ہو رہی ہے۔“

”ہاں تو..... جو بندی صبح، شام عرفان چچا سے مقابلہ کر سکتی ہو، اس کے لیے بھیڑیے کا سامنا کرنا کون سا مشکل عمل ہے۔“ اس کے چہرے سے ایک دم بے زاری ٹپکنے لگتی۔

”اللہ..... آواز تو نیچی رکھو۔“

چچا کا ذکر اور اس قدر مناسب الفاظ میں..... آہم..... مطلب غیر مناسب الفاظ میں کرتی کہ ہم تینوں کے چڑیا جیسے دل کانپ اٹھتے۔

اے میں خود سوچے کہ آج صبحی کے چہرے کی اڑی رنگت، قیامت کی نشانیوں میں سے تھی کہ نہیں۔ کل یونیورسٹی میں ایسل کے ڈیپارٹمنٹ میں فنکشن تھا۔ وہ آج اپنی الماری کھنگال رہی تھی وہ کوئی اسٹوڈنٹ نہیں بلکہ حال ہی میں لیچرار کے عہدے پر فائز ہوئی تھی۔

ندا ہم چاروں سے چھوٹی تھی، وہ میڈیکل میں اوڈی ایس کے تیسرے سال میں تھی۔

ہم میں سے عالیہ، نالائق، لا پرواہ، لیزی ڈیزی قسم کی تھی سو بی اے کے بعد شادی کے انتظار میں تھی۔

ہم سب میں زیادہ خوب صورت، لائق فائق، جی دار، بہادر، صبحی تھی جو ڈاکٹر بننے کے بعد ہاؤس جاب کر رہی تھی۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی صبحی کی چہرے چھائی حیرت کی، اس وقت یہ تمام خواتین ایسل تو قیر کے کمرے میں جمع تھیں کہ صبحی کے پاس چائے کے ساتھ ایک بمبائٹک نیوز بھی تھی، سوائے عالیہ کے وہ تینوں رات کو چائے ضرور پیتی تھیں کہ ان کے ادھورے کام رات کو ہی مکمل ہوتے تھے۔

”او بی بی! اب بتا بھی چکو، ہمارے دل بیٹھے جارہے ہیں۔ کہ آپ کو حالت سکون سے صرف اسرافیل صاحب کی محبت بھری سرگوشی ہی نکال سکتی ہے۔“

ندا کا تجربہ سو فیصد درست تھا سو باقی دونوں نے بھی متفق ہوتے ہوئے سروں کو اٹھائی جنبش دی۔ صبحی ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کے کچھ



یوں ہی دوران گفتگو دادی نے اس کا نام لیا تو حزام نے چونک کے اسے بغور دیکھا تھا۔

”ہسل کا مطلب کیا ہے؟“ دادی سے مخاطب ہونے کے باوجود اس کی نگاہ ہسل پر ہی جمی تھی۔

”ترکی زبان میں ہسل کا مطلب چاندنی رات ہے۔“ نام کا مطلب بتاتے ہوئے دادی کے لہجے میں کڑواہٹ سی کھلی تھی، مطلب جان کے وہ مسکرایا۔

”یہ نام رکھا کس نے؟“ اب یہ سوال شانزہ خاتون کی طرف سے کیا گیا۔

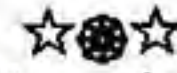
”ہسل کے نانا مرحوم نے رکھا تھا، ہم میں سے تو کوئی بھی اس نام کے حق میں نہیں تھا مگر اس کے نانا ذرا ضدی مزاج کے تھے تو ہم سب نے ہی بارمان لی۔“ دادی جیسے آج بھی صدے سے پُور تھیں۔

”واؤ..... کیا نائس شخصیت کے مالک ہوں گے۔“ حزام کی تو صنی نگاہیں اس پر ہی تھیں اور برا

آچکی تھی مگر وہ اس کے بارے میں یا اس کی واپسی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس نے بیڈ پر گرتے ہوئے ایک سی آہ بھری۔

”حزام نوید! میں نے مان لیا کہ میرے بارے میں تم اچھی یادداشت کے مالک ہو، تو پھر وہ سب کیا تھا اور کیوں تھا؟“

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ اس شخص کے لیے کبھی اتنا روئی تھی کہ اب تو اس کی یاد میں اترنے والی کبھی بھی آنکھوں کو غیبت تھی۔ پیسہ واقعی ہضم ہونے والی چیز ہے مگر قصہ..... قصہ کہاں ختم ہوتا ہے۔



اس نے حزام نوید کو جب پہلی بار دیکھا تو وہ عمر کے سولہویں سال میں تھی، ان کا خاندان پشتوں سے لاہور میں مقیم تھا۔ وہ لوگ بکے پنجابی تھے مگر حزام کی نیلی حال ہی میں کراچی سے یہاں شفٹ ہوئی تھی۔ شانزہ خاتون ان کی دادی کے تایا کی بیٹی تھیں اور

دونوں میں کچھ ایسا بہناپا تھا کہ دونوں عمر کے ہر دور میں ایک دوسرے کے رابطے میں رہیں کہ اب رابطہ خط و کتابت سے ہو کر ٹیلی فون پر ہوتا تھا۔ ان کے لاہور شفٹ ہوتے ہی دونوں ہی ملاقات کے لیے بے تاب تھیں۔ بالآخر پہل دادی نے ہی کی، دادی ڈرائیور کے ساتھ اکیلے سفر کرنے کو معیوب گردانتی تھیں اور پھر کچھ ان کو گاڑی میں بیٹھنے یا نکلنے میں تھوری سی مدد بھی درکار ہوتی تھی وہ جہاں بھی جاتیں تو پہلے بہوؤں کو اور اب چاروں پوتیوں میں سے کوئی ان کے ساتھ ہوتی۔ ہسل ان دنوں میٹرک کے امتحانوں کے بعد فارغ تھی۔ ہاتھوں کی طرح دادی کو انکار نہیں کر سکی، ان کے لیے تحائف میں سوٹ خریدنے کے بعد وہ دادی کی کزن کے گھر آگئی تھیں۔ وہ مارچ کی ایک خوش گوار سی شام تھی۔ حزام سمیت تمام گھر والے لان میں ہی براجمان تھے،

”تو کیا دادی کچھ نہیں بولیں؟“ ندا نے حسرت ویاس میں ڈوب کے پوچھا۔

”دادی کو موقع ہی کب دیا گیا۔“ اب صبوحی کے چہرے پر وہی ازلی سکوت چھا چکا تھا۔

”نیک نامی بھی کوئی چیز ہوتی ہے اماں۔“ دادی کے ہلکے سے شکوے پر دوسری طرف بہوؤں کے پاس بھی بھاری شکوہ موجود تھا۔

”اب دلوں کے مجید تو اللہ جانتا ہے کہ شانزہ دادی نے ہم چاروں میں سے کس کے لیے دامن پھیلا یا تھا۔“ صبوحی نے خفیف سے کندھے اچکا کر بے تاثر انداز میں کہا۔

”میں جانتی ہوں۔“ ہسل نے تھکی سی آہ بھری۔

”میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ ان دونوں ساس بہو کا اپنا فیصلہ ہوگا، حزام کو تو پروپوزل کے آنے اور پھر رد ہونے کی خبر بھی نہیں ہوگی۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ اس بندے نے کبھی ہمیں یا کسی خاندان کی لڑکی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہو۔ اس کی ریپوٹیشن جس قدر بھی خراب ہو مگر بندہ نائس ہے۔“ ندا کے اس بے لاگ تبصرے پر ہسل نے اسے بے دھیانی سے دیکھا تھا۔

”نگاہ تو اٹھتی تھی۔“ اس نے نگاہ جھکا کے جیسے خود سے اعتراف کیا۔

”خیر جیسا بھی ہے، وہ وہاں خوش ہم یہاں۔“ پیسہ ہضم، قصہ ختم۔“ ندا نے جمائی روکتے ہوئے اپنے نوٹس کا پلندہ اٹھایا اور فون چکر ہوئی۔

دس منٹ بعد وہ کمرے میں اکیلی تھی۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے بیڈ پر پھیلے کپڑوں کے ڈھیر کو بے دلی سے پرے کیا، وہ جانتی تھی کہ کچھ ماہ پہلے اس کی فیملی دوبارہ۔ پاکستان

قریب ہوئی۔

”چچا اپنے کمرے میں ہیں اور بقول ہماری اماؤں کے ان کو تو اس خبر کی بھنک بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ سمجھو کہ بات اسرائیل کی سرگوشی جیسی ہی ہے۔“ وہ مزید دھیمے سے گویا ہوئی تو وہ تینوں شخصیں ضرور مگر بات کا سرا نہیں پکڑ سکیں، وہ اسے مجسم سوال بنی تک رہی تھیں۔

”آج شانزہ دادی اور ان کی بہو، حزام نوید کا پروپوزل لے کر آئی تھیں۔“

ہسل کے دل نے جیسے پہلی سانس لی تھی اور چہرہ پیلا پھول ہوا جا رہا تھا۔

”کک..... کیا..... مم..... مان ہی نہیں سکتے۔“ عالیہ ہٹکا کے رہ گئی تو صبوحی کا قہقہہ بلا ارادہ تھا۔

”دیکھو ایسی خبر سنائی ہے کہ عالیہ بہ یک وقت مر غی اور بکری بن چکی ہے اور ہسل کو دیکھو جیسے سامنے بدروح کھڑی ہو۔“

”اچھا مذاق چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ حزام کا پروپوزل ہم چاروں حسیناؤں میں سے آیا کس کے لیے ہے؟“ ندا نے آہستہ سے کام کی بات کی تھی۔ ہسل نے دم سادھ لیا تھا کہ دل ہر مسام میں دھڑکنے لگا۔

”میں آج تم سے ملنے نہیں آئی مریم آپا! آج تو شانزہ خاتون تمہارے گھر اپنے پوتے کے لیے سوالی بن کے آئی ہے۔“ صبوحی نے بات کرنے کا ہو بہو وہی انداز اپنایا تھا کہ اس قدر صبر آزما موڑ پر بھی باقی تینوں ہنس دیں سوائے ہسل کے۔

”ابھی بات ان کے منہ میں ہی تھی کہ ہماری اماؤں پر تو سمجھو سکتے طاری ہو گیا، خیر قصہ مختصر کہ نہایت شریفانہ طریقے سے ان معزز خواتین سے معذرت کر لی گئی۔“ ہسل کے کپ سے گرم چائے چھلک کر اس کے پاؤں پر پڑی تو بے ساختہ سسکاری سی نکلی۔

خواتین ڈائجسٹ

حنا

نادرہ خاتون

550

ہو اس دوست مل کا کہ جب اہل کی جھپٹی سی نگاہ اس سر اہتی اور مسکراتی نگاہ سے ابھی بھی اور اس لمحے نے اسی دن انہیں ایک تعلق باندھ دیا تھا۔ حزام اس سے پانچ چھ سال تو ضرور ہی بڑا تھا کہ ان دنوں وہ یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔

چند دن کے وقفے سے دادی نے بھی انہیں ڈنر پر مدعو کیا تھا، سوائے حزام کے، ان کی فیملی نے یہاں کافی وقت گزارا تھا۔ دوسری بار چھ ماہ کے وقفے سے اس نے حزام کو ایک بک شاپ پر دیکھا تھا۔ اس دن وہ اپنی دوست کے ساتھ تھی۔

”واؤ، ہینڈسم۔“ اہل نے دوستوں کے کمنٹس پر مڑ کے دیکھا تو دل خوش گواری سے دھڑکا۔ جانے کیوں وہ انہیں بتا نہ سکی کہ وہ اسے جانتی ہے اور وہ مسکراتی سی نظر تعلق نبھانے والوں میں سے تھی کہ وہ اس پر اک محتاط سی نظر ڈالتا آگے بڑھ گیا تھا پھر خاندان کی کسی نہ کسی تقریب میں بھی اس سے سامنا ہوتا تو اس کی نگاہیں بس لہجہ بھر کو اہل کا چہرہ چھو لیتی تھیں۔ آنے والے ایک، ڈیڑھ سال تک اسے محسوس ہونے لگا کہ کچھ تو ایسا تھا جو اس کے اور حزام کے بچہ احساسات کو نمودے رہا تھا۔ پسندیدگی، دھیان یا پھر کچھ اور کہ اسے سامنے پا کر اس کا دل اس کے ہاتھوں سے نکلنے لگا تھا۔

ان دنوں اس نے پہلی بار ناول خریدا تھا۔ وہ ”پیار کا پہلا شہر“ پڑھنے لگی تھی وہ اعتبار ساجد کی شاعری پڑھنے لگی تھی۔

☆☆☆

اہل کے تایا محسن جن کی دو بیٹیاں صوبی اور عالیہ تھیں پھر تو قیر یعنی اہل کے بابا..... تو قیر سے چھوٹے نعیم چچا جن کی ایک بیٹی ندا، بہن سے کافی چھوٹا عاطف۔ اسکول سے آنے کے بعد جس کا تمام وقت مارکیٹوں کے چکر لگاتے گزرتا تھا اور سب سے چھوٹے چچا عرفان، جو اپنی سب سے بڑی بیٹی صوبی سے صرف دس سال بڑے تھے اور اب دو

بڑاواں بیٹیوں..... جمن اور عمن کا باپ کہلانے پر سرور ہوتے تھے نہ مغرور..... پھر ممنون ہونا تو بہت دور کی بات ہے، البتہ افسردہ ضرور ہوتے تھے کہ اللہ بیٹوں سے نواز دیتا۔

دادی سمیت یہ بھرا برا خاندان ایک ہی حویلی نما گھر میں رہائش پذیر تھا لیکن یوں ایک ساتھ رہنے کی وجہ ان کا مشترکہ کاروبار نہیں تھا (کیونکہ کاروبار تھا ہی نہیں)۔ گھر کے مردوں کے خیال کے مطابق آج کل کے حالات کے پیش نظر، الگ الگ رہنے سے جوائنٹ سسٹم کہیں فائدہ مند تھا۔ صبح ایک گاڑی، ایک ڈرائیور پانچوں بچے نمٹا جاتے، یعنی ڈرائیور کی تنخواہ اور پیٹرول کی بچت تو تھی سو تھی مگر بقول چھوٹے چچا عرفان کے کہ ایک ساتھ لڑکیاں محفوظ بھی رہتی ہیں اور ایک دوسرے پر نظر بھی رکھتی ہیں۔ اب اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو عرفان چچا کو مٹی کی شیر یا چیتے سے دلوائی گئی ہوگی مگر اس استفسار پر دادی نگاہ چرا کے بھجاتی تھیں۔ یہ جوائنٹ سسٹم جو اس بتا رہی تھی خوب چل رہا تھا کہ محسن تایا اور نعیم چچا کی بیویاں سگی بہنیں تھیں۔ دوسری طرف مسز تو قیر کے لاکھ منع کرنے اور ہزار بچ بولنے پر بھی ان کی نہایت نازک، نفیس، بڑھی لکھی بھانجی سارہ کو جانے چچا کی کون سی ادا بھانجی تھی۔ (سرخ انگارہ آنکھیں یا ان کی گونج دار آواز) کہ ادھر دادی نے رشتہ ڈالا ادھر جھٹ سے ”ہاں“ اور مسز تو قیر کا اس کارروائی کے بعد ایک ہفتہ لو بلڈ پریش کی وجہ سے بیڈ پر ہی گزرا تھا۔ خیر ایک ماہ کے اندر اندر سارہ دلہن بن کے اس شان داری کو مٹی کی چوٹی بہو بن چکی تھی۔

چاروں لڑکیاں اس سانچے پر آٹھ آٹھ آنسو روئیں (تو کل ملا کے بیس تو ہو ہی گئے تھے) اہل کا حساب اچھا تھا وہ ہر چیز بل میں کاؤنٹ کر لیتی تھی، دادی کو یہ ظلم ڈھانے کے لیے کیا اہل کی پیاری سی خالہ ہی ملی تھیں حالانکہ انہیں تو چچا کا رشتہ لے کر جنگل کا رخ کرنا چاہیے بھلے کسی لومڑی کا

انتخاب کر لیتیں جو چچا کی چالاکیوں اور سفاکیوں کا مقابلہ تو کر سکتی۔

شادی کی رات ان کا برا حال تھا کہ ابھی چچا کو کسی بات پر غصہ آیا اور بے چاری نئی نویلی دلہن کیونکہ ان کا غصہ ناک پر کہاں زبان کی نوک پر دھرا ہوتا تھا۔ صبح ان کے بیڈ روم سے ان سب نے تو سارہ آئی کی ہڈیاں چنے کا پردہ گرام بھی۔ بتایا تھا کہ ان کے لیے بال عالیہ کو چاہیے تھے۔ بد قسمتی سے چچا کا کمرہ بھی اوپر کے پوریشن ہی تھا۔

دوسری صبح سب لڑکیاں لاؤنج میں اپنے بیک پھیلائے بظاہر معروف تھیں کہ چچا کو یہ عمل پسند تھا۔ پڑھائی وہ بھی صبح سویرے..... مگر اس صبح وہ بیڈ روم سے باہر آئے تو فوری تیوریاں چڑھا کے لڑکیوں کو گھورا۔

”لو مار خوروں کے چہرے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ ان کا تو دم نکلا۔

”گاتا تھا گاتے میرے سرہانے ماموں کا بیٹا.....“ ندانے جھٹ سے چھوٹے عاطف کی بک اٹھائی جو کھولے بغیر پڑھ بھی لی۔ چچا اچانک ٹھٹکے اور ان خوش قسمت بھتیجیوں نے پہلی بار ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی چھب سی دیکھی تھی، جو اگلے ہی بل دم توڑ چکی تھی اور اس کی جگہ غیرت لے چکی تھی۔ انہوں نے تیرہ سالہ ندا کو بغور دیکھا۔

”اب سرہانے کھڑا ہو تو مجھے بتانا ساری زندگی کے لیے گانا بھول جائے گا۔“ وہ اسی موڈ کے ساتھ سیڑھیاں بھلا گئے۔ انہیں ہوش آیا کہ وہ یہاں کیوں بیٹھی تھیں، چچا کے بیڈ روم کا دروازہ دوبارہ کھلا، ان چاروں کی گردنیں ایک ساتھ گھومیں مگر ان کا صدمے کے مارے برا حال تھا، سامنے ہنسی مسکراتی سارہ کھڑی تھی۔

”میری نئی صبح کا پہلا استقبال کرنا ہی تھا تو چند پھول لے کے کھڑے ہونا تھا۔“ یوں ہی مسکراتی وہ ان کی جانب بڑھی۔

”آ..... آپ..... تو بالکل صحیح سلامت ہیں؟“ عالیہ نے اپنے چھوٹے چھوٹے بال چھوئے۔

”مجھے آپ کے کان بمعدہ جھمکوں کے چاہیے تھے۔“ ندانے بھی منہ سورا۔

”اور مجھے آپ کے کنگن کلائیوں سمیت چاہیے تھے۔“ آخری مطالبہ سننے تک وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

”کیا ہے بھئی؟“ اس نے مسکراہٹ سمیٹتی صوبی سے پوچھا۔

”آپ کو شیر کی کچھار سے صحیح سلامت نکلا دیکھ کر جو حال ہونا چاہیے تھا یہ سب اسی حال کا شکار ہیں ورنہ آپ کے حصوں کی تقسیم بندی بھی ہو چکی تھی۔“

سارہ کچھ دیر ان شرارتی چہروں کو دیکھتی رہی اور جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو دوسرے دن کی دلہن کے نتیجہ کو مٹی کی چھت پھاڑ رہے تھے اور نیچے تشریف فرمان کے شوہر غصے سے مل کھا رہے تھے۔

☆☆☆

اب ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی ان کا تعلق کسی جاہل گنوار، اجڈ میلی سے تھا ان کے دادا پنجابی تو دادی کامیکہ کراچی میں تھا۔ بھئی ہمارے پنجابی دادا پڑھی لکھی، منہ بنا سنوار کے اردو بولنے والی بیوی کے خواہش مند تھے سوا ایک دوست کے تو سطر سے ان کی یہ مراد برآئی (اب یہ نہ سمجھے گا کہ لاہور تعلیم یافتہ عورتوں سے خالی تھا) بس قسمت کی بات تھی۔ تایا، بابا اور چچا سمیت سب ہی اعلا تعلیم یافتہ اور اچھی پوسٹس پر تھے۔

ان کی اکلوتی پھپھولاہور کے نواح میں اپنے دوھیال میں بیانی گئی تھیں۔ دادی نے اپنے تینوں بڑے بیٹوں کی شادیاں بھی پورا لاہور کھنگالنے کے بعد، مہذب اور سلجھے ہوئے گھرانوں میں کی تھیں مگر ان کی دوسری نمبر کی بہو مسز تو قیر، ان کے خاندان کی کیا بات تھی۔ اہل کے نانا فارن سردس میں ہوتے تھے، اکلوتے ماموں بیورو کریٹ جن کی بیوی بھی

ایک نامور دیکل تھیں، خود اسل کی ماں نے ٹیکسٹائل ٹیمسٹری میں اسپیشلائزیشن کر رکھا تھا اس لیے اسل کا رکھ رکھاؤ اس گھر کے ماحول سے کسی طرح بھی میل نہیں کھاتا تھا۔ اس کی ماں نے اس کی تعلیم و تربیت اپنے میکے کے ماحول کی سی کی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی بول چال، وضع قطع، گھر کی باقی لڑکیوں سے قدرے علیحدہ تھی۔ پوری فیملی میں عرفان چچا سنگین مزاج کے ساتھ رئیس مزاج بھی تھے۔ تعلیم یافتہ تھے مگر غیر تعلیم یافتہ کہنی میں زیادہ خوش رہتے تھے، مختصر یہ کہ انہوں نے دنیا کو ہونا کے سر پر سوار کر رکھا تھا۔ صوبتی نے جب میٹرک کیا تو یوں ہی گھر میں تایا، تو قیر کے ساتھ صوبتی کا کالج میں ایڈمیشن کروانے کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے، باقی سب بھی وہیں موجود تھے۔

”لڑکی کے لیے میٹرک ہی کافی ہے، اب ان کے لیے نہ ڈھونڈیں۔“ چچا نے جانے کس لہجے میں بات کی تھی، بابا نے انہیں تحیر کے ساتھ دیکھا۔ ”ابھی نہ ڈھونڈنے کی عمر نہیں ہے اس کی، ابھی ہم اس کے لیے پر ڈھونڈیں گے، جن کی بنا پر دنیا جیتی جاسکتی ہے۔ جن کی بنا پر ستاروں کو چھوا جاسکتا ہے۔ یہ دنیا جنگل ہے عرفان اور جنگل میں بے پرکی مخلوق حملہ آور کی زد میں پہلے آتی ہے، بھیڑ ہو کہ شیر۔“ تو قیر اور نعیم نے بھائی کی بات پر جیسے سر دھنسا تھا۔

”آپ دنیا کے اطوار بھی دیکھ لیں، معاشرہ کس قدر خراب ہو چکا ہے۔ آج کل لڑکی گھر سے باہر کہاں محفوظ ہے۔“ ان کے لہجے کا کھنچاؤ ہنوز تھا۔ ”تمہاری بات سے بھی انکار نہیں۔ اللہ سب کو محفوظ رکھے، اب جن گھروں میں چور ڈاکو کھس آتے ہیں تو ذرا سوچو کہ کیا کیا جاہیاں مچا کر نہیں جاتے۔“ نعیم کی اس بات پر سب کی نگاہیں پل بھر کو جھک گئی تھیں اور دل لرز کے رہ گئے۔

”گھر ہو یا بازار، ہر جگہ اللہ سے امان طلب

کرتے رہنا چاہیے کہ معاشرے کے خوف سے گھر میں گھس کر بیٹھنے سے اللہ پر توکل کہیں بڑی چیز ہے۔“ محسن تاپانے اس بات کے ساتھ ہی محفل پر خاست کر دی تھی۔ صد شکر کہ اس کے بعد عرفان صاحب نے ان کے تمام تعلیمی ادوار میں زبان ضرور بند ہی رکھی مگر ان پر نگاہ اس طرح رکھی کہ اسل کے ہاتھ میں نادل دیکھ کے چچا کے چہرے پر ایسا تاثر ہوتا جیسے اس کے ہاتھ میں پتھر دیکھ لیا ہو۔

☆ ☆ ☆ وہ موسم بہار کی ایک غنودگی بھری سہ پہر تھی جب دادی نے ایک عرصے بعد اسل کو اپنے ساتھ نویدولا جانے کے لیے کہا، اس کی تو سمجھو مراد برآ کی تھی۔ بلاشبہ وہ بڑی سرمست سی عمر تھی۔

دادی کی کزن یقیناً بیمار تھیں جو انہوں نے راستے میں ڈھیر سارے پھل خرید ڈالے پھر اسل کے کہنے پر ایک خوب صورت سا بکے بھی خرید لیا۔ تمام پوتیوں میں سے دادی کو اس کی خود اعتمادی اور بات چیت کا انداز بے حد بھاتا تھا، وہاں جا کر اسے معلوم ہوا کہ شانزہ خاتون تو بھی چنگی تھیں مگر حزام ایک معمولی سے ایکسیڈنٹ میں خاصا زخمی ہو گیا تھا۔ دادی تو شاید باخبر تھیں، سو جاتے ہی حزام کی ماما سے اس کی خیریت دریافت کی، اب وہاں دونوں بزرگ خواتین جانے ماضی کے کون سے قصے چھیڑ بیٹھی تھیں اور وہ بور ہو رہی تھی کہ بات کرتے ہوئے دادی کی نگاہ اس بکے پر پڑی۔

”مجھ سے تو میٹر حیاں چڑھی نہیں جاتیں، تم میری طرف سے بھی اس کی خیریت پوچھ لینا اور یہ بکے بھی لیتی جاؤ۔“

پہلے تو وہ کچھ متاثر سی ہوئی۔ ”لو..... اب میں ایسی بھی جھینپو نہیں ہوں۔“ میٹر حیاں چڑھتے ہوئے وہ کچھ نروس سی تھی۔ ”اب کیا پورا بکے لے جاؤں اتنا بڑا.....“ دروازے کے پاس رک کر اس نے اس میں سے دو گلاب کی ٹہنیاں نکال لیں یا شاید تین پھر

پلٹ کے بکے ٹیکل پر رکھا۔ مگر کمرے میں جا کر اس کی خود اعتمادی ہوا ہوئی کہ اسے دیکھتے ہی مریض کی جون ہی بدل گئی تھی۔ بولتی ہوئی آنکھیں تو سنی تھیں مگر وہ چہرہ بھی کیا خوب بولتا تھا۔

”مجھے دادی نے کہا کہ میں آپ کا حال پوچھ آؤں۔“ اب وہ بیڈ سے قریبی صوفے پر بیٹھی نروس ہو چکی تھی (کہ صوفہ کچھ زیادہ ہی قریب تھا)۔ مخاطب نے نگاہ اسل کے ہاتھ میں پکڑے گلابوں سے ہٹائی اور اسے غور سے دیکھا جس کے چہرے پر ایک بہاری اتری ہوئی تھی۔ ایک ہلکی سی چمکتی ہوئی سی بات کھلکھلا رہی تھی۔

”کہ میں اک جملہ نہیں ایک مکمل داستان بن جاؤں گی، جو سنائی جاتی ہے جو سنی جاتی ہے۔“ اس لڑکی کی وہ عمر ایک خوب صورت جملے کی مانند تھی جسے بولا نہیں جاتا، سمجھا جاتا ہے۔

حزام اب سنجیدہ اور سمجھنے کی عمر میں آچکا تھا اور سامنے بیٹھی لڑکی کی عمر اک زمانہ فنا کرنے جیسی تھی، وہ ایک جملہ سن کے آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا۔ دل عجب بے مہارت تھا، جس نے کچی کچی کہانی کے چند الفاظ پڑھے تھے اور انہیں ایک خاص مقام پر لکھ بھی لیا تھا کہ وہ شخص حیران دیکھتا ہی رہ گیا۔

”اٹس اوکے۔“ وہ اٹھنے لگی۔ ”ارے بیٹھے تو.....“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”ہاں تو دادی نے آپ سے میرا حال پوچھنے کو کہا تھا۔“ وہ شریر سی حیرت کے ساتھ بولا۔ ”تو پھر پوچھا کیوں نہیں؟“ اس نے اسل کی آنکھوں میں دیکھا اور وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

”میں کہہ دوں گی آپ ٹھیک ہیں۔“ اسل نے سر اٹھایا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

”کیا واقعی؟“ حزام کا لہجہ اپنی داستان کا پہلا صفحہ سنانے جیسا تھا مگر اس لڑکی کے پاس جمع شدہ الفاظ ابھی کچے تھے تو نئے جیسے سبے ہوئے سے کہ وہ

داستان سنانے کی عمر میں ابھی نہیں آئی تھی سو وہ ان کی باتوں کو قریب سے سمیٹتی کھڑی ہوئی۔

”یہ گلاب دادی نے دیے تھے..... میرا مطلب کہ بکے بھی تھا۔“ وہ ایک بار پھر گڑبڑا گئی۔

”اف دادی اور گلاب.....“ اس کا چہرہ تپ سا گیا، اس کے کھلے بال لہرے دار تھے ان پر نگاہ ٹھہری جاتی تھی۔ وہ حواس کم کرنے جیسا لگتا تھا کہ وہ دیکھتا رہ گیا ان گلابوں کو، اور اس کا دل چاہا وہ اپنی داستان کا دوسرا صفحہ پڑھنا شروع کر دے۔

”چلو مان لیتے ہیں کہ حال دادی نے پوچھا تھا، مگر یہ دو گلاب اپنے حساب میں ہی رکھ لو۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

وہ دو گلاب نہیں تھے وہ کچی عمر کی شرارت اور کچی عمر کے عذاب تھے۔ وہ پہلو کے بل ذرا سیدھا ہوا اور آگے کو جھک کے اس کے ہاتھ سے گلاب لے لیے، وہ نہیں جانتی تھی کہ آنے والی کسی بہار میں وہ اس لمحے کا حساب کتاب مانگنے کبھی مقابل بھی آسکتا تھا یا پھر عمر کے اس حصے میں کبھی احساس ہی نہیں ہوتا۔ خواب ششے کے ہیں یا پتھر کے، جیسے عمر کے اس حصے میں کچھ بھی ٹوٹنے جیسا نہیں لگتا، بکھرنے جیسا نہیں لگتا بھلے وہ نرم لہجوں میں کی گئی کلچر سی بات ہو۔ بھلے وہ بہار کے گلاب ہوں یا پھر وہ کچی عمر کے بے مہارت سے خواب ہوں۔

☆ ☆ ☆

”اسل تمہارے ہاتھ میں نادل کیوں ہے؟“ چچا کو جب اندازہ ہوا کہ وہ ناگ نہیں کتاب ہے تو کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔ جانے انہوں نے کس سمت سے چھاپہ مارا تھا اور وہ ایسے ہی دے پاؤں راستے بدل کے آتے تھے۔ پتا نہیں وہ چور دروازوں سے کیوں آتے تھے، انہیں کون سے وہم ستاتے تھے تاہم وہ سر پر پہنچے اور اسل کے تینوں پہرے دار اسے خبردار بھی نہ کر سکے۔ ان دنوں وہ یعنی اسل حزام نوید کی محبت میں

بری طرح گرفتار تھی، اس کے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے مگر اب اس کی سانس آسمان کی طرف ضرور پرواز کرنے والی تھی کہ اس کے ہاتھ میں آج ”پیار کا پہلا شہر“ نہیں ”منٹو کے افسانے“ تھے، جو انہوں نے ہاتھ بڑھا کے جھپٹ لیا تھا اور مصنف کا نام پڑھتے ہی ان کا چہرہ بہ یک وقت زرد اور سرخ ہوا۔

”وہ..... یہ مطلب کورس کی کتابوں میں شامل ہیں۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کے سفید جھوٹ بولا۔

”یہ افسانے اب کورس کا حصہ ہیں؟“ وہ پھنکارے۔ ”غضب خدا کا کوئی شریف آدمی اپنی بچیوں کو اب پڑھا بھی نہیں سکتا۔“

کئی بل کے توقف کے بعد انہوں نے کچھ کہا بھی تو کیا کہ میری سانس دل میں اٹکی۔ یعنی وہ کھلم کھلا اس کے بابا کو بد معاش کہہ رہے تھے۔ وہ مڑے اور اس کے پہرے پر تعینات ندا کو بلا وجہ گھورا، جس میں اب کوئی رشتہ بھری تو اتائی رہ گئی تھی۔

”لو..... اور سنو! اب اس عمر میں لڑکیوں کے ہاتھوں میں ناول نہیں تو کیا بندوق ہوگی۔ تمہارے ہاتھ میں ناول کیوں؟“ شوہر کی نقل اتارتی سارہ نے پاپ کارن کا باؤل سامنے ٹیبل پر پٹا اور چچا جنہیں چند قدم آگے جا کر یاد آیا تھا کہ وہاں تو بیوی بھی براجمان تھی، انہی قدموں پر لوٹ کے بیوی کے ارشادات سن چکے تھے۔

”بجائے انہیں سمجھانے کے کہ یہ عمر اس طرح کی فضول کتابیں پڑھنے کی نہیں، الٹا ان کی طرف داری کر کے ان کا دماغ مزید خراب کر رہی ہو۔“

اور لفظ مزید پر ان لڑکیوں کو علم ہوا کہ وہ پہلے سے خراب ہیں۔ صبحی نے خامے مزے سے گردن اکڑائی۔

ایسل کا سر بھی قدرے فخر سے بلند ہوا، یعنی خراب چچا کی خراب بھتیجیاں.....

”یہ ناول پڑھنا، شعراء کو پڑھنا، یہ گیت، یہ غزلیں..... یہ سب اسی عمر کے مشاغل ہیں عرفان صاحب! جب منہ میں دانت نہ ہوں تو ”پیار کا پہلا شہر“ کون پڑھے گا تب صرف آخرت کی فکر ہوتی ہے۔“

اور چچی کی اس قدر بہادری انہیں گیدڑ بنا چکی تھی کہ ندا اور عالیہ ایک ساتھ باتھ روم میں گھسیں، یعنی واقعی خراب چچا کی.....

”اوپ..... ہوں.....“ بہادر صبحی نے بھاسی ایسل کا ہاتھ کسی ہیرو کی طرح ہی پکڑ لیا تھا۔ مطلب فساد کی جڑ یہیں ٹھہرو۔

”یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے سارہ! ہر بات کے بیچ میں مت آیا کرو۔“ الفاظ و انداز اس قدر سرد، انہوں نے کسی مجھے سیاست دان کی طرح سارہ کو تنبیہ کی۔

جوابا چچی کی آنکھوں میں بھی باغی لیڈر کے جیسی بے آواز پھنکار تھی کہ ”آؤں گی اور ضرور آؤں گی“ چچی جو شادی کے شروع دنوں میں خود کو امامہ ہاشم سمجھتی تھیں اور ایک سنگین واقعے کے بعد وہ اس خوش فہمی سے نکل آئی تھیں۔ اب گزرتے وقت کے ساتھ وہ خود کو قلم ”محبیتیں“ کا شاہ رخ خان سمجھنے لگی تھیں تو اس میں بھلا قصور کس کا تھا۔ اب پتا نہیں انہوں نے کتنی مدت تک خود کو اس عہدے پر فائز رکھنا تھا۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ سارہ شادی کے بعد کچھ یوں سرور اور مغرور تھیں جیسے ان کی شادی عرفان چچا سے نہیں سالار سکندر سے انجام پا چکی ہو مگر ان کی قسمت کچھ اچھی تھی کہ شادی کے چند ہفتوں بعد خواب ٹوٹ گیا کہ یہ بندہ سالار سکندر نہیں عرفان حسنین ہے۔

اس دن گھر کے کچھ لوگ ابھی جاگ رہے تھے اور کچھ پہلی اونگھ میں ہوں گے تو اچانک اس نو بیاہتا جوڑے کے کمرے کا دروازہ اک دھاڑ سے کھلا۔

ساتھ ہی چچا کی بھاری آواز میں لاجول ولاقوہ جیسے الفاظ۔ ان معصوم بھتیجیوں کے کانوں میں بھی پڑے، اب کسی کی نیند کہاں باقی رہ سکتی تھی۔ کچھ اوپر کو بھاگے جیسے کہ تو قیر اور مسرت تو قیر..... دادی سمیت باقی لاؤنج میں نکل آئے تھے۔

”محترمہ کا فرمان ہے کہ کمرے میں موجود چھپکلی مارو یا باہر نکالو تو میں صبحی کو بلانے نکلا تھا۔“ باہر کھڑے ہجوم کو انہوں نے سرخ نگاہوں سے دیکھا کم، گھورا زیادہ..... تو باہر کھڑے ہجوم کی سانس بحال ہوئی اور دانت منہ کے اندر گھسائے کہ نقص امن کا خطرہ تھا۔

”تو اس میں اتنا گرجنے پر سننے کی کیا ضرورت تھی، بہو بے چاری نے کون سا سانس نکالنے کو کہا تھا۔“ دادی نے نچلے لاؤنج سے خوب ہانک لگائی۔

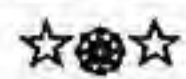
”کاش کہ سانس ہوتا.....“ چچا نے سر جھٹک کے ہاتھ پہلوؤں پر رکھے، سارہ مزید دل کے اپنی خالہ کے قریب ہوئیں۔

”اب مجھ پر اتنا برا وقت آ گیا ہے کہ میں ایک کمزوری چھپکلی کے پیچھے بھاگتا پھروں۔“ کیا جیتے جیسا انداز تھا کہ سارہ کی آنکھوں سے آنسو تک خشک ہوئے۔

”ہائے سالار سکندر تم کہاں ہو؟“ لڑکیوں کا دل چاہ رہا تھا کہ لاہور کی سڑکیں چھانٹتے ہوئے اسے کہیں سے ڈھونڈ نکالیں۔

”اُف، عمیرہ احمد! امامہ ہاشم واحد خوش نصیب کیوں، اور ہم سب محروم.....“

اللہ اللہ کر کے کوئی رات کے ڈھائی بجے تک چھپکلی مار صبحی نے اس ولن قسم کی چھپکلی کو ٹھکانے اکائی دیا تھا تب تک چچا مار چلا لاؤنج میں صوفہ کم بیڈ پر سکون کے ساتھ سوئے خزانے لے رہے تھے۔



اس سرمستی پر سارہ کے بعد ایسل کا حزام سے سامنا نہیں ہوا تھا، دادی نے نوید دلا کے دو چار

چکر لگائے بھی تو اس نے دادی کو ندا کو لے جانے کو کہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو حزام کے بارے میں اڑنے والی افواہیں بھی تھیں کہ ایسل کی ماموں زاد صبا اسی کلب کی ممبر تھی جہاں حزام کی ممبر شپ تھی۔

”خیر ابھی اتنی عام نہیں ہوئی مگر سنا ہے کہ جن لڑکوں نے کسی ماڈل گرل کو کنڈنیپ کیا ہے ان میں حزام کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔“ صبا نے اسے دھیسے لہجے میں بتایا، ایسل کا دل برف کی طرح پگھلا۔ وہ آج ماموں کے گھر صبا کی برتھ ڈے پر مدعو تھے۔

”مگر ایسی باتیں کیاں چھپتی ہیں کہ ایک ہفتہ بعد خبر منظر عام پر آئی گئی تھی۔ حزام بھی شامل تفتیش ہوا مگر وہ الزام اس پر جھوٹا ثابت ہوا تو دادی نے بھی شکر کا کلمہ پڑھا تھا مگر شاید ٹھیک کہتے ہیں کہ بد سے بدنام برا، تو صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔

”شانزہ خاتون کا پوتا دیکھنے میں کیسا بھلا مانس سا تھا۔“ تائی فائزہ نے سوال کر دیا تو جیسے سب کو موقع چاہیے تھا۔

”ایلیٹ کلاس میں تو وہ اندھیر چاہے کہ حد نہیں۔ بس اماں اب آپ کے ساتھ لڑکیاں نوید دلا نہیں جایا کریں گی۔“ یہ تبصرہ اور یہ حکم عرفان کا تھا۔ ایسل کا دل بیٹھ سا گیا۔

”کاروباری مخالفین بچے کی ساکھ خراب کرنا چاہتے تھے، حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہے۔“ دادی نے دبے لہجے میں اس کی طرف سے صفائی پیش کی۔

”جس قماش کے اس کے دوست ہیں، میں سب جانتا ہوں۔“ چچا کا لہجہ تپ سا گیا۔

”اور جس قماش کے تمہارے دوست ہیں، میں بھی جانتی ہوں۔“ دادی بھی کہاں پیچھے ہٹنے والی تھیں۔ چچا نے بوکھلا کے بھتیجیوں کو دیکھا۔

”اماں! یوں لڑکیوں کے سامنے آپ مجھے ایک غیر شخص کے لیے.....“ چچا سرخ چہرے کے ساتھ بھٹا کر بولے۔

جتنا ہی جانتی ہوں اور جہاں تک تمہاری بھتیجیوں کی بات ہے تو وہ اس قدر بھولی نہیں ہیں۔“ دادی کی اتنی صاف گوئی، چچا تو جیسے اچھل کے کھڑے ہوئے تھے۔ ان ہی دنوں پھپھو نے شازمہ کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی تھی تو حزام والا معاملہ جیسے ہم سب کی گفتگو میں دب کر رہ گیا، ان کا بھی کسی فرسٹ کزن کی پہلی شادی تھی، سو جوش و خروش دیدنی تھا۔ دادی بھی اپنی اکلوتی نواسی کے لیے خوب شاپنگ کر رہی تھیں۔

ایک روز شاپنگ کے دوران ہسل نے سرسری سا لہجہ اپناتے ہوئی صبا سے حزام کی بارے میں بات کی تو اس کے جواب نے اسے ششدر سا کر دیا۔

”یہ سچ ہے کہ کچھ مخالفین ان کی ساکھ خراب کر کے ان کا اچھا بھلا بزنس تباہ کرنا چاہتے ہیں مگر میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ ہی لوگ یہاں بھی دشمنی دکھا رہے ہیں جن کی وجہ سے نوید اکل کراچی چھوڑ کے یہاں سیٹل ہوئے تھے ورنہ کہاں کراچی اور کہاں لاہور۔“

صبا کی بات میں وزن تھا، اس کا دل ڈوبا کہ معاملہ واقعی ٹھیکر تھا ورنہ اپنا گھر بار اور بھائی بھانجیاں بزنس چھوڑ کے آنا کوئی آسان تو نہیں تھا۔ ان دنوں سرد موسم میں بھی اسے پسینے آتے تھے، اپنا دل ٹٹولتی۔ ابھی میں اتنا آگے نہیں بڑھی تھی مگر اس کا دل بھی جیسے خاموش سا ہو چکا تھا جو اسے صبح دم پر ٹل رہا تھا نہ اس راہ سے واپس آنے کا مشورہ دے رہا تھا۔



یہ وہ وقت تھا جب اس کے تھرڈ ایئر کے امتحانات ہو رہے تھے جن کے اختتام کے دو دن بعد شازمہ کی شادی تھی۔ وہ شدید سردیوں کے دن تھے، وہ کالج سے باہر آئی تو دادی کو گاڑی میں موجود پایا۔ ”اف، اب دادی کا ارادہ بازار جانے کا ہوگا۔“ مگر وہ بنا کسی پوچھ کچھ کے بیٹھ گئی۔ موسم ٹھنڈا

ہونے کی بنا پر گاڑی میں ہیٹر آن تھا، آج کل تو اس کی نیند بھی پوری نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ذرا ٹیک لگا کے بیٹھی تو نیند میں اترنے کا پتا ہی نہیں چلا کہ پھر دادی کے ٹھوکا دینے پر ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور متحیر سا ہو کے نوید والا کے شان دار گیٹ کو دیکھا، وہ خود بھی کم حیثیت کے نہیں تھے مگر دادی کی کزن کا سسرال ایلٹ کلاس میں شمار ہوتا تھا۔

”یہ تم کیا کوسے میں چلی گئی ہو؟“ دادی کی ڈانٹ پر اسے اترنا ہی پڑا۔

جانے کیوں آج اس شاہانہ گھر میں آ کے اس کا دل خوش گواری سے نہیں دھڑکا تھا یہ کیسے لوگ تھے اور وہ کیا معرہ تھا جسے حل کیے بنا وہ چار سال قبل یہاں آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ اپنی سوچوں میں کم ست قدموں کے ساتھ ہی گھر کے رہائشی حصے میں آئی۔

”میں اور شازمہ جیولر کے پاس جا رہے ہیں، ایک گھنٹے تک آجائیں گے۔“ اسے مطلع کرنے کے ساتھ ہی دادی نے باہر کا رخ کیا تھا۔

”تم یہاں اپنے گھر کی طرح ہی آرام سے بیٹھو، عدم (ملازم) گھر پر ہی ہے۔“ شازمہ خاتون نے اس کا زرد چہرہ نرمی سے چھوا۔

”چلو شکر ہے“ اسے کچھ سکون محسوس ہوا کہ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

عدم دس گیارہ سالہ بچہ تھا جو چندرہ بیس منٹ بعد جائے کے ساتھ جانے کیا کچھ اٹھالایا تھا مگر اس کی بھوک اتنی نعتیں دیکھ کر بھی نہیں جاگی تھی۔

اس نے سینئر ٹیبل پر دھرا میگزین اٹھایا ہی تھا کہ عقب سے زینہ اترنے کی دھپ دھپ ابھری، اس کا دل کسی اندھیرے میں ڈوبا، بھلا دل سینے میں کہاں دھڑک رہا تھا بلکہ آس پاس اور کھڑکیوں دروازوں پر پٹاپٹ بج رہا تھا۔ اگلے لمحے وہ اس کے سامنے نہایت مہذب انداز میں براجمان تھا۔ ہسل

نے اپنی بھیلی پیشانی کو چھوا۔ ”آج مجھے بھی میری دادی نے کال کر کے کہا ہے کہ آپ کا حال پوچھ لوں۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے بغور اسے دیکھ کے کہا تھا، اپنے مخصوص مسکراتے، ٹھہرے ہوئے لہجے میں، جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔

وہ ٹھنڈا دھڑکتی جیسے وہاں تھی ہی نہیں، حزام نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ سمجھ رہا تھا دیکھ رہا تھا کہ آج اس تروتازہ سے چہرے پر وہ چمکتی سی تحریر مٹی مٹی سی، بھمکی بھمکی سی تھی تو کیوں تھی؟

”لگ رہا ہے کہ دادی نے آج آپ کو کالج سے کڈ نیپ کیا ہے۔“ اس نے بات بڑھانے کی غرض سے ایک اور سوال کیا اور لفظ کڈ نیپ نے جیسے ہسل کے دل میں ہل چل مچائی تھی۔ وہ اس کے یونیفارم سے بھانپ چکا تھا۔

ہسل نے اسے بے ساختہ اور عجیب سی نگاہوں سے دیکھا جس میں شک بھی تھا، شکوہ بھی۔ حزام کی نگاہ میں سنجیدگی اتری کہ بات اب ایک محتاط سی نگاہ سے کب کی آگے بڑھ چکی تھی جس دن اس نے اپنی داستان کا پہلا صفحہ اسے سنا دیا تھا۔ آج ہسل کے انداز میں خود اعتمادی تھی، نہ اس نے نگاہ چراہی نہ سامنے بیٹھے شخص نے نگاہ بدلی تھی کہ ان دلوں میں اب ایک بھولی بری نگاہ کا تعلق نظر کے ارتکاب تک آ پہنچا تھا اور سامنے بیٹھے شخص کی آنکھیں اچھی یادداشت کی مالک تھیں اگرچہ آج بھی ہسل کے پاس کالج سے کچھ لفظوں ہی کا انبار تھا مگر اس کی آنکھوں میں جھلکتا سوال جیسے پھر سا تھا۔

”میں اچھا بھلا سورہا تھا کہ دادی کی کال آئی کہ گھر میں موجود مہمان میرے آنے تک تمہاری ذمہ داری ہے۔“ وہ ان آنکھوں کے سوال اور شکوے نظر انداز کرتا یوں بے نیازی سے گویا تھا کہ وہ کس کے رہ گئی۔

اس جیسے ہوئے موسم میں بھی اس کے لہجے کی

ریت ایک دم تروتازہ سی ہوئی تھی کہ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اچانک اٹھا اور اس نے ایک قیمتی قمیص سی پلیٹ میں تھوڑی سی نمکو ڈالی اور اس سے قریبی صوفے پر ہی براجمان ہوا، ہسل کے چہرے کا رنگ اڑا۔

”اگر میں اس قدر خراب بندہ ہوتا تو میری دادی مجھے گھر سے جانے کا حکم دیتیں نا کہ تمہیں کہنی دینے کے لیے مجھے فوراً کمرے سے باہر آنے کا حکم ملتا۔“ اس کا لہجہ مضبوط اور شفاف تھا کہ ہسل کی پلکیں کپکپا کے رہ گئیں۔ موسم صرف لہجے کی حد تک نہیں بدلاتھا، اس کی گلابی سے آنکھوں میں بھی پہلے سی سرشاری سمٹ آئی تھی (یہ کس قدر چالاک ہے، نمکو لینے کا تو بہانہ تھا) اس کے یوں قریب آ کے بیٹھنے سے اسے ابھمن سی ہو رہی تھی۔

”تمہاری نگاہ کا شکوہ مجھے اچھا لگا ہے۔“ وہ پھر سے سنجیدہ ہوا اور لہجے کی اس تازہ سی ریت کو آنکھوں کی راہ دکھائی۔ ”میں اتنا اچھا انسان نہیں ہوں مگر اتنا برا بھی نہیں ہوں کہ تم ہمارے گھر آنا ہی چھوڑ دو۔“ اب شکوہ کرنے کی باری اس کی تھی اور آنکھوں کا شاداب سا موسم ہسل کے چہرے پر اثر پذیر ہو رہا تھا کہ کئی دنوں سے خاموش دل نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ اور کس طرح واضح کرتا کہ میں بھی تمہارے ساتھ اس پہلی نگاہ کے لمحے میں بندھا ہوں، اس نے ہسل کے ذرا سیٹے بالوں کو بغور دیکھا۔

”اور یقین کرو اگر زندگی میں کسی لڑکی کو کبھی کڈ نیپ کرنے کا پلان بناؤں گا تو وہ تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہوگی۔“ ہسل نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”جی۔“ وہ متوحش سی ہوئی۔ ”جی۔“ وہ اس کی حواس باختگی پر کھل کے ہنسا تھا اور پلیٹ میز پر رکھ کے اک الوداعی سی نگاہ ڈالتا لاؤنج کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا،

ہیسل نے جیسے اک آزاد سانس بھرا..... کہ دل
یکا یک ہلکا ہلکا سا ہو کے دھڑکنے لگا تھا۔

☆☆☆

”آیا کو اس آدمی میں سوائے دولت کے ایسا
کیا نظر آیا کہ بیٹھے بیٹھے رشتہ بھی طے کر دیا اور
شادی کی تاریخ بھی فائل کر لی۔“ چچا نے یہاں بھی
کیا خوب معصوم سا نقص نکالا تھا کہ وہ ایک دوسرے
کو دیکھ کے مسکرائیں ورنہ دل تو قہقہہ لگانے کو چاہا
تھا۔

ان کی اکلوتی پھپھوکافی سے زیادہ بھاری بھر کم
وجود کی مالک تھیں، اب رشتہ تو بیٹھے بیٹھے ہی طے
ہوتا تھا اب وہ کس طرح بھاگ بھاگ کے شادی کی
تاریخ طے کرتیں یعنی کہ یہاں بھاگ دوڑ کا کام ہی
کیا تھا مگر چچا..... دادی نے اس بات پر تیوریاں
چڑھا کے بیٹے کو گھورا۔

”شازمہ کے معاملے میں تمہاری بہن نے
تمہیں ہر بار بیچ میں ڈالا، اب گیارہویں بار بھی تم
معاملے میں پڑتے تو اس کا انجام بھی پچھلے دسویں
جیسا ہونا تھا میاں! ارے میں پوچھتی ہوں دنیا کا
کوئی مرد تو عرفان صاحب کی نظروں میں اچھا اور
پارسا ہوگا بھی کہ نہیں، سب کو اپنے جیسا سمجھنا چھوڑ
دو میاں۔“

”اللہ..... دادی کے اندر چاروں اور دو کلیجے تو
ضرور ہی ہوں گے۔“ وہ ہر بار کی طرح سوچ کے رہ
گئیں۔ اب چچا کا چہرہ لال شدہ اور سارہ چچی اپنی
ساس کو چٹاٹ نکا ہوں سے چوم رہی تھیں اور وہ
دادی کے ہاتھوں کو (جو چچا کے سامنے بنا تامل آئینہ
جور کھتے تھے)۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ دادی نے آج لہجہ پر شازمہ
کے ہونے والے شوہر کو جمع اس کی فیملی کے مدعو کیا
تھا اب ہمارے دیکھنے میں تو ہمارے بہنوئی جواد
صاحب خوش گفتار اور خوش اخلاق ہونے کے ساتھ
خاصے حسن پرست بھی تھے۔ مجال ہے جو تمام وقت

وہ ہم چاروں سالیوں پر سے نگاہ ہٹا پائے ہوں۔
اب اس میں اس کا کیا قصور کہ خدا نے ہمیں کچھ زیادہ
ہی فرصت سے بنایا تھا۔ ہا ہا ہا۔

کسی کے گھر میں بیٹھنے کے طور طریقوں سے
بھی واقفیت ہونی چاہیے اماں! مجال ہے جو ذرا نگاہ
جھکا کے بیٹھا ہو۔“

”آف.....“ اب اگلی باری ان کی تھی کہ یوں منہ
اٹھا کے بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی سو کھٹکنے میں ہی
عافیت تھی۔ صبحی تو پہلے ہی جا چکی تھی ہیسل، ندا اور
عالیہ بھی آگے پیچھے اور رخ اوپر کی طرف۔ وہ چونکہ
کل نوید دلا سے ہو کے آئی تھی تو کل اس کی حالت
غیر تھی۔

تو لاکھ چلے رہے گوری تھم تھم کے
پائل میں گیت۔ ہیں چم چم کے
آواز اگرچہ دھیمی تھی مگر گیت کا جادو سر چڑھ
کے بول رہا تھا اور اسی گیت کے زیر اثر..... وہ اپنے
عقب سے بے خبر تھی۔

”تو پیا سے مل کے آئی ہے“
یہ سر لگانے کے ساتھ ہی میں نے خیالی پائل
بھی چھٹکانی اور ذرا سا لہرا کے جوں ہی ترچھے رخ
ہوئی، جادو کا اثر تو پل میں ٹوٹا ہی تھا بے چاری پائل
بھی چھٹکانے سے ٹوٹی کہ چچا کی آنکھوں کی گرمی نے
اس قدر سردی میں بھی اسے اور اس کی پہلی محبت کو
پانی پانی کر دیا۔

”آپ لوگوں کی تربیت اس طرح تو نہیں کی
گئی کہ یوں منہ پھاڑ کے بے ہودہ گیت الاپے
جائیں۔“

”آف.....“ صد شکر کہ آنکھوں کی نسبت
آواز قدرے ٹھنڈی تھی۔ ہیسل کی ریڑھ کی ہڈی ذرا
سار سرائی تھی، اس نے بوکھلا کے سامنے دیکھا۔

لڑکیاں اسے میدان میں نہتا چھوڑ کے اودھ
کھلے دروازے کے دوسری طرف دانت نکال رہی تھیں،
اب وہ کیا جواب دیتی (کہ وہ محبت جیسی

تھیں غلطی کی مرتکب ہو چکی تھی)۔
”پہلی بار سنا ہے کہ گیتوں کا تعلق تربیت سے
ہوتا ہے، بھی گیت کا تعلق تو کیفیت سے ہوتا ہے۔“
بالآخر شوہر کے ساتھ قدم اٹھانی سارہ خاموش نہیں رہ
سکی تھیں۔ چچا نے سرد نگاہوں سے انہیں گھورا۔

”اب پلیز یہ مت کہنا کہ اس عمر میں یہ
گیت..... مم..... مطلب بڑھاپے میں تو ویسے ہی
تھم تھم کے چلنا پڑتا ہے عرفان!“ اندر وہ سب قل
قل بننے لگیں۔

”شٹ اپ سارہ۔“ ہنستی بیوی کو تنبیہ کرنے
کا انداز دوستانہ نہیں تھا تو غیر مہذبانہ بھی نہیں تھا۔
”یہ میرا گھر ہے، گرد و گل پونیورسٹی کا ہاسٹل نہیں، لہذا
شاہ رخ خان بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ انہوں
نے اتنا کہہ کے کمرے کا دروازہ کھٹ سے بند کیا اور
ادھر کمرے میں وہ چاروں ایک دوسرے کو ہکا بکا
تک رہی تھیں۔ وہ گرد و گل کے اڑتے خشک پتے، وہ
پتوں پر لکھے رومیٹک حروف، وہ اڑتے گلاب.....
وہ گیت۔

مر بھی جائیں یار والے
مٹ بھی جائیں پیار والے
زندہ رہتی ہیں ان کی محبتیں
فقط اس کا دل یہ گاتے ہوئے دھمال ڈال رہا
تھا۔

”اور سنو..... کہاں کا گرد و گل اور
کہاں کی محبتیں۔“ سبھی نے دکھ سے ناک بھویں
چڑھائی۔ ”اپنے ہمارے ہمارے بیروں میں
ہیش جوتے ہی نظر آ سکتے ہیں۔ بھتیجیاں بیروں میں
لہاں بندھن باندھ سکتی ہیں۔“ اس نے اس قدر
آزردگی سے کہا کہ عالیہ اور ندا نے تاند میں زور
سے سر ہلایا جب کہ ہیسل اپنے پاؤں کو ٹکٹکے لگی جو کسی
بندھن کی زد میں تھے۔

وہ اب ان معصوموں کو کیا بتاتی کہ سنگ دل چچا
لے ہوتے بھی میرے دل میں گلاب گل رہے تھے،

پتے اڑنے لگے تھے۔ وہ انمول دن تھے اس عمر میں
اک ذرا سا مسکرا دینا بھی سونے کے بھاؤ سے کہیں
بڑھ کے مہنگا تھا۔ وہ بس خوابوں کی بادشاہی کی عمر تھی
تب دل ہی رعایا تھا اور دل ہی حاکم تھا، دل ہی قاضی
دل ہی مجرم ہوا تھا۔

☆☆☆

پتا ہی نہیں چلا اور شازمہ کی شادی کے
ہنگاموں میں سردیاں بھی گزر گئیں۔ چند روز بعد
موسم چپکے سے بدل گیا، درختوں نے خشک پتوں سے
نگاہ چرائی اور وہ انا پرست محبوب کی طرح الگ
ہو گئے کہ بہار کی راہ دیکھنے والی نگلی شاخوں کے
گلاب بھی بالآخر کئی کتابوں اور کئی آنکھوں میں بند
ہو کے سر جھکانے کے عذاب سہنے والے تھے کہ
زمانے میں کچھ بھی ٹھہرنے جیسا نہیں تھا۔

”شادی کو ایک ماہ گزر گیا مگر عرفان کی الجھن
رفع نہ ہوئی کہ ابھی ماٹھے پر سونل ڈال کے ہی جواد
سے بات کرتا ہے۔“ آج دادی، تایا اور نعیم چچا کے
پاس دکھڑے رد رہی تھیں۔

”سچ پوچھیں تو مجھے اب بچیوں کی فکر ہو رہی
ہے۔“ تائی نے بھی شوہر کا پرسوج چہرہ دیکھ کے ذرا
سی ہمت کا مظاہرہ کیا، جنہوں نے چہرہ گھما کے بیوی
پر سوالیہ نگاہ ڈالی۔
”کیسی فکر؟“

”بھئی اپنی بھتیجیوں کے لیے جہان بھر کے
آدمی ری جیکٹ کر سکتا ہے، جانے کون فرشتے اس
کے معیار پر پورا اتر سکتے ہیں۔“ مسز نعیم نے بھی
اداسی سے ہاتھ جھلایا تو تایا اور چچا ایک بیک مسکرا
دیے۔

”یہ اس کی محبت ہے مگر معاشرے کے بدلتے
رنگ دیکھ کے وہ کچھ زیادہ ہی گھبرایا ہوا ہے ڈونٹ
وری۔“ انہوں نے بیویوں کے دھموں کو اک
مسکراہٹ سے جھٹلایا تھا۔

”معاشرے پر خاک ڈالو۔ یہ نہیں سوچتا،

سارہ بھی تو کسی کی نازوں پلٹی پچی ہے جو اس سنگ کے ساتھ سر پھوڑ رہی ہے۔ "دادی کو تو اسی کے شوہر کی بے عزتی مانو خون رلا رہی تھی اور سچ اگوار ہی تھی کہ پوتیاں سن کے اشک کرائیں۔"

"اماں آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، ہم سب اسے سمجھائیں گے۔" تایا نے ماں کا ہاتھ نرمی سے تھاما پھر بیوی کو سنجیدگی سے دیکھا، وقت سے پہلے یہ قصہ چھیڑنے کا کیا فائدہ۔

"وہ بعد کی بات ہے سو دیکھا جائے گا۔" تائی اور چچی نے تنقید کے ایک ساتھ پہلو بد لے تھے۔

بعد کی بات پر صبحی اہسل اور ندامت نہال ہی ہو گئیں جو دادی کے کمرے کے قریب چھپی تمام گفتگو سن رہی تھیں۔

"ہو سکتا ہے اسی دوران کوئی کام کا بندہ ہم سے بھی ٹکرا جائے۔" عالیہ کے ارمانوں پر ایک ساتھ اوس، بارش اور پھر تک پڑ چکے تھے کہ وہ بعد تو اب سالوں بعد ہی آئے گا۔

"دل چھوٹا مت کرو، معجزے بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

باقیوں نے اسے دلاسوں سے نوازا، مگر ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ کتابوں میں دل نہ لگانے والی عالیہ کا دل کہیں بھی نہیں لگا ہوا تھا۔ اسے بس بڑی چھوٹی تمام نصابی کتابوں سے چھٹکارا چاہیے تھا بھلے کسی حسابی ساس کے ہتھے چڑھنا قبول تھا۔

انہیں یاد تھا کہ ایک بار بچپن میں تو خیر نہیں لڑکپن میں جب عالیہ کی عمر دس سال تو ہو گئی تھی تاہم حسن نے ان چاروں کو پاس بٹھا کر ان کی فوج پلاننگ کی بابت پوچھا تھا۔

"میں ڈاکٹر بنوں گی۔" صبحی نے جھٹ سے جواب دیا۔

"شاباش۔" تایا نے ہزار کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھا۔

"اور میں پروفیسر میڈم۔" دوسرا جواب اہسل

کی طرف سے آیا تو اسے بھی انعام ملا۔
"اور میں بڑی ہو کے دلہن بنوں گی۔"
"ہیں..... ارے۔" دادی مسکرائیں جب کہ تایا شپٹائے تھے اور گود میں چڑھی عالیہ کو ہلکا سا گھورا۔

"اور دیکھا کریں مارنیک شوز۔" عرفان چچا نے بھابیوں پر عصبیلی نگاہ ڈالی تھی۔

"یہ بھی اچھا ہے بھئی، اب صرف مارنیک شوز میں ہی تو وہ نہیں بنیں۔"

چچا کی غیرت ہر بات پر جاگ اٹھتی تھی بلکہ جاگنا کیسا ان کی غیرت بھی سوئی ہی نہیں تھی لہذا عالیہ بیگم اس قدر مستقل مزاج کہ آج تک اپنے شوق پر ڈٹی ہوئی تھیں۔ یہ بھی جانتی تھیں کہ صبحی کے ڈاکٹر بننے تک باقیوں کی انگلی میں چھلانگ نہیں آئے گا۔

☆ ☆ ☆
"اماں! آپ جانتی ہیں کہ نوید صاحب کا اپنی بہن کے ساتھ کورٹ میں کوئی کیس وغیرہ چل رہا ہے۔"

تو قیر نے رات میں کھانے کے دوران ماں سے سرسری سا پوچھا تو اہسل سمیت سب ہی متوجہ ہوئے۔

"ہاں..... مجھ سے شانزہ نے ذکر کیا تھا۔" دادی نے نظر جھکائے ہی مختصر سا جواب دیا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، نوید تو اکلوتا تھا۔" محسن نے کھانے سے ہاتھ روک کر بغور ماں کو دیکھا جیسے وہ کچھ بھی بتانے میں متامل تھیں۔

"شانزہ کے شوہر نے پہلی شادی کے چند سالوں بعد ہی دوسری شادی کر لی تھی جس کا علم انہیں اس نامراد کی وفات سے چند دن پہلے ہوا تھا کہ باپ نہ صرف دوسرا بیاہ کر چکا تھا بلکہ نوید کو ایک سوتیلی بہن کا تحفہ بھی دے چکا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں اس نے وصیت نامہ بھی تیار کروا لیا تھا جس کے مطابق وہ بیٹی کو شرعی حصہ دے کر باقی کا تمام بینک

بیلنس اور بزنس نوید کے نام کر چکا تھا پھر مجاہد صاحب کی وفات کے بعد، وکیل صاحب وصیت نامہ منظر عام پر بھی لے آئے تھے مگر وہ اس وصیت نامے کو ماننے سے انکاری ہے اس لئے صرف ان پر اپنے حصے کا کیس دائر کر دیا بلکہ اپنی بیٹی کے حوالے سے بھی ان پر خوب الزامات لگائے کہ حزام اسے اپنے چکر میں پھنسا کر جائیداد کا کیس ختم کروانا چاہتا ہے۔ نوید نے اس سے صلح کی کافی کوشش کی مگر بے سود..... کچھ عرصہ بعد نوید کی گاڑی پر حملہ ہوا مگر پیٹرولنگ پولیس کی بروقت آمد سے اس کی جان بچ گئی۔ اس حادثے نے اسے اس قدر خوف زدہ کر دیا کہ وہ کراچی چھوڑنے پر مجبور ہو گیا مگر اپنی اور بچوں کی بقا کی خاطر وہ سوتیلی بہن کا مطالبہ پورا کر کے آیا تھا مگر وہ بد بخت عورت اب بینک میں موجود رقم کی بھی طلب گار ہے جب کہ نوید کا کہنا ہے کہ وہ رقم یہاں کاروبار کی شغلتگ پر خرچ کر چکا ہے۔ یہ کیس اب اسی سلسلے کی کڑی ہو سکتا ہے، یہاں بھی انہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی۔ ابھی چھپلے دنوں بھی حزام کو اس لڑکی کے اغوا میں پھنسانے والی وہ ہی عورت تھی۔

دادی نے جیسے تھک کر ایک بے چین سی سانس بھری تھی کہ کئی پل خاموشی کی نذر ہوئے۔

"تو اصل معاملہ یہ تھا۔" اہسل کے لبوں سے آسودگی بھری سانس خارج ہوئی۔

"ہم تو تصویر کا ایک رخ دیکھ رہے ہیں اب اصل قصہ تو خدا ہی جانتا ہے۔" عرفان چچا کے دل میں وہم اور شبہ نے حسب عادت سر اٹھایا اور وہ استہزاء سا ہو کے مزید گویا ہوئے۔ "اور کوئی یوں ہی کسی کا نام اغوا کے کیس میں نہیں اچھالتا، ایسا کسی تعلق کی بنا پر ہی ہوتا ہے۔" اہسل کے دل نے کچھ دھڑکنیں مرس کی تھیں۔ "اس مادل کے ساتھ حزام صاحب کو جانے کتنے لوگوں نے گھومتے پھرتے دیکھا تھا۔"

"اچھا اچھا..... اب بس کرو، سچ سامنے آ گیا تھا اور بدنام زمانہ لوگوں کے ساتھ گھومنے پھرنے سے واقعی انسان کا اپنا کردار مشتبہ ہو جاتا ہے، اس بات سے تو مجھے کبھی انکار نہیں۔"

دادی نے ایک ہی جملے سے ان کا منہ بند کر دیا تھا کہ اب چچا میاں کے منہ میں جیسے زبان ہی نہیں تھی۔

"اماں! اس طرح کے دشمنی والے لوگوں سے تو تعلقات میں ذرا احتیاط برتنا چاہیے۔"

مسز نعیم نے جیسے وہاں موجود باقی افراد کے دل کی بات کی تھی جن کی پر سوچ سی نگاہیں اس بات سے متفق تھیں۔

"اللہ کسی کو بھی آزمائش کا منہ نہ دکھائے باقی ہم سے ان کے دشمنوں نے کیا لینا دینا۔" دادی اچانک ہی کھانے کی ٹیبل سے اٹھ گئی تھیں تو وہاں موجود سب کی نگاہوں میں بس خاموشی سی تھی، اب وہاں صرف عرفان چچا رغبت سے کھا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆
اہسل آج صبا کے ساتھ پہلی بار مائز کلب آئی تھی کہ آج وہاں ایک آفیشل ڈنر تھا۔ اس بزنس پارٹی میں اس کے ماموں لوگوں کی فیملی انواٹنڈ تھی، یہاں آنے کی ایک وجہ حزام نوید کا ہونا بھی تھا۔ جسے دیکھے شاید مہینوں گزر چکے تھے کہ ان کی ماؤں کے خدشات کے پیش نظر دادی انہیں نوید والا لے جانا چھوڑ چکی تھیں۔ اہسل کو لگ رہا تھا کہ وہ کسی فیشن شو میں آئی ہے مائز کلب جیسے ایلٹ کلاس کا ہی تھا، کافی تلاش کے بعد اس نے حزام کو دیکھ لیا تھا وہ لڑکیوں لڑکے کے ایک گروپ میں کھڑا سب سے نمایاں تھا۔

اہسل کے دل میں کھد بدی ہوئی، بھلے وہ لڑکی حزام کی بات انہماک سے سن رہی تھی، اہسل کی بلا سے مگر وہ ہر جا کی اس لڑکی سے اس قدر مکن سا ہو کے کیا بات کر رہا تھا، اہسل کا دل ٹھنڈا نہ ہوا۔

”تمہارا کزن جس قدر شان دار ہے اتنا ہی قدرتی بھی ہے۔“ صبا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کس قدر دل دکھانے والی بات کی تھی، وہ ذرا سنبھل کی سیدھی ہوئی۔

”ہائے.....“ دل کیا خوب دکھ رہا تھا، اس نے بہار کے اس آوارہ لمحے کو کوسا۔ کیسا دشمن لمحہ تھا، اس نے کراہ کے پہلو بدلا اور بے ارادہ اس پر دوبارہ نگاہ ڈالی۔

اس پل حزام نے بھی اسے دیکھا، وہ ششدر ہوا، نہ ان ڈھیر ساری لڑکیوں میں گہرا پریشان ہی نظر آیا بلکہ اس کی مسکراتی آنکھوں میں اک پر کیف سا تاثر ابھرا تھا، وہ آنکھیں خوش ہوئی تھیں۔ اسل نے کلس کے نگاہ پھیری، وہ اس کی موجودگی کو وہاں نظر انداز بھی نہیں کر پائی تھی۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ کھانے کے نام پر بس سلا د میں ہی چھپ چلائی رہی۔

”کوئی اکیس لڑکیوں کو تو اس نے ضرور ہی کمپنی دی ہوگی مگر موصوف سے اتنا نہیں ہوسکا کہ ذرا دیر کو اپنی کزن سے بھی ہیلو ہائے کر لیتا۔“ یہ صبا کا تبصرہ تھا جو اس نے بھیکے دل اور نرم آنکھوں کے ساتھ سنا بلکہ سہا بھی، بسا اوقات اک چھوٹا سا جملہ تکلیف کی صورت میں سہا جاتا ہے۔

اب وہ دونوں ریسپشن کی طرف جارہی تھیں، الوداعی کلمات ادا ہو رہے تھے۔ کہیں دوبارہ ملنے کے پروگرام طے کیے جا رہے تھے۔

”اکیس نہیں، صبا تم نے چار کم بتائی ہیں۔“ اس کا ترش لہجہ تلملاہٹ کا شکار تھا۔

”کیا واقعی..... اسل تم نے لڑکیاں گنیں؟“ صبا حیرت کے ساتھ ہنسی بھی لہی اور ایک جانب اشارہ کرتی اسی سمت بڑھ گئی مگر وہ بنار کے ناک کی سیدھ میں چلنے لگی۔

”آج کی شام ہی خراب تھی۔“ اس نے خود کو باور کرایا۔

”آج کی شام شان دار تھی۔“ دل نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ وہ اب ریسپشن پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ اس سمیت بہت سے لوگ پارکنگ ایریا میں تھے کہ شاید وہ اچانک بھیڑ سے نمودار ہوا اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔

”تمہاری جمع تفریق سے علم ہوا کہ تمہارا میٹھ بہترین ہوگا۔“ ان الفاظ میں مسکراہٹ کی آمیزش تھی (تو کیا یہ آس پاس تھا) وہ ذرا سار کی مگر چہرہ موڑ کے اسے بالکل بالکل بھی نہیں دیکھا ہر جا کی۔

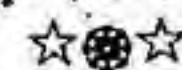
وہ مارچ کی ایک پر کیف رات تھی، آسمان پر بہار کا چاند غنودگی سی بانٹ رہا تھا۔ اسل ذرا پرے ہوئی، اس نے اک کمنی ہوئی سی آہ بھری کہ پہلو میں چلنے والا شخص جنگل جنگل چھونے جیسی ہوا تھا۔

”ہم کہیں بھی ہوتے ہوئے جس کے ساتھ ہوتے ہیں، دراصل ہم اسی کے ہوتے ہیں۔“ وہ ایک بے حد مدہم سی سرگوشی تھی، جمادینے جیسی۔ وہ پہلو چھوڑ کے یکا یک سامنے آ گیا کہ وہ دم بخود رہ گئی۔ اس دھندلی سی روشنی میں بھی وہ اس لڑکی کے چہرے پر خفگی کا رنگ دیکھ سکتا تھا، اس نے اک ٹھنڈا سا سانس بھرا۔

”یہ سچ ہے کہ اکیس نہیں مجھ سے پیچیں لڑکیوں نے لگے کیا کہ حزام نوید آج تم کہاں ہو؟“

وہ بہار کے چاند کی پوری غنودگی لہجے میں سمیٹ کے لب کشا ہوا تھا، سینے پر ہاتھ باندھے مسکراتا ہوا وہ شخص کیا تھا جو اس کا ملال لمحوں میں دھو دیتا تھا، اسل نے اسے پھر ائی نگاہ سے دیکھا۔

چند لمحے یوں ہی سرک گئے، حزام نے اس کے ہوا میں اڑتے بالوں کو ذرا سا چھونا چاہا، اک ذرا فاصلے پر مٹھی بند کرتا وہ سامنے سے ہٹا اور پھر سے بھیڑ کا حصہ بن چکا تھا۔ اسل نے مڑ کے اسے دیکھنا چاہا تھا مگر نگاہ ایک سمت سے آتی ممائی اور صبا پر پڑی۔ وہ شخص جانے کہاں گم ہو چکا تھا۔



”بہت زیادہ سوچ بچار بھی انسان کو پریشانی سے دوچار کرتی ہے اگر آپ بھی کسی ایسی ہی صورت حال سے پریشان ہیں تو اس ہفتے اپنے شوہر کے معمولات زندگی سے نہ صرف غفلت برہیے بلکہ ان کی تشریف آوری کے بعد ان کا چہرہ اندھوں کی طرح دیکھیے گا۔“

یہ ہفتہ کیسا رہے گا ندانے پڑھتے ہوئے بلکہ سناتے ہوئے چچی کو دیکھا تو نظر حواس باختہ سی شازمہ پر پڑی جو ندا کی معلومات پر ایک دم سیدھی ہوئی تھی چونکہ وہ بھی اسکا رپیو تھی اور ان باتوں پر قدرے یقین بھی رکھتی تھی۔

”ندانی بی! یہ ہمیں کیا سنا دیا ہے کہ یہاں موجود دو خواتین کے دل میں سچے سے چلنے لگے ہیں۔“ سارہ جوان کو چائے سرد کر رہی تھی نے لوازمات سے بھری ٹرالی ذرا پیچھے دھکیلی۔

”آپ تو پچھلے کئی سالوں سے شیر کی کچھار میں ہیں، تڑپنا آپ کا حق ہے مگر اس بے چاری چند ماہ کی دہن کو دیکھو۔ اس کا تو دل لہک کے دھڑکنا چاہیے تھا۔“ صبوحی نے مولیٰ سی کتاب بند کرتے ہوئے شازمہ سے پوچھا۔ جس نے ڈربے میں بند ہوئی مرغی کی طرح ان بے فکر لڑکیوں کو حسرت و یاس میں گھر کے دیکھا، سوائے اسل کے جو تمام رات ہی مارا کلب کے پارکنگ ایریا میں گزرنے کے بعد شاہ اہمی تک ہی بیٹھی تھی مگر نہیں اب تو وہ شاعری قلم کے قلم میں تھی ہاتھوں سے کیپوٹر اڑاتی، ”صدائوں اپنے پیار کی“

وہ گول مول کھوتے ہوئے دیواروں اور چھتوں پر مزین شیشوں کے پوکور ٹکڑوں میں سے اپنے بندھن میں بندھے پاؤں دیکھتی تو کبھی بالوں کی جانب بڑھتی اک سرکس سے ہاتھ کی کسی پور کو اٹھاتا اور پھر سمنٹا دیکھتی۔

”کوئی خواب ہے یا سراپ ہے۔“ کسی نے اس آوارہ سی لٹ کونہ چھوتے ہوئے بھی جیسے چھو لیا

تھا۔ جواب میں شازمہ نے ایک لمحہ سوچا۔ ”اللہ ان تمام لڑکیوں کو ہدایت دے۔“ شادی شدہ مردوں کا پیچھا۔ ”نہیں ہمارے شازمہ کا لہجہ بھرا گیا۔“

”یعنی کہ..... جو اب بھی.....“ سارہ کی آنکھیں باہر کو آئیں۔

”تو اور کیا، پتا نہیں آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔“ شازمہ نے اب سب پر معصومانہ نگاہ ڈالی۔

”لو دیکھو بھلا..... اپنے شوہروں کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال لیا ہے اور لڑکیوں کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔“ صبوحی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”کیا شادی شدہ، کیا کنوارے خدا ان مردوں کو سدھارے۔“ شازمہ نے ہاتھ دعا یہ انداز میں اٹھا کے آئین کہا۔

”خبردار جو آئندہ یہ دعا مانگی ہو تو۔“ ندانے اس کے جڑے ہاتھوں کو دھب لگا کے پھوڑا۔ ”خیر سے اب ہماری امیئر چلانے کی عمر ہے اور اب یہ لگی ہیں مرد سدھارنے۔“ ندا کی گھوریاں خاصی جارحانہ تھیں۔

”ہاں بالکل، ان چند برسوں میں کوئی ماں، بہن، بیٹی، بہو، مردوں کو ٹیکل ڈالنے کا ذرا سوچ کے تو دکھائے۔“ عالیہ نے بھی ساکت و جامد بیٹھی سارہ اور شازمہ کو ہاتھ اٹھا کے متنبہ کیا غضب خدا کا۔

اس کی بڑ پڑا ہٹ دم توڑ گئی کہ سکتہ ٹوٹنے پر ان کے ہاتھ جو لگا تھا ان پر وہی برسایا گیا۔

”آج دن چھڑھیا تیرے رنگ ورگا۔“ اسل آنکھیں موند کے گنگنائی، ساتھ ہی شاعری قلعے میں قلا نہیں بھرتی دیوان خاص کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”یہ کس کی ماں بہنیں مردوں کو ٹیکل ڈالنے کا سوچ رہی ہیں؟“ یہ بھاری آواز تو پچھا کی ہے، اسل کا پاؤں دیوان خاص کی سیڑھیوں پر پھسلا تو

پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ جانے وہ اس کے رنگ جیسا دن کہاں چھپا تھا کہ اطراف میں گہری شام تھی، سارہ چچی نے شوہر کی کشادہ پیشانی کے بل یوں محبت سے گئے جیسے آسمان پر اڑتی رنگ برنگی پتنگوں کو بھی کوئی کیا گنتا ہوگا۔

”اف ایسی بیویاں ہی مردوں کو سر چڑھاتی ہیں۔“ وہ چاروں بچہ و تاب کھا کے رہ گئیں، چچا ایک کروڑ کے ساتھ بیوی کے پہلو میں بیٹھے، جن کے چہرے پر پوچھا گیا سوال قائم تھا۔

”یوں ہی ادھر ادھر کے مردوں پر تبصرہ ہو رہا ہے۔“ چچی نے جیسے بات ختم کی۔

”لاحول ولا قوۃ..... اس بات کا تمہیں ذرا خیال نہیں کہ غیر مردوں کا ذکر گھروں میں وہ بھی لڑکیوں کے سامنے.....“ چچا کی جاگی ہوئی غیرت جیسے گلے پڑی۔ سارہ کے ہاتھوں سے کپ کرتے کرتے بچا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ کپ رکھنے کے بہانے کچھ آگے کوچکی اور ان معصوم لڑکیوں کو خوں خواری سے گھورا جو اس بل چھپ چھپا کے ہنس رہی تھیں۔

”نہ فلموں ڈراموں کی..... نہ گیتوں غزلوں کی، نہ پرندوں سندیوں کی..... تو پھر صاف کہیں ناں کہ میں لڑکیوں سے ہاتھوں، خچروں اور گھوڑوں کی باتیں کیا کروں۔“ وہ کڑوے لہجے میں جیسے پھر کے بولی تھی۔

”اس میں ہرج کیا ہے۔“ انہوں نے بیوی کا پہلو چھوڑتے ہوئے کچھ یوں سکون سے کہا کہ وہ بل کھا کے کھڑی ہوئی۔

”پرائے مردوں کو گولی مارو (ہائیں) ان سب کے دل کو کچھ ہوا) میں اپنے مرد کی بات کر لیتی ہوں۔“ چچی نے مسکرا کر پیٹرا بدلا اور چچا کے چہرے سے اطمینان رخصت ہوا۔ لڑکیوں کے دل دھڑکے (کسی کی یاد میں نہیں) بلکہ اس بحث کے

انجام پر۔

”اچھا، چھوڑیں بھی ماموں! ہم تو جواد کی بات کر رہے تھے۔“

”لو جی.....“ شازمہ نے ایک طرح سے اوکھلی میں سردے دیا تھا۔ وہ اچانک ہی پلٹ کے بھانجی سے مخاطب ہوئے۔

”ہونہہ..... اسے بھی مردوں میں شمار کیا جاتا ہے؟“

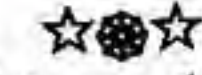
”ہیں.....“ ان سب سب کی سٹی گم ہوئی، شازمہ کے ہاتھوں کے الگ توتے اڑے۔

”اس دن آپا کے گھر میں چوہا مار کے خوش ہو رہا تھا، الو کا پٹھا۔“ وہ فوں فوں کرتے یہ جاہد جا۔

”یعنی اس کا شمار الوؤں کی نسل میں ہوتا تھا۔“ انہوں نے شازمہ کو ہمدردی سے دیکھا۔

”شوہر سے کہو انسان کا بچہ کہلانا ہے تو دو چار بندوں کو پھڑکانا ہوگا۔“ اب ان کی کھی کھی شروع ہو چکی تھی۔

”اور اگر زیادہ ہی بہادری کا شوق ہو تو چچا کو ایک جھانپڑ مطلب..... شیر کے شکار کے برابر ہی سمجھو۔“ اب آگے ندا اور عالیہ پیچھے ہانپتی ہوئی شازمہ تھی۔



”مان لیتے ہیں کہ جتنا بے اسل کے دم سے یہ گھر کچھ ادبی قسم کا محسوس ہوتا ہے مگر یہ شاعروں، ادیبوں کی طرح بے زاری اوڑھ کے گوشہ نشینی کا کیا مطلب ہوا؟“

آج سارہ نے اسے گھیر کے اداسی کا سبب جاننا چاہا تھا کہ ان کے درمیان دوستانہ بھی خوب تھا، جب چچا کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جاتے تو اس رات اس کا ٹھکانہ سارہ آپا کا بیڈروم ہوتا، وہ ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ کیا کہتی کہنے کو چند باتیں تھیں، کبھی خود بھی اس گفتگو کی بازگشت میں اترتی تو چند لمحوں بعد ہاتھ جھاڑتی اس گھما سے نکل آتی تھی اور کبھی فرصت

میں لفظ گنتے بیٹھتی پھر معنی، پھر مفہوم پھر نثر وہ گفتگو کی داستانوں اور کئی کتابوں میں سمیٹنے میں بھی نہیں آتی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ سارہ نے اسے بغور دیکھا جیسے وہ کسی الجھن میں تھی۔

”یوں ہی اس دن میں نے شازمہ کی بات سنی تو اب تک حیران ہوں کہ عورتیں اور مرد کس روش پر چل نکلے ہیں، اب دیکھیں نا بیوی کے ساتھ ہوتے ہوئے اس کا شوہر رات بھر پرانی عورتوں سے چیٹ کرتا ہے، ویسے آپا! مرد اس قدر تنوع پسند کیوں؟“

اس کی نگاہوں نے مائز اکلب کا منظر یاد کیا تو یاد کی کوئی نوک سی دل میں چھپی۔

”کیونکہ وہ خود کو کمزور تصور نہیں کرتا، مرد فطرتاً حاکمیت پسند ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہمیں عورتوں پر فوقیت اللہ کی جانب سے عطا کی گئی ہے اور ہمارے معاشرے اور مذہب میں مرد اس فوقیت کا غلط مطلب اخذ کر چکا ہے۔ اسلام نے مرد اور عورت دونوں کے لیے حد بندیاں مقرر کی ہیں اور مرد وہ حد بندی کس شان سے پھیلا نکلتا ہے کہ مرد کا کیا ہے صاف اور پاک پانی اسے اپنے تئیں پاک کر دیتا ہے۔ اسلام کا نہیں مگر معاشرتی اصول یہ ہی ہے بے اسل کہ وہ پاک ہو جاتا ہے لیکن عورت کو اس حد بندی سے عشق ہوتا تھا اللہ کی مقرر کردہ حدود ہی اس کی اصل عبادت ہے وہ جان اور سمجھ لے کہ وہ حد پھیلا گئے والی عورتوں کے لیے زمانہ قدیم سے لے کر آج تک زمین سے وہ پانی نہیں پھوٹا جو اسے پاک کر سکتا ہو، لہذا میری جان یہ نا انصافی قیامت تک چلنے کا امکان ہے۔ عرفان میں مجھے سب سے بڑی خوبی یہ نظر آتی تھی کہ گھر کی عورتوں کے لیے وہ کس قدر حساس ہیں بھلا عورت کی عزت و ادب اس سے بڑھ کے بھی کوئی کیا کرتا ہوگا۔“ وہ اپنی بیٹی کو ہلکے ہاتھ سے پکیتی جانے کہاں دیکھ رہی تھی۔

”مگر افسوس کہ ہر مرد اپنے ہی گھر کی حدود میں زم زم کا چشمہ پھوٹا دیکھنا چاہتا ہے دنیا کی باقی عورتیں اس کے لیے شغل تماشا ہیں۔“

بے اسل جیسے گونگے دل کے ساتھ یہ سب سن رہی تھی، کوئی شور نہ دھڑکن۔

”میں سمجھتی تھی کہ اس قدر خشک مزاج سا بندہ زمانے کی دل داریوں کے قریب بھی کہاں بھٹکا ہوگا۔“ سارہ ملال سے مسکرائی تھی۔

”تو کیا آپ کی محبت یک طرفہ تھی؟“ بے اسل نے بے قراری سے پوچھا تو سارہ چونکی اور اگلے ہی لمحے وہ کھٹکھٹلا کے ہنس دی۔

”تمہارا چچا اگر ہزاروں افیئر چلا سکتا ہے تو کیا ایک محبت نہیں کر سکتا تھا اور میرے خیال میں ہر مرد ایک محبت تو ضرور ہی کرتا ہوگا۔“ سارہ کے چہرے پر جیسے کئی جگنو سے ٹمٹما اٹھے تھے کہ جنہیں دیکھ کے بے اسل کے چہرے کا رنگ فوری اڑا۔

”اور باقی تمام افیئر..... تو آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے پڑمردگی سے دریافت کیا تو سارہ کی ٹھنڈے سانس میں کسی سچ کی سی پیش سی چمکی۔

”اللہ پر دین شاکر کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے جو ہم جیسی عورتوں کا بھلا کرتے ہوئے کیا غضب کا لکھ گئی کہ وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا، مگر شعر سننے کے بعد بے اسل کے دل کی جوت یک نخت بجھی تھی۔

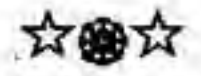
”شادی کے بعد بیوی کو امامہ ہاشم جتنا اعلا ظرف ہونا پڑتا ہے مائی ڈیر!“ سارہ نے مسکراتے ہوئے اس کا رخسار تپتہ پایا اور خود پہلی جمائی کو منہ پر ہاتھ رکھ کے روکا مگر بے اسل نا سمجھی کی عالم میں اسے سمجھنے جا رہی تھی۔

”ارے میری گڑیا! ذرا سوچو، پاکستان کی آدمی لڑکیاں سالار سکندر کی محبت میں گرفتار ہوں گی۔“ سارہ اس کی متحیر آنکھوں میں جھانک کے پھر

سے کھلکھلائی تو ہسل مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔

”مگر سالار تو صرف امامہ کو چاہتا تھا۔“ اس سے عورت کی یہ اعلاظری کسی طور ہضم نہیں ہو رہی تھی اور مرد کا ہر جانی پن کی کنکر کی مانند ہی آنکھ میں چھ رہا تھا کہ جسے وہ چاہتی تھی وہ بھی اسی روش پر چل رہا تھا۔

”امامہ ہاشم سے پہلے سالار کی زندگی میں بھی کئی آئیں اور کئی.....“ سارہ نے ہاتھ کا جھازینا کے فضا میں اڑایا تو وہ بھی بے دلی سے مسکرا دی تھی کہ سارہ کے جواب نے اسے واقعی لا جواب کر دیا تھا۔ فی الحال اس نے بھی سوچوں کا سراہلکے سے جھٹک دیا تھا۔



”میں نے کہا تھا نا کہ آج کل دادی کے ستارے گردش میں ہیں۔“ عالیہ نے اخبار سے نظریں اٹھاتے ہوئے ہسل کو تافخرانہ نگاہوں سے دیکھا جو جلدی میں اپنے شوز کے اسٹریپس بند کر رہی تھی۔

”اب دیکھو کل شازمہ کے شوہر کے جھگڑے کی خبر، دو دن پہلے شازمہ کی بہو کا چچا فوت ہو گیا تو دو بری خبریں..... اوپر سے غیر شادی شدہ افراد کی من پسند شادی کے اسباب پیدا ہونے کا بھی امکان ہے تو دادی کی ایک عدد پونی کی دوائی کی جاں گسل خبر، اف.....“ وہ خود ہی شرمائی، ہسل نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے گھورا۔

”یار قسم لے لو ان کا اشاریہ ہی بتا رہا ہے۔“ اس نے اگلا صفحہ کھولا، ہسل نے پاس پڑا دوپٹا اٹھا کے شانوں پر پھیلایا۔

”عالیہ تم آج یوں کرو دو نفل پڑھ کے دادی کے لیے خیر کی دعا مانگو۔“

”لو اور سنو..... ہر جگہ ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار تم ہو اور نفل میں پڑھو۔“ عالیہ نے منہ بسور کے اسے دیکھا۔

وہ اسے یوں ہی جلتا بھنٹا چھوڑ کے نیچے چلی آئی، جہاں دادی اس کی منتظر تھیں کہ آج گھر کی بہوؤں کی تقریب ولیمہ میں گئی ہوئی تھیں، جب گھڑی نے چار بجائے تو شازمہ کی بہو سے دادی اظہار تعزیت کر رہی تھیں۔ اپنی خواہش کی ماری ہسل کو اپنی ماما کے لاکھ منع کرنے کے باوجود دادی کے ساتھ اور بھی بہت سی جگہوں پر جانا پڑتا تھا، بھلا یہ حزام کہاں جانتا ہوگا اور جونی الوقت ان کے سامنے براجمان ہسل کی تعریف کی صورت وہ تمام حقیقتیں مسکراتے ہوئے سن رہا تھا اور ہسل کی ان خدمات کی صورت دادی کا پر تشکر لہجہ، ہسل کو خفت میں مبتلا کر رہا تھا کہ ہسل نے دادی کے ساتھ اس ماہ پوری پانچ فونٹکیاں اینڈ کی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی چھ تیار دریاں، تین عقیقے اور..... یعنی کہ مہینوں بعد اس کے گھر کا ایک چکر اس لڑکی کو کس قدر مہنگا پڑتا تھا۔

”حالانکہ اس کی ماں کو کہاں اچھا لگتا تھا مگر مجال ہے اپنی پڑھائی کی مصروفیت کے باوجود میری اس پونی نے بھی میرا کہا نا لا ہو۔“

”ماشاء اللہ.....“ حزام کی دادی نے بھی ہسل کو تو صغنی نگاہوں سے دیکھا، ہسل کا دل شرمندگی سے ڈوب رہا تھا۔ ”اف دادی کچھ تو چھپا لیتیں۔“

وہ جاتی اپریل کا قدرے خوش گوار دن تھا، اپنی ماں کے ساتھ گپ شپ کرتے حزام کو اس نے بغور دیکھا جس نے ان آنکھوں کی چوری فوراً پکڑ لی تھی، تمہارا تو آج پارٹی بیچ تھا۔“ افشاں نے یاد آنے پر جیسے بیٹے کو بھی یاد دہانی کرائی۔

”ہاں تھا تو..... بس کینسل ہی سمجھیں۔“ وہ کندھوں کو جھٹکتا دھیرے مسکرایا تھا۔ اس دن ہسل کی شرمندہ نگاہوں نے سوائے حزام کے ڈرائنگ روم کی ہر چیز کو ازبر کیا تھا اور اس دن کسی سے بھی بات کرتے وہ صرف اسی کو ہی دیکھتا رہا تھا۔ اس دن

حزام نے اپنے سیل فون پر بے شمار کالز کائی تھیں۔ وہ جی جی میں گڑھتی رہی اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا رہا۔

بڑوس میں سے چند خواتین بھی افشاں سے اظہار افسوس کے لیے آئیں تو وہ ان سے معذرت کرتی اٹھ گئیں۔ کچھ دیر بعد دادی اور شازمہ خاتون بھی اٹھ گئیں۔ چند منٹ قبل ہسل نے پانی ڈالنے کے بہانے نشست چھوڑی تھی اور پھر اس جگہ کا انتخاب کیا، جہاں اسے دیکھنے کے لیے حزام کو چہرہ موڑنا پڑتا، ہسل کی اس حرکت پر اس کے چہرے پر محظوظ سا تاثر ابھرا تھا۔ اب وہ دونوں وہاں اکیلے تھے، ملازم نے ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے جھانکا۔

”صاحب آپ کا فون پاورڈ آف ہے کہ لینڈ لائن پر کالز آ رہی ہیں۔“

”ریسیور اتار کر رکھ دو عدم!“ اس نے اپنی جگہ چھوڑی اور ایک بار پھر اس کے مقابل آیا، وہ جب پہلی بار نوید ولا آئی تھی تو فرسٹ آر کی اسٹوڈنٹ بھی نہیں تھی وہ تب بھی اتنی نروس نہیں تھی اور اب وہ یونیورسٹی میں تھی۔

بیچ میں پانچ سال گزر چکے تھے اور وہ آج بھی ایک ٹین ایج لڑکی کی طرح کنفیوز سی تھی۔ حزام نے اگلے پل اپنا فون آن کیا کہ کالز کا ایک بے حال کر دینے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے چالیس اور اب پندرہ بھلا کل ملا کے کتنی کالز ہوئیں۔ ایک گہرے توقف کے بعد، وہ سال بھر پہلے کی بات اسے یاد دلاتا حظ اٹھاتا ہوا، مکمل بوجھان کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔

اس نے اپنا سیل فون دوبارہ سے پاورڈ آف کیا، دل اس قدر سہم کے دھڑک رہا تھا کہ وہ اپنی دھڑکنیں سن سکتی تھی۔

”جانے کیوں تمہارے معاملے میں میری یادداشت مجھے بھی اکثر حیران کرتی ہے۔“ جانی بہار

کے دنوں میں وہ شخص اس خفا سی لڑکی کے گرد اپنی خوش رو اور خوابیدہ آنکھوں کے جامد حصار باندھ کے بیٹھا تھا۔

”دیکھو ہسل! تم سامنے تھیں اور میں نے ہر ایک سے اپنے رابطے ختم کر لیے، اپنے واسطے ختم کر لیے۔“ وہ اپنے تمام محسوسات سمیت اپنی ذات کے روابط اس سے باندھ رہا تھا اس با مراد لمحے سے باندھ رہا تھا جسے وصال کہتے ہیں۔ وہ ایک مسکور کن سرگوشی تھی کہ ہسل کا دل ٹھنڈا اور سماعت سن ہوئی ورنہ وہ تو اتنا تو پوچھتی۔

”اور میرے بعد.....؟“ اس نے اپنا سرخ چہرہ لمحہ بھر کو اوپر کیا اور وہ ہی تین حروف آنکھوں میں لکھ کے اسے دیکھا، اس کے چہرے کے گرد ہلکی بھوری سرخی مائل سی چند ٹیس حلقہ آمیز تھیں۔ سامنے بیٹھے شخص نے ان آنکھوں میں تحریر حروف کو فرصت سے پڑھا۔

”بعد میں بس وقت گزرتا ہے۔“ اس نے دھیرے سے محتاط سا ہو کے کہا۔ ”زندگی تو سمجھو اس خواہش میں ہی تمام ہو جاتی ہے۔“ اس نے سیدھے ہاتھ کی پہلی انگلی سے اس کے بالوں کو چہرے سے ذرا دور کرنا چاہا اور پھر نقطہ بھر فاصلے سے مٹھی بند کرتا سامنے سے اٹھ گیا تھا۔

ہسل نے اسے نگاہ اٹھا کے جاتے بھی نہیں دیکھا، جو عجیب تر تھا جس کی نگاہوں سے بندھا حصار اب جانے کون سے اسم سے ٹوٹا تھا۔

”میں اب کسی کی عیادت کروں گی نہ ہی اب قلوں کا کھانا کھاؤں گی نہ ہی بورنگ ویسے اینڈ کروں گی کہ اب نوید ولا..... آنا میری خواہشوں میں نہیں ہوگا۔“

اس نے اپنے تخیل حواس سمیٹتے ہوئے دل میں پکا تہیہ کیا تھا۔

”میں اب خواب دیکھنا اور سراب کا پیچھا کرنا چھوڑ دوں گی۔“ وہ خود سے کیسے کیسے عہد باندھ کے

گھر واپس آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آنے والے دنوں میں عالیہ کا کھانچ ثابت ہوا کہ دادی کے ستارے واقعی گردش میں تھے جن لوگوں کے ساتھ شازمہ کے شوہر کی لڑائی ہوئی تھی، انہوں نے موقع پاتے ہی اسے گولی کا نشانہ بنایا تھا، گولی ٹانگ کی ہڈی میں لگی تھی مگر سب کلمہ شکر ادا کر رہے تھے کہ جان بچ گئی۔ اسی ٹینشن کی وجہ سے گھر میں ماحول کافی سنجیدہ ہو چلا تھا۔

”بھئی اب سب کو منہ کے زاویے درست کرنا چاہئیں۔ مجھ سے اس قدر افسردگی برداشت نہیں ہوتی۔“ ایک ہفتہ اس ماحول میں بمشکل گزارنے کے بعد عالیہ نے وہ گرد پ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس لیے آج وہ سب اپنی جمع شدہ رقم سے عاطف کی دوروز بعد آنے والی برتھ ڈے سلیم ریٹ کرنے کا پروگرام سیٹ کر رہی تھیں جب سارہ دھواں دھواں سا چہرہ لیے اوپر آئی۔

”کیا ہوا؟“ وہ سب ہی اسے اس حال میں دیکھ کے گھبرا گئی تھیں۔

”اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں ان کے ساتھ ہسپتال جا رہی ہوں۔“ وہ اپنے بیڈروم سے چادر اٹھا کر افناں و خیزاں سیڑھیاں اتر گئی تو وہ بھی ایک ساتھ ہی نیچے اتریں۔

”اماں کو اچانک کیا ہوا ہے فائزہ؟“ تایا بھی حواس باختہ سے بیڈروم سے باہر آئے۔

”جو اد تو خیریت سے ہے ناں، کہ آج کل اس کا شمار ہی مریضوں میں ہو رہا تھا، سب خیریت ہے ماشاء اللہ۔ بس عاطف کے منہ سے خبر سنتے ہی ان کا بی پی بہت لو ہو گیا تھا، جیسے بے ہوشی میں چلی گئی ہوں۔“ حالانکہ پریشانی تائی کے چہرے سے بھی ہویدا تھی۔

”مگر عاطف ہے کہاں اور وہ خبر کیا تھی؟“ تایا

جھنجھلائے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

”عاطف ابھی تو یہیں تھا شاید اماں کے ساتھ ہی چلا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ حزام نوید سے کسی لڑکے کا مرڈر ہو گیا ہے۔“ وہاں کئی پل خاموشی چھا گئی۔

”ارے بھئی وہ ہی لڑکا..... اماں کی کزن شازمہ خاتون کا پوتا۔“ تائی نے شوہر کے چہرے کے جامد تاثرات سے یہ ہی اخذ کیا کہ جیسے وہ نام ان کی یادداشت میں نہیں تھا۔

ایسل کا وجود جیسے زندگی کے ہر احساس سمیت خاموش ہوا۔

”معاملہ نوید کی بہن کا تو نہیں؟“ کافی دیر بعد تایا نے پھر سے سوال کیا۔

”ہتا نہیں..... اماں کی حالت ہی ایسی ہو گئی تھی وہ مزید کیا بات کرتا۔“ تائی نے سرسری جواب دیا گو کہ ان کی آواز سے بھی پریشانی واضح تھی۔ مگر کے کچھ افراد تو دادی کے انتظار میں وہیں ٹک گئے تھے مگر ایسل جیسے خود کو گھسیٹتی اپنے کمرے تک لے آئی تھی۔

اس کے اندر اترنے والی خاموشی اس قدر سفاک تھی کہ ہر آتی جاتی سانس پر مٹھی دبا کے بیٹھی تھی کہ آنکھوں سے بہنے والا پانی تک بے آواز اور ٹھہرا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے کچھ دنوں تک جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق، حزام کے بارے میں جانے کیا کیا کہا گیا۔ سننے میں یہ ہی آ رہا تھا کسی لڑکی کا معاملہ تھا، وہ زخمی لڑکی بھی ہاسپٹل آؤں گی۔ بعض کا کہنا تھا کہ حزام سے ملاقات طے کرنے کے بعد اس نے کسی اور آدمی کو بھی بلا لیا تھا۔

سننے میں یہ بھی آ رہا تھا کہ قتل کیس میں حزام کو پھنسانے والی نوید کی سوتیلی بہن ہی ہے۔ جو بھی تھا لیکن وہ ساری خبریں ایسل کو تکلیف دے رہی تھیں۔

دادی کی طبیعت سنبھلی تو گھر کی خواتین نوید ولا سے ہو آئی تھیں۔ نوید اپنے اثر و رسوخ استعمال کر رہے تھے، دوسری طرف حزام کا بیان تھا کہ اس کا اس لڑکی سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ اس قتل میں اس کے کچھ قریبی دوستوں کا ہاتھ تھا، کسی بڑے ہاتھ میں بک چکے تھے اور اس فلیٹ میں اسے سازش کے تحت بلایا گیا تھا۔

شہر کا نامی گرامی وکیل اس کا کیس لڑ رہا تھا، اس کیس کے بارے میں صبا بھی اسے اپ ڈیٹ کرتی تھی کہ اس کی ماما بھی اسی وکیل کے چیمبر میں ہوتی تھیں مگر ابھی تک شواہد حزام کے خلاف جا رہے تھے۔

ایسل کا دل بھی حزام نوید کا وکیل بن چکا تھا اور اس سے ایمان دار وکیل کسی کو کیا ملا ہوگا۔ وہ راتوں کو تنکے بھگوئی، خشک سی ہنسی ہنستی تھی۔ وہ سو بھی جاتی تو محبت جاگتی رہتی تھی، وہ عجب سرکش بلا تھی جسے اس شخص کی بدنامی سے سروکار تھا نہ کردار سے کچھ لینا دینا تھا کہ دل کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ جو بھٹکتے بھٹکتے خوابوں سے سراپوں کے معنی پوچھتا تھا۔

وہ مارچ کی اس سہ پہر میں بھی دو گھنٹی سستا آتا تھا جہاں کسی نے دو گلابوں کی صورت کچی عمر کی اک پھیلی ڈالنا چاہی تھی اور جسے ان تعلق دار آنکھوں نے نوری بوجھ لیا تھا۔ دل ایک پاگل وکیل تھا جو محبت کے نام شہادت کا دھواں پھیر رہا تھا۔

”اتم سامنے نہیں اور میں نے ہر ایک سے واسطے اور رابطے قطع کر لیے۔“

وہ جانی امیریل کے کسی دن کی سرگوشی اٹھاتا۔ وہ کمرہ بند کر کے روتی اور روتی ہی جاتی۔ جو اس معاملے میں ابھی یادداشت کا دعوے دار تھا، جس کے ہاتھ کی ایک انگلی تک بے اختیار نہیں تھی جو اپنی خواہش کو مٹھی میں سمیٹ کر راہ سے ہٹ جاتا تھا، دل اس کا مقدمہ دلیری سے لڑ رہا تھا۔

جو میں جانتی پھڑت ہیں سیاں

میں گھونگھٹا کو آگ لگا دیتی اس نے حزام کے لیے جتنے آنسو بہائے تھے، وہ شمار سے باہر تھے۔ اس نے کتنی دعائیں مانگی تھیں، وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ تمام شواہد اور ثبوت کی روشنی میں بے گناہ ثابت ہوا تھا اور ایک سال جیل کاٹنے کے بعد رہا کر دیا گیا تھا۔ اس کی رہائی کے بعد چند روز الیکٹرانک میڈیا پر مل چل سی پکی تھی پھر بات ختم۔ یہ سب نوید کی بہن کی کارستانی تھی، اب یہ بھی واضح ہو چکا تھا مگر نوید نے سوتیلی بہن کے خلاف کسی بھی قانونی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کی رہائی کا سن کے دادی کے سوا یہاں سے کوئی بھی نہیں گیا تھا مگر نوید ولا سے بھیجی گئی مٹھائی ایسل نے خوب کھائی تھی پھر اس نے سنا کہ انکل نوید نے حزام کو بزنس سمیت انگلینڈ شفٹ کر دیا تھا اور اس کی فیملی بھی کچھ عرصہ کے لیے ساتھ ہی گئی تھی۔ وقت کے ساتھ ہر چیز درست ہو چکی تھی لیکن ایسل کو وہ شخص اب بھی نہیں بھولا تھا، اب تو اس حادثے کو چار سال گزر چکے تھے۔ وہ اس کے بارے میں بے خبر تھی۔

بچ کے وقت میں صبا نے اسے اپنی شادی کی ٹریٹ مائز کلب میں ہی دی تھی اور اس شام ایسل کا دل اس سے بھی چھپ کے روتا رہا تھا۔ پارکنگ ایریا کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے آخری بار ان قدموں کی آہٹ محسوس کی تھی۔ اس شام کے بعد وہ اس کی زندگی میں اس حد تک رہ گیا، جیسے ڈائری میں اپنے ہاتھ سے کسی بہت ہی اپنے وقت سے لکھی کسی نظم کو کبھی سالوں بعد ڈائری ہاتھ لگنے کی صورت پڑھ کے غم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

آج چار سال بعد ان کے ہاں حزام نوید کا رشتہ جس کے لیے آیا تھا، وہ جانتی تھی۔ قصہ اتنی

جلدی کہاں ختم ہوتا ہے۔ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی، نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور آنکھوں میں نمی تھی۔

اب زندگی کو اور اس سے کیا چاہیے تھا، اس نے اپنے دل سے باز پرس کی۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا، بھلے ادھر سے انکار ہو چکا تھا پھر بھی اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ جو اسے یاد رہا۔

اس نے بھی اسے یادداشت میں محفوظ رکھا، دل سہا پھر ٹھہر کے دھڑکا کہ دل اب پہلے سا نہیں تھا۔ اس نے وہ پائل اتار کے پھینک دی تھی جس کی چھم چھم میں بھی وہ شخص ہوا کرتا تھا۔

☆☆☆

اس گھر میں اب بھی چچا سمیت سب کچھ ویسے کا ویسا تھا، اب ان کی دونوں بیٹیاں حمنا اور عمنا دس گیارہ سال کی ہو چکی تھیں۔ چچا کی ربک ٹوک کا انداز ویسا ہی تھا کہ اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی ان کی سوچ کا انداز وہی تھا۔ اس سارے عرصے میں ایسل کا دل اور دادی کے لب بس مطلب کی بات کرتے تھے۔

دادی کو اپنی نواسی کا دکھ بھی اندر ہی اندر گھلارہا تھا کہ جب جوادی ٹانگ ٹھیک ہوگئی تھی تو اس نے اپنا بدلہ لے لیا تھا اور جواد کے ہاتھ سے چلنے والی گولی سے وہ شخص موقع پر ہلاک ہو گیا تھا۔ اب جواد ڈھائی سال سے جیل میں تھا اور شازمہ اپنے بیٹے سمیت اپنی ماں کے گھر رہ رہی تھی۔

عرفان، شازمہ کی خلع چاہتے تھے اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی، جب بھی گھر والے مل بیٹھتے تو گفتگو کا رخ جواد کی جانب مڑ جاتا تھا۔ آج کافی دنوں بعد گھر میں کوئی اور ذکر چھڑا تھا۔ عالیہ کے لیے اس کے ماموں زاد رضا کا رشتہ آیا تھا سو گھر والے مل بیٹھ کے کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔

”اب صبحی کا ہاؤس جاب مکمل ہونے والا ہے تو یہ رشتہ اس کے لیے ایکسپٹ کیوں نہیں کر لیا

جاتا۔“ یہ نایاب اور انوکھا مشورہ عرفان صاحب کا تھا۔

”لیجیے جب رشتہ عالیہ کے لیے آیا ہے تو صبحی بیچ میں کہاں سے آگئی؟“ سارہ نے جواب کے ساتھ انہیں سلگ کے دیکھا تھا۔

”گھر کی بات ہے، کہہ دیں گے پہلے بڑی بیٹی پھر چھوٹی۔“ کیونکہ عرفان چچا کے ذمے سمجھنا تھا، سمجھنا ان کی سرشت میں نہیں تھا۔

”اگر بھائی اور بھابی کا معاملہ ہوتا تو ٹھیک تھا مگر یہ رشتہ رضا کی خواہش پر بھی آیا ہے۔“ تانی نے الفاظ کا مناسب چناؤ کرتے ہوئے کیسے قرینے سے بات کی تھی مگر چچا کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار دکھائی دیے۔

”رضا عالیہ کے لیے اس طرح کے جذبات رکھتا ہے۔“ انہوں نے حاضرین محفل کو شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا کہ تانی بے چاری اوائل مارچ میں ہی پسینہ پسینہ ہو گئیں۔

”بات کرنے کا یہ کون سا انداز ہے؟“ تو قیر کا لہجہ تیز اور ترش تھا۔ ”آئندہ اپنے دوستوں کی زبان وہیں چھوڑ آیا کرو۔“ انہوں نے تیوری چڑھا کے کہا تو عرفان ہلکا سا گڑبڑائے۔

تو قیر اپنی نشست تیزی سے چھوڑ کر اٹھ گئے اور اگلے ہی منٹ عرفان بھی طیش کے عالم میں ہی اٹھے تھے، کتنی ہی دیر ماحول پر سکوت چھایا رہا۔

”اماں! آپ بالکل خاموش ہیں؟“ حسن ماں کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ جواباً پھیکا سا مسکرا دیں۔ وہ کیا بولتیں کہ وہ تو پچھلے چار دنوں سے اداس اور ملول تھیں، اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ شازمہ کو یوں خالی ہاتھ رخصت نہ کرتیں۔

ابھی تو انہوں نے سوال ہی کیا تھا کہ بہوؤں کے چہروں پہ زردیاں کھنڈ گئیں۔ اور انہوں نے کوئی بھی رسم نبھائے بنا معذرت کر لی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی مہلت تو لی ہی جاتی ہے،

شازمہ میری بہن تھی۔“ ان کے جانے کے بعد دادی نے بہوؤں سے ہلکا سا شکوہ کیا تھا۔

”اماں! ان کے پوتے کی شہرت جیسی بھی تھی، یہ آپ کو پتا ہے۔ آپ خود سوچئے، کسی دشمنی کی صورت اس نے جیل کاٹی تھی، اگر کبھی اس کے ذہن میں بدلہ لینے کا خناس سما گیا تو لڑکی سمجھو، شازمہ کی طرح برباد ہی ہوگئی۔ آخر نیک نامی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے اماں! لوگ تو یہیں نہیں گئے کہ ماں، باپ نے صرف دولت دیکھی، بھانجی کا انجام بھی بھلا دیا۔“ ان کا جواز ایسا تھا کہ دادی کے سارے لفظ گونگے ہو گئے۔ آج عالیہ کے رشتے کے سلسلے میں وہ دانستہ خاموش تھیں۔ آج ایسل اور دادی کا حال ایک جیسا ہی تھا۔ لاکھ دامن چھڑانے پر بھی دونوں کے دل میں ایک ہی نام دھڑک رہا تھا۔ ہزار پہرے توڑ کر بھی دونوں کا دھیان ایک ہی راہ پہ دوڑ رہا تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں ڈیپارٹمنٹ کے فنکشن سر پہ تھے اور دور دراز قبل کسی جھگڑے کی بنا پر اسٹوڈنٹ کے دو گروپس کی کشیدگی بھی زوروں پہ ہی تھی۔ آج اسی سلسلے میں پرنسپل صاحب نے ڈیپارٹمنٹس کے پروفیسرز کو کچ آدور میں ایک ریسٹورنٹ میں مدعو کیا تھا۔ ایسل کا مکمل دھیان میٹنگ کی بحث کی طرف تھا کہ اس کے سیل کی ٹیکسٹ ٹون بجی۔

اس نے آہستگی سے فون قریب کر کے میج پڑھا۔ ندا کے کالج میں شام کو فنکشن تھا۔ اس نے اسے جلد گھر آنے کو کہا تھا۔ اس نے فون پیک میں رکھا اور سامنے متوجہ ہوئی، وہ ساکت ہوئی تھی یا بکھر گئی تھی۔ برادر والی میز پہ بیٹھا شخص اسے مکمل دھیان سے دیکھ رہا تھا۔

ایسل نے خود کو لمحوں میں سمیٹا کہ دھیان سے دیکھنے والے نے دیکھا کہ سرسری نظر میں بھی پہچان کا کوئی رنگ نہیں ابھرا تھا کہ ایسل کی نظر کے بھرپور

نے جتا دیا تھا۔

”اب یہاں خواب نہیں اُگتے۔ دیکھ لو تمہاری میز پہ بیٹھے باقی افراد کی طرح ہی میں نے تم یہ اچھتی سی ہی نظر ڈالی، بھلے تم سامنے رہو، بھلے تم چھپ جاؤ۔ اب یہ نگاہیں تمہیں ڈھونڈنا بھول چکی ہیں۔“ مگر جانے کیوں دل کے سونے پن میں اک رستہ سا نظر آیا تھا۔ جس میں وہ اس کے ہم قدم تھا۔ اس کی شخصیت کی سنجیدگی ایسل نے ایک اچھتی سی نظر میں ہی بھانپ لی تھی۔ شاید وہ بھی ان ہی کی طرح ایک آفیشل بیچ پہ جمع تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے پاس بیٹھے افراد اٹھ گئے تھے، اب وہ اکیلارہ گیا تھا۔ ”اسے بھی چلے جانا چاہیے۔“ اس نے سلگ کے سوچا۔ وہ اس کی نگاہ کا ارتکاز محسوس کر سکتی تھی۔ آدھ پون گھنٹے تک ان کی میٹنگ بھی برخاست ہوگئی، اس سارے وقت میں ایسل نے اس پہ دوسری نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ بننے کے اندر دل تباہیاں بچا رہا تھا، یہ وہی شخص ہے جسے دیکھنے کے لیے تم کس قدر خوار ہوتی تھیں، مگر ایسل نے کب کے وہ زمانے کسی کاغذ کی طرح لپیٹ کے ایک بے وجود سمندر کی نذر کر دیے تھے۔

اس ہرجائی کی میز کے پاس سے گزرتے ہوئے دل سے وہ پانی رسنے لگا تھا جو آنکھ میں اتر کے آنسو کھلاتا تھا اور آنکھیں کسی کڑے وقت میں اسی پانی نے خوب دوستانہ نبھایا تھا، مگر آج نہیں۔ آج وہ آنکھوں کے زیر حکم تھی۔ جنہیں اس شخص سے ہزاروں شکوے تھے، وہ سامنے شخصے کی دیوار سے دیکھ سکتی تھی کہ وہ اب اسے چہرہ موڑ کے دیکھ رہا تھا۔ دیکھنے والے کی آنکھوں میں بے قراری اور بے یقینی ہی نہیں تھی، بلکی سی نمی بھی تھی۔ ایسل نے ریسٹورنٹ کا دروازہ دھکیلتے ہوئے ترچھے رخ کے ساتھ مڑتے ہوئے بھی محسوس کیا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ایسل نے آنکھوں کی بادشاہی پہ مٹی ڈالنا چاہی کہ دل اس شخص پہ اک فقیرانہ سی نگاہ

ڈالنے کی منت کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہمارے چچا فلم انڈسٹری میں ہوتے تو پاکستان کے سپرولن ہوتے۔

عالیہ نے ان ارشادات کے ساتھ منہ میں گرم پکوڑا ڈالا کہ دل تو پہلے ہی جل رہا تھا، اب وہ منہ جلنے کے بہانے ایک دو آنسو تو بہا سکتی تھی۔ عالیہ کی اس حرکت پر سارہ کے چہرے پر حیرت اور ہلکی سی لکڑی چھن چکی۔

”ایسے تو مت کرو یا ر..... انکار تو نہیں ہونا، بس صبحی کا رشتہ طے ہونے تک مہلت مانگی گئی ہے۔“ سارہ نے اس کے ہاتھ سے دوسرا گرم پکوڑا جھپٹا۔

”یہ خودکشی کا نیا طریقہ ہے بھی۔“ ندا کے منہ سے پھلجھڑی چھوٹی تھی۔ ”فیس بک پہ لگا دو کہ آج کل دل والے ایسے خودکشی کر رہے ہیں۔“

ندا اب پلیٹ سامنے رکھ چکی تھی۔ ”تمہیں کیا ہوا ہے، بالکل خزاں کا پتا لگ رہی ہو۔“ سارہ نے کم صم سی بیٹھی۔ ”پہلے ہی نگاہ ڈالی، جو عالیہ کے رخسار پہ پھسلے دو آنسوؤں کو حسرت سے دیکھ رہی تھی کہ چھپ کے رونا بھی عذاب تھا۔

وہ عالیہ کے رخسار پہ جیسے محبت کا چہرہ دیکھ رہی تھی، تپا ہوا سنا ہوا، بہتے بہتے پوروں کی بے دردی سے رگڑ سے صاف ہو جانے والا۔ اس نے اک محتاط سی آہ بھری۔

”کچھ نہیں، یوں ہی دھیان سا گزرا کہ ارسل کی آپی دوبارہ کیوں نہیں آئیں۔ (جو سارہ کی دوست تھیں۔)

”لو کیسے آتی بھلا..... تمہارے چچا مجھے گھر بدر نہ کر دیتے۔“

سارہ نے آواز ذرا دھیمی ہی رکھی تھی کہ صبحی نے بروقت انٹری مار کے ان سب پر حیران کن نظر ڈالی تھی اور وہ سب اس بات پر سر پٹتی تھیں کسی کو

آنکھیں اچھی ملتی ہیں، کسی کو ناک، رنگ، بال وغیرہ مگر یہاں معاملہ کچھ یوں تھا کہ صبحی کو کان اچھے ملے تھے۔

”ارسل کی آپی طاہرہ، چچا کی وجہ سے دوبارہ نہیں آئیں اور یہ خبر مجھ سے چھپائی گئی۔“ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم ہی بدلا تھا اور وہ پیر پختی واپس اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

بات کچھ یوں تھی کہ سارہ کی بیسٹ فرینڈ جو کہ اب ابوظہبی میں مقیم تھیں۔ وہ یہاں میکے میں آئی ہوئی تھیں اور تین، چار بار اپنے بھائی کے ساتھ سارہ سے بھی ملنے آتی رہی تھیں۔ اب ابوظہبی جانے سے پہلے وہ بھائی کے لیے صبحی کا رشتہ ڈال کے گئی تھیں اور جیسے سنتے ہی عرفان چچا ہتھ سے اکھڑ گئے تھے۔ ”تمہاری دوست اپنے بھائی کو اسی مقصد کے لیے ساتھ لے کر آتی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی لڑکی اسے پسند آ جائے تو ان بے چاریوں کا بھی بھلا ہو جائے گا۔“

شوہر کی اس بات پر سارہ بے چاری کا منہ جو کھلاتو گھٹنوں کھلا ہی رہا۔

ارسل بھی ڈاکٹر تھا، یعنی وہ اور صبحی تو ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ یعنی پسند بھی کرتے تھے۔

”آئندہ میں تمہاری دوست کے ساتھ اس گھر میں اس کا بھائی نہیں دیکھنا چاہوں گا۔“

اب شوہر کے اس قدر دو ٹوک سے جواب پر وہ اس رشتے کا ذکر گھر میں کیسے کرتیں، لیکن لڑکیاں یہ سارا معاملہ جانتی تھیں۔

طاہرہ کے ابوظہبی جانے کے بعد صبحی نے بھی سارہ سے پوچھ گچھ نہیں کی تھی، حالانکہ ارسل اس سے کئی بار پوچھ چکا تھا۔

اپنے کمرے میں چکر کاٹتی صبحی اس بے ایمان گروپ کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج آرٹ کونسل کے ریڈیڈنٹ ڈائریکٹر نے شاعری قلعے میں جشن بہاراں کی تقریب کا پہلا سلسلہ شروع کیا تو ایسل بھی وہاں فیکٹی کے ہمراہ مدعو تھی۔ غزل نائٹ کا بھی اہتمام تھا تو فنون لطیفہ میں دلچسپی رکھنے والوں کا بھی وہاں جم غفیر تھا۔

وہ وہاں پھولوں کے بے شمار اشائر پہ نگاہ ڈالتی چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ چلتی جا رہی تھی کہ آہستگی سے کوئی اس کے ہمراہ چلنے لگا اور یوں قدم ملا کے کوئی شناسائی راستے تاپ سکتا تھا، اس کا دل اعتدال سے ہٹ کے دھڑکا۔ اس نے نگاہ اٹھائے یا موڑے بنا ساتھ چلتے شخص کے جوتوں کو دیکھا۔ وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہوئی۔ بات ہر طرح سے ختم ہو چکی تھی، پھر وہ ساتھ کیوں چل رہا تھا۔

نگاہ کچھ اوپر اٹھی اور ساتھ چلنے والے کے ہاتھ پر تکی، آج اس کے بال ہوا میں نہیں اڑ رہے تھے کہ کسی کی پور پہ اک بے مہارسی خواہش اڑنی..... کہ اب ایسل کو بال سینے کی عادت ہو چکی تھی۔

وہ اس لمحے اپنے ساتھ اک گنہگار خاموشی گھسیٹے ہوئے اس کے ہمراہ تھا، نہ اپنا حال بتا رہا تھا، نہ اس کا حال پوچھ رہا تھا، جس نے وہاں آ کے ہوا میں اڑائیں بھرتی گلاب، لالہ اور مسکین کی مہک اپنے وجود میں بھرتی تھی کہ سانس لیتے ہوئے ساتھ چلنے والے کے وجود کی خوشبو اس چھوڑی تھی۔

بہار آئی تو جیسے یک بار لوٹ آئے ہیں گھر دم سے وہ خواب سارے شباب سارے دور مہینہ کی نرم آواز نے نظم چھیڑی تھی۔ مگر وہ آواز اس شخص کی تمغیوں سے بھی پھوٹنے لگی تھی۔

وہ روش سنسان نہیں تھی۔ مسلسل کچھ لوگ آ جا رہے تھے۔

جو تیرے ہونٹوں پہ مرے تھے جو مٹ کے ہر بار پھر جیتے تھے

نکھر گئے ہیں گلاب سارے..... کہ ساتھ چلنے والا ایک دم اس کے مقابل ٹھہر چکا تھا۔

لال احوال دوستاں بھی تیرے ہمارے سوال سارے جواب سارے..... بہار آئی تو.....

اس نے اپنے بال کیا سمیٹ لیے تھے، یوں زندگی کے تمام باب ہی سمیٹ چکی تھی۔ ان حساب لیتی آنکھوں کی طرف اس لڑکی کے بھی کئی حساب نکلتے تھے۔

سو اس نے بھی جسارت کی اور اس شخص کی آنکھوں میں اسی کے انداز میں جھانکا۔

بہار آئی تو کھل گئے ہیں نئے سرے سے حساب سارے

ان آنکھوں نے ایک دوسرے کو جتایا تھا کہ ”ہاں اب نئے سرے سے بات ہوگی۔“

کئی پل دھیرے سے سرک گئے کہ ایسل نے اسے بولتے سنا۔

”میں ٹھہر چکا ہوں۔ ختم چکا ہوں۔ ایسے ہی..... اسی طرح۔“

اس کا تپا سا لہجہ انتہائی بوجھل تھا۔ ”ایسا کیوں؟ کہ اتنے سالوں بعد تم نے مجھ پہ اک اجنبی سی نگاہ ڈالی اور تمہاری دوسری نگاہ کے انتظار میں وقت کا نئے میں نے جانا کہ انتظار کیا ہوتا ہے۔ تکلیف کیا ہوتی ہے۔“

وہ مدھم لہجہ کالج کے ٹوٹنے کا سا تھا۔

”اور جب وہ انتظار بھی ختم ہوا تو میں نے جانا کہ میں تو مٹ چکا ہوں۔“

وہ کرب آمیز آواز تھی۔ وہ کیسی بے قرار آنکھیں تھیں، بند توڑنے جیسی..... وہ اب ایسل کی خشک آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بمشکل نگاہ چرائی کہ ان خشک آنکھوں میں وہ لہجہ پانی بننے لگا تھا۔

وہ ذرا سا پیچھے ہوئی۔

”ہمارے درمیان ایسا کچھ بھی نہیں تھا کہ تمہیں راہ میں آ کے مجھ سے حساب لینا پڑتا۔“ وہ پاس سے گزر کے اب آگے بڑھی۔

”کیوں نہیں تھا؟“ وہ دوبارہ اس کے سامنے آیا۔ ”کچھ تھا، کچھ تو ایسا تھا کہ تمہارے ہوتے ہوئے حزام نوید کسی کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ کسی کا بھی نہیں ہوتا تھا۔“

وہ لہجہ بارش کے جیسا تھا۔

”تمہارے ہونے سے وہ دنیا سے یوں ہی تو واسطے ختم نہیں کر لیتا تھا۔“

وہ لہجہ منتشر تھا۔ مضطرب تھا۔ وہ غم ہوتی آنکھوں کے ساتھ بے چین ہوئی۔

”اسے بھی تو سوال کا حق تھا، اسے بھی حساب کرنا آتا تھا۔ اس نے دل کڑا کر کے ایک بار پھر اسے اجنبیوں کی طرح دیکھا۔ اس نے حزام کو اپنی آنکھوں سے محبت اڑا کے دیکھا۔

”تمہاری فیملی جو حد تک بھی تھیں، ایک طرف تھیں۔“

”اف..... کیا وہ گمان تھا۔“ وہ تڑخ کے ٹوٹا..... کیا وہ آواز اسل کی تھی، پھر سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھا۔ اسل نے جی داری سے نگاہ پھیری تھی۔

”محبت کرنا میں نے تم سے سیکھا تھا۔“ جو تیرے ہونٹوں پہ مرے تھے۔“

اس نے جی داری دکھائی تھی۔

اس دن تم میرا حال پوچھنے آئیں تو تمہاری انگلیوں میں دبے گلابوں پہ اور تمہارے چہرے پہ حروف یوں چمک رہے تھے۔ میں نے اس بلبل وہ دو گلاب اور چند حروف چرا کر اپنے دل میں بولے تھے۔

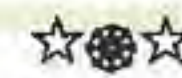
اسل کی آنکھیں پھر تو روح فنا ہوئی۔ ”تب یہاں مٹی اتنی زرخیز تھی۔“

”اس نے ایک ہاتھ اپنے دل پہ رکھا کہ نمونے پاتے پھلتے پھولتے ان حروف نے کہاں، کہاں قبضہ نہیں جمالیا تھا۔ اس شخص نے یہ کیسے وقت میں مارچ کی وہ سرمستی سہ پہر گزرے وقت سے اٹھا کر اس کے راستے میں گاڑ دی تھی۔

وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی، مگر پیچھے تو ہٹ سکتی تھی۔ اک ذمہ سانس اس کے ہونٹوں پہ بکھرا۔

”چلو مان لیتے ہیں کہ محبت کرنا تم نے مجھ سے سیکھا..... چلو اب تم بھی مان لو کہ محبت میں کسی کا پابند نہ ہونا میں نے بھی تم سے سیکھ لیا ہے حزام نوید!“

اس نے اپنی بات پہ اترا کے کہا ادواپسی کی راہ پہ ہوئی۔ جانے وہ وہیں کھڑا تھا یا کسی سمت بڑھ گیا تھا۔



”یہ سب کیا ہو رہا ہے عرفان.....! بددماغی کی بھی کوئی حد ہوتی ہوگی یار!“

توقیر صاحب نے بھائی کو دوستانہ لہجہ اور نرم آواز سے مخاطب کیا کہ کل رات سارہ نے سب کے سامنے اسل کے رشتے کی بابت بتا دیا تھا اور ساتھ ہی وہ سب بھی جو شوہر صاحب نے فرمایا تھا، جب کہ تائی کو بھی عالیہ کے رشتے کے سلسلے میں عرفان سے شکایت تھی، اگر صبح کی بات یہاں بن جاتی تو دو چار ماہ تک دونوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو سکتے تھے۔

”کیسی بددماغی؟“ اس کا لہجہ شکنوں سے پر تھا۔

”ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ دیکھنے دکھانے کے چکروں میں پڑے بنا بیٹیوں کے رشتے اچھے گھرانوں سے آئے ہیں، مبادا کہ ہم ناشکر اپن دکھاتے ہوئے الزام تراشی پہ اتر آئیں۔“

توقیر کی اس بات پہ عرفان نے بیوی کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”اچھا یہ بتاؤ جب ہم لوگ چارہ کا رشتہ مانگنے

چار پہ تھے تو کیا تمہاری رائے کو اہمیت نہیں دی تھی۔“

توقیر صاحب نے انداز نشست بدلا اور لہجہ شہد کو بھی شرما ہا تھا۔

”وہ ایک الگ بات تھی۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے روکھے پن سے بولے۔

”الگ کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ جواب سارہ نے دیا۔

”وہ پرانی بات اور یہ گھر کا معاملہ ہے۔ یہ دوسو سو اور ڈر کا سلسلہ جب ہی ختم ہوگا جب اپنے اور پرانے کے چکر سے ہٹ کر صرف عورت کی عزت کی جائے گی، ورنہ معاف کیجیے گا عرفان صاحب! اپنے گھر کی بہنیں، بیٹیاں بھی فرشتہ نہیں، انسان ہی ہوتی ہیں اور نہ ہی بانی والدین اپنی بیٹیاں کسی کی دلچسپی اور دل پشوری کے لیے پیدا کرتے ہیں۔“

سارہ کا لہجہ آخر میں بھرا گیا تھا۔ عرفان کے چہرے کا رنگ بدلا۔

توقیر صاحب دانستہ گفتگو میں دخل اندازی سے احتراز برت رہے تھے کہ سارہ ان کے پوائنٹ آف ویو سے بات کر رہی تھی، اس لیے جب ان کی اپنی بیوی نے اپنی بھانجی کو آب دیدہ دیکھ کر کچھ کہنا چاہا تو، توقیر نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا تھا۔

”تم سے دل لگی کی نہ دل پشوری۔ تمہیں روکی میں شامل کر لیا کہ تم قابل عزت تھیں۔ باقیوں کی بات نہ کرو۔“

وہ لمحے میں آ رہے وہاں سب کی موجودگی کو اسل کے لیے 2۔

”ہائیں کی بات نہ کرو۔“ یہ جملہ جانے کتنے

مرغان میں ادا کرتے ہوں گے تو وہاں ہمارا شمار بھی ہائیں میں ہی ہوتا ہے۔“

وہ ذرا سا غصا ہو کے ہنسی، یہ تو سیدھا عرفان کی غیرت پہ وار ہوا تھا کہ بیوی نے غصے کوئی

راہ پہ ڈالا۔

”کوئی اس کے گھر کی لڑکیوں کو اپنے دل یا سوچوں میں بسانے کی جرات کیسے کر سکتا ہے۔“ اس نے ایک منٹ میں کئی بار بار پہلو بدلا۔

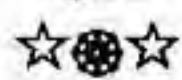
”بیٹیوں کے معاملات میں تمہاری روک ٹوک یا دخل اندازی کو ہم اب بھی تمہارا حق سمجھتے ہیں۔

تمہارے احساسات کی قدر کرتے ہیں، لیکن میرے بھائی اتنی سی بات کو سمجھو..... کچھ معاملے غیرت کا جھنڈا لہرا کے نہیں عقل سے حل کیے جاتے ہیں، جب آنے والے سیدھے راستے سے آئے ہیں تو سمجھو اور سوچو کہ پھر کہیں کوئی چور دروازہ نہیں تھا۔“

توقیر صاف شفاف سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئے۔

اب وہ بھائی کو یہ نہیں سمجھا سکتے تھے کہ ہر خاص و عام چھوٹا بڑا آگن..... بارش، بہار اور ہوا کو راستہ دیتا ہے، ان ہی بدلتی رتوں میں کھلتے گلابوں میں، برستی بوندوں، اڑتے پادلوں اور ادھ کھلی کتابوں میں کہیں محبت بھی نمود پاتی ہے، کہیں کسی کو ذرا سا چھو کے اڑ جاتی ہے، کہیں پڑاؤ ڈالتی ہے، کہیں قیام کر لیتی ہے۔ محبت کے لیے ہر ذی روح نایاب ہوتا ہے، مگر ہر ذی روح کے لیے محبت نایاب نہیں ہوتی اور ایسے لوگ ہی محبت اور برائی کو برابر تو لیتے ہیں۔ کون قابل عزت ہے اور کون ناقابل عزت اس تقسیم کا ذمہ اور اختیار اللہ نے انسان کو کب دیا ہے۔ بس بات اتنی ہے کہ چور دروازوں کے متلاشی لوگوں کو مکافات عمل ڈراتا رہتا ہے، عرفان۔“

توقیر نے اپنے چھوٹے بھائی پہ ایک متاسف اور بے بس سی نگاہ ڈالی، جس کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی مفقود تھی۔



عرفان چچانے اسے بغور دیکھا، اس ہاسپٹل کے ریسپشن کاؤنٹر پہ کاؤنٹر بوائے سے بات چیت کرتی وہ اسل ہی تھی۔ انہوں نے تاؤ کھا کے اسے

دوبارہ دیکھا۔ ان کا ارادہ تو لُج کے لیے گھر جانے کا تھا کہ چند دوستوں نے اس کے آفس آکر اسے یاد دہانی کرائی کہ آج تو انہوں نے ایک ہاسپٹل نزد دوست کی عیادت کو جانا تھا..... مگر اب وہ خود کو کس رہے تھے کہ کاش گھر ہی چلے جاتے۔

انہوں نے صبحی کو دیکھ کے نہ صرف نگاہ چرائی بلکہ سر جھکا کے قریب سے گزرنا چاہا۔۔۔۔۔ وجہ وہی ازلی غیرت۔۔۔۔۔ دوست کیا کہیں گے ان کے گھر کی عورت۔۔۔۔۔ یہاں اکیلی کیسے۔۔۔۔۔ مگر عرفان کی قسمت اچھی نہیں تھی کہ اسی پل اسٹیل کی نگاہ بچا پھ پڑی تھی۔ وہ فوری طور پر نہ صرف ان کی طرف بڑھی ساتھ ہی مخاطب بھی کیا۔

اب عرفان کے ساتھ الی پانچ مردوں نے
گردنیں اسل کی طرف گھمائی تھیں غصے سے بل
کھاتے چچا کو مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔

”تم یہاں کیسے؟“ وہ دبے لہجے میں غرائے۔
ایسل کا حلق خشک ہوا۔

”میری کوئیگ کا گاڑی کی ٹکر لکنے سے بازو
فریکچر ہو گیا تھا تو میں اسے ہسپتال لے آئی ہوں۔
ابھی اس کی فیملی کچھ دیر ہی آئی ہوگی۔“

اس نے بمشکل تفصیل بتائی تھی کہ چچا کے تجو
بھتیجی کو ثابت نکلنے کے تھے۔ باقی کی تمام کارروائی
چچا نے دوستوں کے ساتھ مل کے ہی کی تھی۔ مریضہ
ایڈمٹ ہو چکی تھی اور اس کا آپریشن ہو رہا تھا، جب
اس کی فیملی میں سے اس کا ایک بہنوئی وہاں پہنچا
تھا۔

ان کے وہاں سے رخصت ہونے تک اس مریضہ کو لیگ کا بہنوئی ایک ہی الجھن کا شکار تھا کہ چہرے مہرے سے کھر در نظر آنے والا یہ بندہ اس قدر مہربانی کیسے کر گیا۔ اب اصل معاملہ تو ایسل جانتی تھی یا اللہ جانتا تھا۔

☆●☆
ایسل نے اسے لائبریری کے داخلی دروازے

”اب اس کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا تو یاد
 دلہنایہ ہی ہوگا۔“

”کیا لا پرواہی تھی کہ وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔
 ”پیشگی معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے دونوں
 ہاتھ پہلوؤں پر رکھ کے خفیف سے کندھے اچکائے
 تھے۔

”حزام پلیز۔“ وہ ہاتھ اٹھا کے بے ساختہ
 اے لوک کئی تو وہ جیسے بھڑک ہی گیا تھا۔
 ”تم کیا سمجھتی ہو اسل کہ بال سمیٹ لینے
 تم نے وہ سارا وقت سمیٹ لیا ہے۔ جس میں تم
 تمہیں۔۔۔ میں تھا۔“ اس نے ایک یقین کے ساتھ
 اسے یاد دلایا تھا۔

”اس وقت میں اور بھی بہت کچھ تھا۔“ اس نے بھی پلٹ کر اس ایک ہی جملے میں ہکڑوں کا انبار اس کے سر رکھا تھا۔

”میں اس وقت کی صفائی نہیں دے سکتا، وہ گزر چکا ہے۔“ وہ پسائی اختیار کرتے ہوئے دھیمے سے بولا تھا۔

ابھی راہ پیچھے چھوڑ دیتے ہیں حزام نوید! کیا محبت میں آنکھوں کو اور قدموں کو پابند نہیں ہونا پڑتا۔“

ماصل کے لہجے میں اویسی اتری تھی۔

”وہ محض آوارگی تھی، ورنہ دل تو ہمیشہ تمہاری
ات کے دائرے میں ہی رہا۔ مجھے تمہاری تعلیم مکمل
ہونے کا انتظار تھا، پھر اس حادثے نے جیسے ہر چیز
الٹ پلٹ دی۔“

اس کے لہجے میں اک تکلیف سی سمٹ آئی تھی
 :ہ کہ سننے والی نے بھی محسوس کی۔

”ہاں..... واقعی اس حادثے نے ہر چیز الٹ پٹ دی۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی تو لہجہ بہت کچھ جتاتا ہوا تھا۔

حزام نے اس بے درد کو حیرت سے دیکھا، جو

وہ خفا سے انداز میں بولی۔

”میں کل دادی اور ماما کو دوبارہ تمہارے گھر بھیج رہا ہوں۔“ وہ کس قدر سکون سے کہہ رہا تھا کہ وہ بڑی حد تک بے سکون ہوئی اور اسے استغابیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”پلیز ایسل۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے کچھ بھی کہنے سے روکنا تھا کہ ہوا سا، التجائیہ سا لہجہ کہ وہ بس نظریں جھکا کے رہ گئی۔

”اب میں واپس آ چکا ہوں تو میں نہیں چاہتا کہ تم فکوں کے ختم، بورنگ ویسے اور خواہ مخواہ آس پڑوس کے عقیقہ اٹینڈ کرتی پھرو۔“

اس کا چہرہ اور اس کا لہجہ کہیں سے گئی رتوں کی مسکراہٹ ڈھونڈ رہا تھا۔

”ہیں.....!“ ایسل نے اسے شپٹا کے دیکھا۔ پھر جھینپ کے، اس رات سے نکل کے تپے سے چہرے کے ساتھ نگاہ چرائی کہ مقابل کی نگاہوں میں وہ تاثر جیسے جم سا گیا تھا۔

”یقین کرو کہ میں خود تمام ساعتیں کس قدر احتیاط سے خود میں سنبھال رہی ہوں جو تیرے ہونے کے تھوڑے سے تیری یادوں سے مشکل ہو گئیں۔ میرے لیے وہ دو گلاب ہی موسم بہار تھے جو آج بھی میرے والٹ میں محفوظ ہیں۔“

وہ محفوظ اور بوجھل سی مسکراہٹ کے ساتھ لب کشا تھا اور وہ منہ بہ منہ رکھے حیرت کے کون کون سے در نہیں کھٹکھٹا چکی تھی کہ اب تو وہ اس ان انتظار زدہ آنکھوں کا حق تھی جو اس لمحے ایسل کی آنکھوں میں چمکی تھی۔ وہ کئی عمر کے خواب اور بچی عمر کے عذابوں جیسے موسم اس لڑکی کو کس امتحان میں ڈال چکے تھے۔

آج وہ دونوں میاں، بیوی ایک ہی پوزیشن میں تھے۔ خوشی کے مارے بیوی کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے اور غصے کے مارے شوہر کا پارہ بھی نیچے نہیں

آ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھولتی بیڈروم میں آئی،

جب کہ ہاتھوں میں نقیس سی ٹرے تھی جو اس نے کسی بالادب کینیز کی طرح شوہر کو پیش کی، اس پر مزید محبت۔

”آپ کا سرد بادوں؟“ لہجے میں من بھر مٹھائی سمو کے پوچھا۔

عرفان نے اس کا سجا، سنورا چہرہ نظر بھر کے دیکھا۔

”نہیں..... پاؤں دبا دو۔“ توقف کے بعد احسان جتنا سا لہجہ، چائے کا کپ اٹھائے ہوئے حکم صادر کیا۔ جانتا تھا کہ اسے پاؤں دبانے سے کس قدر رکوت ہوتی تھی۔ وہ بیڈ پہ ٹنگ گئی اور نرم ہاتھوں سے پاؤں دبائے گی۔

وہ حیران ہوا کہ آج انداز میں رکوت نہیں، بس خدمت کا عمل دخل تھا۔ سارہ کو اپنی خوشی تو سمجھ میں آرہی تھی کہ آج صبحی اور عالیہ کے ہاتھوں میں رضا اور ارسل کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں اور سارہ۔ سمیت باقی گھر والوں کے چہرے بھی جگمگ کر رہے تھے۔

آج کی دوسری بڑی خبر شازمہ خاتون کا دوبارہ سے رشتہ لے کر آنا بھی تھا کہ آج انہوں نے توقیر اور نائلہ توقیر کے سامنے دامن پھیلا رکھا تھا۔ پھر ایک گہری خاموشی کے بعد توقیر نے ادب اور نرمی کے ساتھ ان سے جواب کے لیے وقت مانگا تھا اور اس بات پر عرفان صاحب نے اک امن بھرا ماحول خوب خراب کیا تھا۔

”مہلت کی کیا ضرورت تھی، صاف کہہ دیتا تھا کہ وہ شخص ہماری بیٹی کے قابل نہیں۔“

تاہم اس نے بڑے بھائی کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب لہجہ اختیار کیا تھا، مگر اماں تو بیٹے کے مشورے پر بھڑک ہی اٹھی تھیں۔

”واہ بھئی..... خوب وہ جادوئی عینک ہمیں بھی تو دو، جس کے لگاتے ہی تمہیں قابل اور ناقابل کا فرق نظر آ جاتا ہے۔“ اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گھما کے ایک مارتیں۔

”اگر کھلی آنکھوں کے ساتھ فیصلے کیے جائیں تو سب سمجھ میں آ جاتا ہے۔ کیا نواسی کا انجام بھول

گئیں۔ آپا نے بھی بس جاہ و حشمت دیکھ کے رشتہ کیا تھا۔“ بیٹے نے سنتے کے ساتھ ماں کو طعنہ مارا۔ اس سے مشورہ جو نہیں لیا گیا تھا۔

کئی پل کو تو مارے صدمے کے ماں سے کچھ بولا ہی نہیں جاسکا تھا، کچھ بولنے کے قابل ہوئیں تو بس اتنا کہا۔

”یہ قسمت کے کھیل ہوتے ہیں کہ حادثے شادی کے بعد ہی ہو سکتے ہیں، ورنہ شادی سے پہلے کچھ برا ہو جائے تو حزام نوید جیسا رشتہ قبولنے سے قبل سو اندیشے ستاتے ہیں۔ اللہ نے شازمہ کا صبر دیکھا کہ سب ٹھیک ہو گیا۔“

اب اصل معاملہ اماں نہیں جانتی تھیں کہ نواسی نے اتنا طویل صبر کیوں کر کیا۔ بہر حال گھنٹہ بھر پہلے عرفان چچا حزام کے سلسلے میں شدید مخالفت کا تاثر دیتے ہوئے بیڈروم میں تشریف لے آئے تھے اور اب بیوی سے خدمت کروا رہے تھے۔

”آپ نے اماں کا دل دکھا کے اچھا نہیں کیا۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی، تو شوہر بس تاثرات کے ساتھ سوالیہ ہوا۔

”اماں اگر جواد کی دعوت کرنا چاہتی تھیں تو آپ کو منع نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ اس نے ترجیحی نظر سے انہیں دیکھا، جن کی نگاہیں سیل فون کی روشن انکریں پہ لگی تھیں، جن کے لیے اس سوال کا جواب ضروری نہیں تھا، جواد اب رہا ہو چکا تھا کہ ایک ماہ قبل ملنے والے شخص کا خون بہا وصول کر کے اس کے ورثے میں لیس واپس لے لیا تھا۔ شاید ان کے دل کی بھڑاس نکل چکی تھی یا ان کی معاشی مجبوریاں تھیں۔

سارہ نے ایک پرسوج سا سانس بھرا اور ان سے مخاطب ہوئی۔

”اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ چوہا مارنا زیادہ مشکل کام ہے۔“ جانے سارہ کے لہجے میں کیا تھا کہ وہ چوہے اور سیل فون اپنے پہلو میں رکھا۔

”اب تو شازمہ کا شوہر انسان کو مارنے جیسا آسان کام بھی سرانجام دے چکا ہے۔ بقول آپ

کے اب وہ الو کا پٹھا نہیں رہا تھا، آپ نے پھر بھی اسے یہاں داخلہ بندی کا حکم سنا دیا، کیوں کہ وہ اب جیل کاٹ چکا ہے۔“ وہ ہنسی ”کہ وہ اب شرقا میں سے نہیں۔ مان لیا، مگر اب شازمہ استراحتی ہے کہ اس کی شادی ایک بہادر انسان سے ہوئی۔ ہے تا عجیب بات۔“ وہ پھر سے سابقہ انداز میں ہنسی۔

”تم نے بھگ تو نہیں پی رکھی۔“ اپنے پاؤں پیچھے سمیٹتے ہوئے وہ ناگواری سے گویا ہوئے۔ ”اچھا بھلا موڈ خراب کر دیا۔“ وہ بڑبڑائے۔

”اللہ..... رے بے نیازی تو دیکھو۔“ سارہ نے انہیں جھنجھلا کے دیکھا۔ یعنی کہ پہلے کا موڈ اس کے اپنے حساب سے اچھا بھلا تھا۔

”گویا رشتے پانی میں بھیگ جانے والے کاغذ تھے، بہہ گئے سو بہہ گئے۔“ وہ تادیر انہیں گھورتی رہی۔

”تم مانویا نہ مانو مگر.....“ اس نے جان بوجھ کے توقف برتا کہ وہ متوجہ ہو چکے تھے۔ ”آج کے دور میں مارنا، وہ بھی ڈنڈے سے، چوہے جیسے پھر تیلی ہستی، بہت مشکل کام ہے۔“

وہ شوہر کو تملاتا اور بل کھاتا چھوڑ کے پیر پٹختی باہر جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

”اسے کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔ جانے وہ کہاں کھڑی تھی۔ عورت سستوں کا تعین بھی کر ہی نہیں پاتی یا وہ آسمان کی طرف دیکھتی ہے یا اپنے قدموں کی طرف جن کے نیچے زمین ہوتی ہے۔ اس نے آئینے میں اپنا ستا ستا چہرہ دیکھا۔

پہلے کی بات اور تھی۔ بھلے جو بھی فیصلہ سنا دیا گیا تھا، اس کی بلا سے..... مگر اب..... اس نے ایک تھکا تھکا سا سانس لیا، جس کی ہمراہی وہ چاہتی تھی، وہ کس سمت کھڑا تھا، اس نے اپنے عکس سے سوال کیا۔

”کیا وہ چار قدم اس کی جانب اٹھا سکتی تھی؟“ کوئی بھی جواب نہ پا کر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ”بے وفائی میں عورت کا بھی کوئی ثانی نہیں۔ وہ کس کمال سے بے وفائی کرتی ہے اور پھر خود کو

269 2018

سونے کی کوشش کی۔

☆☆☆

وہ ایک یونیک اور بہت بڑا شاہجنگ مال تھا، وہ آج اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ وہاں شاہجنگ کی غرض سے آیا تھا۔

”ایک کپ چائے کا نہ ہو جائے۔“ کچھ شاہجنگ پنہانے کے بعد یہ مشورہ بھی ان ہی کا تھا۔ ”کیوں نہیں۔“ بانی چاروں ان کے ساتھ ہو لیے۔ شاہجنگ مال کے فوڈ کورٹ میں کچھ زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔

”سکل بن پھول رہی سرسوں۔“

وہ سب سے آگے تھے اور سرور سا ہو کے گنگنائے۔۔۔۔۔ رات کو ایک تھیٹر پر فارم کرنے کیا غضب کا رقص کیا تھا کہ وہ گیت ابھی تک ان کے ذہن میں تازہ تھا۔

انہوں نے لاپردا سے انداز میں سامنے دیکھا۔ ان کا سرور پھک سے اڑا۔ سکل بن سرسوں کیوں کر پھول سکتی تھی یہ معہ جائے بھاڑ میں۔ فی الحال تو ان کا یہ حال تھا کہ وہ صدمے سے بے حال تھے کہ آج دوسری بار بھی وہی دوست ان کے ہمراہ تھے جنہوں نے ان کی بیٹی کو دو ہفتے قبل ہاسپٹل میں دیکھا تھا اور تادیر دیکھا تھا۔

مگر آج وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے سامنے حزام نوید بیٹھا تھا۔ وہ دونوں کی بات پہ مسکرا رہے تھے، تیس سیکنڈ، پچاس سیکنڈ بالآخر ایک منٹ پورا ہوا۔ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آگے بڑھے۔ حالانکہ چہرہ آنچ دے رہا تھا اور دل میں بھانجھڑ رہے تھے، مگر یہ محل کے ساتھ سوچ سمجھ سے کام لینے کا وقت تھا کہ بات عزت اور غیرت کی تھی۔

دوست جانتے تھے، پہچانتے تھے کہ کسی مرد سے ڈیٹ مارنی یہ لڑکی عرفان صاحب کی بیٹی ہے اور عرفان کے گھر کی عورتیں یوں گھر سے باہر، ملازموں میں غیر مردوں کے ساتھ گھومتی ہیں، ناممکن، یہ ہو ہی نہیں سکتا، آنکھوں کے سامنے کا منظر

بری الذمہ بھی ٹھہراتی ہے۔ میں نے سفر کیا تھا اور تمہارے لیے چاند تک گئی۔ جو خالی تھا وہاں تم نہیں تھے۔ تم شمالی سمت کے جس جنگل میں میرے منتظر تھے میں وہاں تک کیسے آ پاتی اور اگر میں آنے کی ٹھان بھی لیتی تو تمہیں اس گھنے جنگل میں کیوں کر ڈھونڈ پاتی۔ میں تو دنیا چھوڑ کے تمہارے ساتھ مرنے پر ہنا چاہتی تھی اور تم میرے لیے مغربی ساحل پہ کھڑے رہ گئے۔ میں جب وہاں پہنچی تو سورج غروب ہو چکا تھا، تمہارا قصور تھا نا۔ تمہیں اک دیا تو جلا کے رکھنا چاہیے تھا نا۔

دراصل وہ اس بھنور سے بھی نکل ہی نہیں پائی، خاندان، رسم و رواج، لوگ، وہ دائروں میں رہنے کی عادی جو ہوئی ہے اور اس دائرے میں بھلا شامل کا جنگل اور مغربی ساحل کہاں سما سکتا ہے، اس حصار میں عورت آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتی ہے یا پھر قدموں کے نیچے جی زمین کو دیکھتی ہے۔ عورت کس کمال سے بے وفائی، بے وفائی کھیتی ہے۔ اس نے تکلیف درست کیا اور سونے کی کوشش کی۔

”بابا اور ماما میں سے کسی نے بھی حزام کے متعلق اس سے بات نہیں کی تھی۔ اگر وہ مجھ سے بات کریں گے تو میں مرنے پر تیار رہنے کا خواب توڑ دوں گی کہ مجھے اسی کی سمت سفر کرنا ہوگا۔ جیسے کسی فیصلے پہ پہنچی۔“

”اور اگر۔۔۔۔۔“ اس کا دل بے چینی سے دھڑکا۔ ”کسی نے مجھ سے پوچھے بتا ہی۔۔۔۔۔“ وہ سیدھی ہوئی اور مارچ کے آخری دنوں میں موٹی سی چادر اوڑھ لی۔ اب وہ جیسے خود سے چھپ گئی تھی۔ ”کہہ دوں گی میں تو چاند تک۔۔۔۔۔ اف۔۔۔۔۔“ آنکھ کے کنارے بھیگ سے گئے۔ ”کہہ دوں گی تمہارے عام سے والٹ میں مقید۔ بہار کا موسم میری محبت کا عطا شدہ ہے، کیا اس کے سوا بھی کچھ چاہیے۔ اب رخسار بھی بھیگنے لگے۔“ ان مردوں سا بے وفا کوئی کیا ہوگا۔ لاکھوں افیر چلا رہے ہوتے ہیں اور محبت کا دوا کسی ایک سے بھلا اب ان کا اعتبار کون کرے۔ اس نے اپنی سوچ کا کوئی پرانا دریچہ کھولا اور

جھٹلا کر ان کے دل نے نفی کی تھی۔

انہیں ہر شے سے بڑھ کے غیرت پیاری تھی۔ حالانکہ وہ خود انگلیوں پہ شمار نہیں کر سکتے تھے کہ وہ کتنے ریسٹورنٹس، کیفے ٹیریا، ہوٹلز، پبلک پلس اور اسی طرح کے فوڈ کورٹس میں کتنی لڑکیوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزار چکے تھے اور گزارتے تھے۔ مگر آج بات کچھ اور تھی، جیسے دل پہ کسی نے بے دردی سے بھاری پاؤں رکھ کے شدت سے دبایا تھا۔

ہسل نے سامنے دیکھا اور اس کی آنکھیں پھیلیں، دل سکڑا اور ہاتھ پاؤں سرد ہوئے کہ بچپان ہی کی طرف آرہے تھے۔ ہسل کے چہرے پہ قیامت کے جیسا خوف اتر، اب انسٹ ہوگی، وہ بھی حزام کے سامنے۔

یہ ملاقات محض اتفاق تھی کہ شاہجنگ مال کے باہر دونوں کا آتنا سامنا ہوا تھا۔ حزام نے سے ایک کپ چائے کی آفر کی تو وہ رد نہ کر سکی اور ابھی تو انہوں نے چائے کا آرڈر دیا تھا۔

”کیا ہوا ہسل؟“ اس نے گھبرا کے پوچھا۔ مگر تب تک عرفان ان کے سر پہ پہنچ چکے تھے۔ ”ہیلو۔۔۔۔۔ بر خوردار کیا حال ہے؟“ انہوں نے حزام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جس نے گڑبڑا کے اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔

”یہ حزام نوید ہے۔“ اب وہ پلٹ کے اپنے دوستوں سے مخاطب ہوئے۔ حزام کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

”یہ میرا فرسٹ کزن ہونے کے ساتھ۔۔۔۔۔“ انہوں نے دم لیا اور دم سادھ کے بیٹھی ہسل پہ نگاہ ڈالی۔ ”یہ ہمارا ہونے والا داماد بھی ہے۔“

بات غیرت کی تھی، فیصلہ ہو چکا تھا۔ وہ دم بخود رہ گئی اور حزام کیا وہ آج سے پہلے بھی اس قدر حیران ہوا ہوگا، کیا وہ آج سے پہلے بھی اس قدر عجیب شخص سے ملا ہوگا، اس نے مسکرا کے تعظیم کے ساتھ عرفان کے دوستوں سے ہاتھ ملایا، وہاں بت بنی ہسل کو یقین ہو چلا تھا کہ چچا صرف غیرت کا راگ ہی نہیں

الاپتے بلکہ واقعی۔۔۔۔۔

☆☆☆

راتوں رات کا کیا کیسے پلٹی تھی، کوئی نہیں جانتا تھا، مگر یہ معجزہ ہوتے سب نے دیکھا جب نوید نے التجائیہ سا ہو کے کہا تھا۔

”ہمارا بیٹا ماضی میں جن حالات کا بھی شکار ہوا۔ وہ ایک سازش کا نتیجہ تھا، باقی کی تمام آوارہ گردیاں تو اس عمر کا حصہ ہوتی ہیں۔“ وہ ہلکے سے مسکرائے تھے۔

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ آپ درست فرما رہے ہیں۔“ یہ جملہ عرفان کے منہ سے ادا ہوا تھا، یہ سن کر باقی سب سن ہو چکے تھے اور یوں ہستے مسکراتے ماحول میں یہ بات طے پا گئی۔

وہ رات کو اپنے کمرے میں جا رہے تھے جب ہسل اچانک راستے میں آگئی۔ عرفان نے اسے خفا سا ہو کر دیکھا۔

”چچا میں تو آج یوں پہلی بار صرف حزام کے ساتھ۔۔۔۔۔“ وہ اچانک خاموش ہوئی۔

”شکر کرو کہ میرے ساتھ دوست تھے۔ ورنہ میں نے اس الو کے پٹھے کی ہڈی پہلی ایک کر دینا تھی۔“ ہسل نے اپنے کھلے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

مطلب چچا تو بالکل ویسے ہی تھے۔ یہ سارا کرشمہ غیرت کا تھا۔ وہ ذرا سا آگے بڑھنے کے بعد رکے۔ پھر مڑ کے ہسل کو دیکھا اور پلٹ کے اس کے پاس آئے۔

”انسانوں میں۔ انسان ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ میرے جیسے خود انسان رہ کر باقیوں کو فرشتوں کے عہدے سونپنا چاہتے ہیں۔“

یہ سچ تھا، وہ سوچتے رہ گئے، کہ نہ سکے۔ ہسل نے سراپسگی سے دیکھا۔

”تمہاری طرف ایک تھپڑ بٹاتا تھا۔“ انہوں نے ایک لخت ہاتھ اٹھایا۔ پھر مٹھی بھینچ لی۔ ہسل کی سانس جیسے ٹھم کے چلی۔ انہوں نے اس کے سر پہ ہلکی سی چپٹ لگائی۔

”ج اپنی دادی سے کہہ دینا، اس مرد کے بچے



کیا دل گرفتہ ہم تری محفل سے آئے ہیں
آنکھوں میں اشک بھی بڑی شکل سے آئے ہیں

محبوب ہو کے پھر تری محفل میں جاؤں گے
مایوس ہو کے جو تری محفل سے آئے ہیں

کانوں میں گونجتی ہے اک آواز دل نشیں
پیغام مرے دل کو ترے دل سے آئے ہیں

ان سے زیادہ ان کا تصور ہے دل نواز
بیٹے بٹھلے جیسے ان سے مل کے آئے ہیں

اپنی نظر میں اب کوئی جتنا نہیں حفیظ
اٹھ کر نہ جلنے کس کے مقابل سے آئے ہیں

حفیظ ہوشیار پوری

خواب کے علاقے میں

خواب کے علاقے میں
بے شمار آنکھوں کا

دور تک پڑاؤ تھا
ایسے میں خیال آیا

دنیا کے سبھی انسان
تشنہ اور پیاسے ہیں

دوڑ دوڑ کر دن بھر
زندگی کی ان گنت

ضرورتوں کی خاطر
خواہشوں، تمناؤں، آرزوؤں کے لیے

تنگ و دو کرتے ہیں
جیتے اور مرتے ہیں

صبح و شام کرتے ہیں
بھر بھی تشنہ رہتے ہیں

ماست کے ہر آخر
اپنی ہلکی آنکھوں کو

لے کے آ کر آتے ہیں
دلنشین و دلربا

ہر ایک فکر سے آزاد
پر سکون و سادہ سے

خواب کے علاقے میں
سیما مابدی

پر سے ہٹا کر اڑان بھرتے پرندے کو دیکھا۔
”کون سا پرندہ تھا؟“ اس نے پلٹ کے پوچھا۔
”یہ ماہ بہار کا پرندہ تھا اور اس کا کوئی نام
نہیں۔“ وہ لا پرواہی سے مسکراتا ہوا درخت کے
قریب گیا اور اس کی دوسری شاخ جھلائی تو کتنے ہی
پرندے فضا میں اڑے۔۔۔۔۔ اسل نے اس سے پہلے
اتنا دلکش منظر کہاں دیکھا ہوگا۔

”واؤ۔۔۔۔۔ بہت خوب صورت۔“ وہ جیسے
ایڑیاں اٹھا کے ان کے ساتھ اڑنا چاہتی تھی۔
”بالکل ایسے ہی میں بھی مہبوت رہ گیا تھا۔“

وہ ہلکی سی آواز کے ساتھ بولا۔
”کیا کسی کا نام اس کی شخصیت ہے اس قدر
سوٹ کرتا ہوگا جیسا کہ تمہارا۔“ اس قدر مدھم سی بات
بہت قریب سے ہی کی گئی تھی۔ وہ کچھ دور ہوئی۔

”آؤ کہ میں تمہاری آنکھوں کو مسکراتا دیکھنا
چاہتا ہوں۔“ وہ اگلے درخت کی اور بڑھا۔
”آؤ کہ ماہ بہار کے پرندے اڑائیں۔“

اس نے شاخ جھلائی۔
”آؤ کہ پھر انہیں ہجرت کرنا دیکھیں۔“

وہ جیسے ملن کے ساتھ ہی اڑی۔ ”آؤ کہ کسی
درخت تلے مل کے بیٹھیں۔“

”بے غم، بے فکر کہ پھر بہار کے لوٹ آنے تک
ہم ان ہجرت زدہ پرندوں کا یہیں انتظار کریں گے۔“

”اگر وہ لوٹ کے نہ آئے تو؟“ اسل نے
بے تابی سے پوچھا۔

حزام نے اسے دھیان سے دیکھا۔
”تم دیکھنا جب بہار آئی تو وہ بھی لوٹ آئیں
گے، ورنہ تمہاری ایڑیوں کی بے خودی اڑان کیا ان
سے کم ہے۔“

وہ اک جذب کے ساتھ مسکرایا۔ وہ شاخوں
سے پرندے ڈھونڈتی لڑکی کے ساتھ بہت دور تک
سفر کرنا چاہتا تھا۔

☆

کی دعوت پر اب مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“
وہ بات ختم کر کے پہلے کے سے غرور کے
ساتھ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔
”تبدیلی بس موسموں کی حد تک ہے۔“ اسل
نے بمشکل ایک سانس کھل کے لیا۔
”کچھ لوگ بدل سکتے ہیں نہ ان کو بدلنا ہوتا
ہے۔“

☆☆☆

”کیا تمہارے چچا نے واقعی یہ کہا؟“ حزام
نے بے پناہ ہنستی ہوئی اسل کو گھور کے دیکھا۔ جس
نے وہ جملہ من و عن دہرا دیا تھا، اس کے لہرے دار بال

ہوا سے اڑ رہے تھے۔ وہ ایک معروف پارک میں
جشن بہاراں دیکھنے آئے ہوئے تھے کہ اچانک ایک
لڑکی ان کے قریب ٹھہری۔

”واؤ۔۔۔۔۔ حزام نوید!“ اس نے حزام کی
جانب ہاتھ بڑھایا۔ جس نے ذرا سا چھو کے فوری
چھوڑ دیا تھا اور کن اکھیوں سے اسل کو دیکھا جو چند

قدم آگے بڑھ چکی تھی۔
”سوری ہانیہ! میں اپنی فیانی کے ساتھ
ہوں۔“ ہیلو ہائے کے بعد وہ اس سے معذرت کرتا

آگے بڑھ گیا تھا۔
”اس نے تمہیں یاد رکھا ہوا تھا۔“ خاصے
نروٹھے پن سے پوچھا گیا۔

”شاید!“ وہ ہلکے سے کندھے اچکا کے رہ گیا۔
”اور تمہیں بھی اس کا نام یاد تھا؟“ اب کے

لہجہ تپا ہوا تھا۔
”میں نے اسے پہچان لیا تھا۔“ وہ یوں ہی
سیدھ میں دیکھتا گویا ہوا۔

”بات تو ایک ہی ہے۔“ اسل نے ذرا لپک
کے قریبی درخت سے پتا توڑا۔
”بات ایک نہیں ہے اسل!“ وہ رک گیا اور

نری سے گویا ہوا۔ شاخ کے پٹے سے اس پہ سستا
پرندہ تیزی سے اڑا تھا۔ اسل نے اپنی شکی نگاہ اس

مجبوری

سخت گرمی پڑ رہی تھی، رنگروٹوں کا ایک دستہ بڑی دیر سے چلچلائی دھوپ میں پریڈ کر رہا تھا۔ ان سے بار بار غلطی ہو جاتی اور سار جٹ غصہ سے جھنجلا اٹھتا۔ آخر تک آکر وہ دھاڑا "اف میرے خدائے نکلے لوگ آخر میں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں؟" گرمی سے نڈھال رنگروٹوں کی نظریں بے اختیار قریبی سایہ دار درختوں کی طرف اٹھ گئیں۔ سار جٹ ان کا مقصد بھانپ گیا۔ جل کر بولا۔

"ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں مگر مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس اتنی زیادہ رسیاں نہیں ہیں۔"

جج صاحب کی احتیاط

ریٹائرمنٹ کے بعد جج صاحب ایک غیر ملکی بینک میں کیشیر لگ گئے۔ ایک روز ایک شخص آیا جو بڑی رقم کا چیک جلدی کیش کرانا چاہتا تھا۔ ریٹائرڈ جج صاحب بولے "آپ کی شناخت کا ثبوت واضح نہیں ہے۔"

وہ شخص انہیں پچھانتا تھا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "جناب والا! کسی زمانے میں آپ اس سے بھی کم تر ثبوت پر ملزم کو پھانسی چڑھانے کا حکم صادر فرما دیا کرتے تھے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" جج صاحب تھل سے سر ہلاتے ہوئے بولے "لیکن جب معاملہ کیش کا ہو تو احتیاط کرنا پڑتی ہے۔"

حفظ ما تقدم

ایک خوش حال تاجر کو کسی معمولی جرم میں دو

ہفتے قید کی سادہ سزایا پانچ ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ تاجر نے قید بھگتنے کو ترجیح دی تو اس کا ایک قریبی دوست حیران رہ گیا۔ اس نے تاجر سے کہا۔ "جرمانہ ادا کیوں نہیں کر دیتے۔ ایسی بھی کیا کنبوسی۔"

تاجر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "ارے بھئی کنبوسی کی بات نہیں ہے۔ دراصل آج ہی ہمارے باورچی نے چھٹی لی ہے۔ گھر پر رہوں گا تو بیوی کے ہاتھ کا کھانا پڑے گا۔"

مسرت الطاف احمد کراچی

یہ ایڈیٹر

ایک نیا شاعر ایک رسالے کے ایڈیٹر کے پاس غزل لے کر گیا۔ ایڈیٹر نے پوچھا۔

"یہ غزل آپ کی ہے؟"

شاعر نے کہا بے شک کیا آپ اسے شائع کر رہے ہیں؟

ایڈیٹر نے کہا کہ افسوس کہ یہ رسالے کے معیار پر پوری نہیں اتری۔

شاعر صاحب زرب لب بڑبڑائے۔ "یا اللہ! غالب کی غزلیں بھی غیر معیاری ہو سکتی ہیں۔"

ریحانہ چوہدری مدد کے

بے وقوف کون

دو دوست آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا "تمہارا بیٹا بے وقوف ہے۔"

دوسرے نے کہا "تمہارا بیٹا زیادہ بے وقوف ہے۔"

چنانچہ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے اپنے بیٹوں کا امتحان لیا جائے۔ دونوں میں سے کون زیادہ بے وقوف ہے۔ پہلے نے اپنے بیٹے کو پانچ روپے دے کر کہا کہ وہ 2017 کے ماڈل کی نئی کار لے کر آئے۔

دوسرے نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "تم میرے دفتر جا کر معلوم کرو کہ میں وہاں ہوں یا نہیں۔"

دونوں کے بیٹوں کی راستے میں ملاقات ہو گئی۔ پہلے دوست کے بیٹے نے کہا۔

"میرے ابو نے مجھے کار لانے کے لیے بھیج دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ کون سے رنگ کی کار لانی ہے۔"

دوسرے دوست کے بیٹے نے کہا۔

"میرے ابو نے مجھے بھیج دیا کہ ان کے دفتر سے معلوم کر کے آؤں کہ وہ وہاں ہیں کہ نہیں۔ جبکہ ٹیلی فون سامنے رکھا تھا۔ فون کر کے پوچھ لیتے۔"

فوزیہ ٹمر بٹ۔ سمرات

پردہ

ایک بد صورت ترین عورت اپنے شوہر سے: "اجی ا" سمجھت پر پردے لگوا دیں، سامنے کا لڑکا مجھے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔"

خاندان بے زاری سے: "رہنے دو یا ایک بار اچھے لے گا تو خود ہی پردے لگوا دے گا۔"

افراح آصف ڈنگہ

تلاشی

ایک آدمی نے اپنے بیٹے کی تلاشی لی۔ بیٹے کی جیب سے لسوار، سگریٹ، کترینہ کیف کی تصویر اور ایک لڑکی کا نمبر ملا آدمی نے غصے سے اپنے بیٹے کو مارا اور پوچھا۔

"کب سے چل رہا ہے یہ چکر۔"

بیٹا روتے ہوئے کہنے لگا۔

"ابا میں تینڈا چولا پانی ودا (ابا میں نے آپ کی قمیص پہنی ہوئی ہے۔)"

ماچس

ایک سردار کارات کو سگریٹ پینے کا جی چاہا تو اس نے پورے گھر کو چھان مارا لیکن ماچس نہیں ملی بالآخر سردار مایوس۔ ہو کر موم بتی بجھا کر سو گیا۔

ٹیکنالوجی کی جنگ

گوگل نے کہا۔ "ایک لفظ لکھو، ہزاروں رزلٹ دوں گا۔"

وی پی پیڈیا بولا۔ "ایک لفظ لکھو ہزاروں پیجز دوں گا۔"

"انٹرنیٹ بولا۔ "میرے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔"

کمپیوٹر بولا۔ "تو کون سا میرے بغیر چل سکتا ہے۔"

یہ سب سن کر بجلی ہنسی اور بولی تم سب لڑتے رہو میں تو چلی۔

قابل دید

ایک کالج میں رزلٹ کا دن تھا۔ ایک طالب علم نے اپنے دوست سے کہا۔

"یار..... میرے ساتھ میرے ابو کھڑے ہیں، تو جلدی سے جا اور میرا رزلٹ دیکھ کر آ۔ میں ایک مضمون میں فیل ہوں تو کہنا ایک مسلمان بھائی تمہیں سلام کہتا ہے، اگر دو میں فیل ہوں تو کہنا دو مسلمان بھائی تمہیں سلام کہتے ہیں۔"

دوست گیا اور تھوڑی دیر بعد آ کر بولا۔ "یار! پوری امت مسلمہ تمہیں سلام کہتی ہے۔"

آمنہ میر جرانوالہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا۔
”اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا (یعنی کوئی آنے والی بلا نہیں رکھتی اور تقدیر نہیں پھرتی) بلکہ بخل کے دل سے مال، نذر کے سبب سے نکالا جاتا ہے۔“
(یعنی بخل یوں تو خیرات نہیں کرتا اور جب آفت آتی ہے تو نذر کے بہانے دینے دیتا ہے اور مسکینوں کو فائدہ ہوتا ہے۔)

کرامت

شیخ طریقت حذیفہ مرعشی رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے ابراہیم ادم رحمۃ اللہ علیہ سے کیا عجیب بات مشاہدہ کی جو آپ نے ان کی اس قدر خدمت کی۔
انہوں نے جواب دیا کہ مکہ کے سفر میں ہم دونوں بہت بھوکے تھے۔ جب ہم کو ذب پہنچے تو بھوک کا اثر مجھ پر ظاہر ہوا۔ شیخ ابراہیم نے مجھے پوچھا۔
”کیا تم بھوک کے سبب بے تاب ہو؟“
”میں نے کہا۔ ہاں یہی بات ہے۔“
ابراہیم نے کہا۔ ”دوات اور کاغذ لے آؤ۔“
میں نے دونوں چیزیں حاضر کر دیں۔ انہوں نے یہ عبارت لکھی۔

”میں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے شروع کرتا ہوں۔ اے وہ جو سب احوال میں تو ہی مقصود ہے اور سب تیری اور تیری طرف اشارہ کرتے ہیں۔ میں تیرا شاکو اور تیرے اکرام پر شکر کرنے والا ہوں لیکن میں بھوکا پیاسا اور

نگاہوں میں ان تین چیزوں کا (شنا، ذکر، شکر) جو میرا حق ہیں، ضامن ہوں اور جن تین چیزوں (کھانا، پانی اور لباس) کا تجھ سے تعلق ہے تو ضامن رہ۔“
یہ رقعہ مجھے دے کر کہا۔ ”باہر جاؤ اور دل کو کسی اور طرف مشغول نہ کرنا۔ جس کو سب سے پہلے دیکھو یہ رقعہ اس کو دے دینا۔“
میں باہر نکلا۔ سب سے پہلے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو اوٹ پر سوار جا رہا تھا۔ وہ نامہ میں نے اس فتر سوار کو دے دیا۔ اس نے پڑھا اور پڑھ کر رونے لگا اور مجھ سے پوچھا۔
”اس رقعے کا کاتب کہاں ہے؟“

میں نے کہا۔ ”مسجد میں ہیں۔“
اس نے مجھ کو دینا کی ایک پتیلی مجھے دے دی۔ میں نے دوسرے لوگوں سے پوچھا۔ ”یہ کون شخص تھا۔ لوگوں نے بتایا۔ ایک نفرانی ہے۔“
میں نے شیخ ابراہیم ادم کے پاس واپس جا کر یہ تمام ماجرا بیان کیا۔ انہوں نے کہا۔
”اس پتیلی کو اب ہاتھ نہ لگانا۔ کوئی دم میں اس کا مالک آیا چاہتا ہے۔“
فورا ہی وہ نفرانی آیا اور ابراہیم ادم کے قدموں کو بوسہ دیا اور ایمان سے مشرف ہوا۔

سقاوت

منقول ہے کہ ربیع ابن خنیم کا گھوڑا جو چند ہزار درہم کا تھا، چمڑے گیا۔ وہ کہتے ہیں جب چوہاں کو خر کر لیے جا رہا تھا تو میں دیکھ رہا تھا۔ کسی نے پوچھا۔
”پھر آپ نے جوہ کو چھوڑ کیوں دیا؟“
انہوں نے کہا۔ ”اس وقت میں جس مشغل میں

تھا وہ اس سے بہتر تھا۔ (یعنی غماز میں تھا) یہ سن کر لوگ جھجھکے اور دماغ دینے لگے تو انہوں نے کہا۔

”ایسا نہ کہو! میں نے اپنا گھوڑا چور کو بچھن دیا اور اسے خیرات کر دیا۔“

خود پر ظلم

کسی شخص نے ایک مظلوم شخص سے کہا۔ ”تو اپنے ستم گر کو بددعا دے۔“
اس نے جواب دیا۔ ”ظالم نے مجھ پر ظلم کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، مجھ پر نہیں۔ اسنی، ہی بلا اس پر کافی ہے۔ میں کیوں اس کا بددعا کروں؟“

بہتری

اللہ تعالیٰ جس کی بہتری چاہتا ہے، اس کو ہمیشہ بلا اور بیماری کے ذریعے تنبیہ کرتا ہے۔ اسی بنا پر بزرگوں نے کہا ہے کہ دین ان تینوں باتوں سے کبھی خالی نہیں ہوگا۔
مقلی، بیماری اور ذلت و خواری۔

خیریت

ایک بزرگ نے کسی شخص سے اس کی خیریت دریافت کی۔ اس نے جواب میں کہا۔
”اللہ العزیزیت ہے۔“

ان لوگوں نے فرمایا۔ ”ماہیت اور خیریت اس میں کون سا فرق ہے؟“
ان لوگوں نے کہا۔ ”ماہیت اس میں کہ کون سا کلمہ ہے اور خیریت اس میں کہ کون سا عمل ہے۔“

بزرگ نے فرمایا۔ ”فرعون کی عمر بارہ سو برس کی تھی۔ اس مدت میں نہ اس کو بھی درد سزا تھی نہ اس کو بھی بخار ہوا۔ چنانچہ اس نے خدائی کا دھوکا لیا۔ اگر وہ ایک ساعت کے لیے بھی درد میں مبتلا ہوتا تو اس سے یہ قصور وادبے ادبی سرزد نہ ہوتی۔“
بزرگ کہتے ہیں کہ جب بندہ ایک دن کے لیے

بیمار ہو جائے اور توبہ نہیں کرتا تو ملک الموت کہتے ہیں کہ میں نے کئی مرتبہ قاصدوں کو بھیجا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

بزرگان دین فرماتے ہیں کہ بندہ مومن کو چالیس دن میں ان چار آفتوں سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔
(کوئی نہ کوئی آفت سے دوچار رہنا چاہیے) اور وہ یہ ہیں۔ رنج، بیماری، خداوند نقصان۔

اللہ کی رضا

ایک گروہ نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا۔
”آپ خداوند تعالیٰ سے پوچھیے کہ وہ کیا چیز ہے جس سے تیری رضا حاصل ہو؟“
حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی (ان سے کہہ دو)
”میرے کم پر تم راضی رہو۔ میں تم سے راضی رہوں گا۔“

اقوال دانش

۱۔ جسم گندا ہو تو لوگ دور ہو جاتے ہیں۔ دل گندا ہو تو اللہ دور ہو جاتا ہے اور جب دونوں گندے ہوں تو شیطان فریب ہو جاتا ہے۔
۲۔ جو غلطی دو مرتبہ دہرا تلبہ وہ غلطی نہیں بلکہ فیصلہ ہوتا ہے۔

(پانچ کو ٹیلو)
۱۔ غم ذاتی نہ ہو تو زیادہ دیر غمگین نہیں رہنے دیتا۔
۲۔ جسے بولنا آجائے، وہ خاموش ہو جاتا ہے۔
(مارن کو تھرکنگ)
۱۔ جس انسان میں ذاتی مصائب نہ ہوں، وہ اپنے لباس سے لے کر اپنے مکان تک، اپنی ہر شے کی تعریف چاہتا ہے۔

(داف صلی واصف)
۱۔ تین لوگ جب آپ کے سامنے بات کر رہے ہوں تو انہیں مت دیکیں۔ والدین، بچہ، غم زدہ انسان۔ کیونکہ ان کا دل بول رہا ہوتا ہے۔

کتاب کہانی

سکیر احمد

کے ساتھ برطانیہ پہلے نمبر پر آتا ہے۔ پھر امریکا چین، جرمنی اور اسپین آتے ہیں۔

دنیا میں کس ملک میں پڑھنے میں زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ”انڈیا“ آتا ہے۔ جہاں ہفتے میں دس گھنٹے یا اس سے زیادہ وقت پڑھنے پر صرف کیا جاتا ہے۔ پھر تھائی لینڈ اور پھر چین۔ قابل افسوس اور قابل غور امر یہ ہے کہ پاکستان تیسویں نمبر پر بھی موجود نہیں ہے۔

احمد ندیم قاسمی بتاتے ہیں کہ ستر کی دہائی میں چین سے ناشرین کا ایک وفد پاکستان دورے پر آیا۔ ”یہاں کتاب کافی ایڈیشن کتنی تعداد میں چھپتا ہے؟“

وفد نے قاسمی صاحب سے یہ سوال پوچھا تو وہ گڑ بڑا گئے اور کہا۔ ”پانچ ہزار“ (حقیقت میں ایک ہزار چھپتا تھا)۔ انہوں نے ایک ہزار کو پانچ ہزار کر کے وفد کو اس لیے بتایا تھا تاکہ ان پر پاکستان کا اچھا تاثر پڑے۔ اس پر بھی وہ لوگ پریشان ہو گئے کہ اتنی کم تعداد؟ ہم تو ایک لاکھ سے کم کسی کتاب کی اشاعت کا سوچتے بھی نہیں۔ (آج بھی پاکستان میں فی ایڈیشن ایک ہزار ہی چھپتا ہے۔)

کتب بینی میں کمی کی ایک وجہ کتابوں کا قوت خرید سے باہر ہونا بتائی جاتی ہے لیکن اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر جنرل اور معروف ادیب ڈاکٹر ابدال ہلا کا کہنا ہے کہ

”کم ہوتے قارئین کی وجہ بڑھتی ہوئی کتابوں کی قیمتیں نہیں کیونکہ مہنگائی تو ہر چیز میں ہوتی ہے۔ چیز مہنگا ہو گیا لیکن لوگ کھارے ہیں۔ کسی کو تحفہ دینا ہو تو مہنگائی کو خاطر میں نہیں لاتے مگر بات وہی کہ کتاب دوستی کا رجحان ہی پروان نہیں چڑھا۔ آپ نے کسی کو تحفہ دینا ہو تو کتاب دیں۔ جب آپ کے رول ماڈل

ارسطو کہتا ہے ”کتاب قوموں پر حکمرانی کرتی ہے۔“

اسی طرح فیضی کہتے ہیں کہ ”اگر میرے سامنے تین شاہی اور کتابیں رکھ دی جائیں تو میں کتابوں کو ترجیح دوں گا۔“

اور ڈاکٹر ممتاز خاں صلیبی کا کہنا ہے کہ ”جو قومیں کتابیں پڑھتی ہیں، ترقی ان کا حق ہے۔“

پاکستان میں کتب بینی:

کہا جاتا ہے کہ جتنی کتابیں پورے پاکستان میں ہیں امریکہ کی صرف ایک لائبریری میں موجود ہیں۔ یقیناً پاکستان میں اتنی ہی کتابیں موجود ہوں گی کیونکہ حالیہ سروے کے مطابق ستاون فیصد شرح خواندگی رکھنے والے پاکستان میں کل آبادی کا صرف ستائیس فیصد حصہ کتب بینی کا شوقین ہے جبکہ پچھتر فیصد عوام کتابوں سے دور ہیں۔

اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں کتب بینی کا معمولی سا شوق رکھنے والے اپنی پوری زندگی میں بشکل آٹھ سے دس کتابیں پڑھتے ہیں۔ معمولی حد والا شوق رکھنے والے بیس سے تیس کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس صورت میں ملک میں زیادہ کتابیں کیسے تک پہنچ سکیں؟

یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق ہر سال چین میں سب سے زیادہ نئی کتابیں چھپتی ہیں۔ یعنی چار لاکھ چالیس ہزار، (نی ٹائٹل کی تعداد کل تعداد نہیں)۔ دوسرے نمبر پر امریکہ، پھر برطانیہ، پھر روس، اور پھر انڈیا ہے۔ یعنی انڈیا پانچویں نمبر اور پاکستان پچاسویں نمبر پر وہ بھی صرف 3,811 نئی کتابوں کے ساتھ۔ اسی طرح اگر نئی کتابوں کی سالانہ فروخت کا سرسری جائزہ لیا جائے تو دو لاکھ چھ ہزار کتابوں

دوست پر خرچ کرنا،

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میرے نزدیک اپنے دوست پر بیس درہم خرچ کرنا سو درہم فقیروں میں تقسیم کرنے سے بہتر ہے۔
عزرا ناظر، اقصی نامہ۔ گلستان جوہر

اقوال زریں،

ہر جس شخص کو قرضہ لینے اور خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں وہ سب سے بڑا مالدار ہے۔
(مولانا رومی)

ہر جو شخص بڑوں کی صحبت میں بیٹھتا ہے، اس پر بہت ضرور لگائی جائے گی، چاہے وہ ان کی عادات اختیار کرے یا نہیں۔
(شیخ سعدی)

ہر شکل انسان کی ہمت کا امتحان لیتی ہے۔
(مکیم افلاطون)

دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح کرنا اور سب سے آسان کام دوسروں پر نکتہ چینی کرنا ہے۔

(البیرونی)
ایک لمبے کی پتی خوشی بے شمار گھڑیوں کا بدل ہو سکتی ہے۔
اپنی زبان سے اپنی تعریف کرنا، لوگوں کو اپنے آپ سے دور کرنا ہے۔

(غلیظ مامون الرشید)
بوڑھا انسان وہ ہے جو علم حاصل کرنا بند کر دے، چاہے اس کی عمر بیس سال ہو یا اسی سال ہو۔
(ہنری فورڈ)
دنیا کا کوئی شخص جاہل نہیں، ہر انسان سے کچھ نہ کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔
(گیلیلیو)

ہر مطالعہ دماغ کے لیے وی اہمیت رکھتا ہے جو ورزش جسم کے لیے۔
نمرہ عاقب۔ گریں سٹی

ہر کسی سے ناراض مت ہوں۔ بس ”غاص“ سے عام کر دیں۔
ہر ہرولی کا ایک ماضی، اور گناہ گار کا مستقبل ضرور ہوتا ہے۔

ہر محبت کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا کہ جس سے محبت کی جاتی ہے، اس کا تابع ہونا پڑتا ہے۔

(خواجہ معین الدین چشتی)
نخبہ اکرم۔ گاؤں گولیکی

زندگی،

چلنے والے دو پیروں میں کتنا فرق ہے۔ ایک آگے اور ایک پیچھے۔

مگر تو آگے ولے کو عزت اور پیچھے ولے کی توہین کیونکہ انہیں پیٹلے پل بھر میں یہ بدلنے والے ہیں اسی کو زندگی کہتے ہیں۔

مشیر،

کسی مشکل میں کسی بزدل سے کوئی مشورہ مت کرنا کیونکہ وہ تمہاری بھی، موتی ہمت کو بھی ختم کر دے گا۔

ناویہ یاسر۔ کراچی

دوستی،

حضرت فتح موصیؑ اپنے ایک دوست کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ موجود نہ تھا۔ اس کی لونڈی سے فرمایا۔

”مندوق لے آ“ وہ اٹھ اٹھی۔
بیتے دعوں کی آپ کو مزدت تھی، اتنے اس میں سے لے لے۔ جب دوست گھر آیا اور یہ واقعہ سنا تو اس لونڈی کو اس خوشی میں آزاد کر دیا۔
اسیہ جاوید۔ علی پور چچہ

ہی کھلاڑی، اداکار ہوں تو پھر ادیب اور لکھاری کو کون پوچھے گا۔“

کئی دانشور استہزائے انداز میں یہ جتا چکے ہیں کہ ”ہر فرد کتاب کی اہمیت پر لیکچر دینے کے لیے تیار ہے لیکن کتاب پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“ پنجاب لائبریری لاہور جو نادر کتابوں سے بھری پڑی ہے، نئی عمارت میں قریباً قریباً الٹو بولتے ہیں۔ لائبریری اسٹاف کا کہنا ہے کہ

”لائبریری ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں آس پاس یونیورسٹی، کالج اور اسکول بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن پھر بھی لائبریری آنے والوں کی تعداد افسوس ناک حد تک کم ہو چکی ہے۔ کوئی اور آئے نہ آئے، کم سے کم طلباء تو آئیں۔ ایک کروڑ سے زائد آبادی رکھنے والے شہر کی بڑی لائبریری میں آنے والوں کی تعداد چند سو بھی نہیں ہے۔ لائبریری میں موجود کتابوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایک بار بھی ایشو نہیں کروائی گئی۔“

ایسی تمام کتابیں جنہیں ہم میں سے کوئی بھی نہیں پڑھتا، یقیناً بد نصیب ہوتی ہیں۔ اور ان سے زیادہ بد نصیب وہ لکھاری ہوتے ہیں جو انہیں لکھتے ہیں۔ بھوکے رہ کر قاتے کاٹ کر بیماریاں جھیل کر آسائشوں سے دور رہ کر کوئی ہمارے لیے اپنے خون کو سیاہ کرتا ہے اور کاغذوں پر اپنا علم بکھیر کر ہمارے سپرد کرتا ہے۔ ہمارا اتنا فرض یا ذمہ داری تو بنتی ہے تاکہ ہم ان کتابوں کو کھول کر پڑھ لیں۔

اردو ادب

مستنصر حسین تارڑ صاحب کہتے ہیں۔ ”مجھ سے بہت سے لوگ مزید خفا ہو جائیں گے، ناراض ہو کر میرے پیری ہو جائیں گے جب میں یہ کہوں گا کہ ہم اردو ناول نگار ایک کنویں میں بند ”آگ کا دریا“، ”اداس نسلیں“، (جی چاہے تو ان میں ”راکھ“ اور ”ہراؤ“ بھی شامل کر لیجیے) ان دو چار ناولوں کی مسلسل جگالی کر رہے ہیں۔ مغرب اور امریکہ کو دھوکے دیے، ہم

جانتے ہی نہیں کہ مراکو، تونس، الجزائر، صومالیہ یہاں تک کہ سعودی عرب میں کیسے کیسے ناول لکھے جا رہے ہیں۔ ہم اپنے کنویں سے ہی باہر نہیں آنا چاہتے تو ٹھیک ہے..... پھر یہیں پڑے رہتے ہیں۔ ہم جہاں ہیں خوش ہیں، ہم کو نہ چھیڑا جائے ورنہ ہماری ”ناول نگاری“ کی عظمت مجروح ہو جائے گی۔“

مثال کے طور پر دنیا کی دس یا سو بہترین کتابوں میں ایک بھی اردو زبان کی کتاب شامل نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی دس بہترین بھی جانے والی کتابوں میں روسی اور فرانسیسی ادیبوں کی چھ کتابیں شامل ہیں۔

عالمی سطح پر بھی چند ایک وہی پاکستانی لکھاری اپنی جگہ بنا سکے ہیں جو انگلش میں لکھتے ہیں یا جو بیرون ملک رہائش پذیر ہیں۔ انہیں اپنے ”قارئین“ بدلنے پڑے اور ”زبان“ بھی۔ کسی غیر ملکی زبان میں لکھنا برا نہیں ہوتا، لیکن اگر اس کی وجہ ”ہم جو لکھتے ہیں وہ یہاں پڑھا نہیں جاتا“ ہو تو پھر یہ وجہ غور طلب ہوتی ہے۔

دنیا کا پہلا ناول جاپانی ناول ہے جو آج بھی جاپان میں زندہ اور موجود ہے۔ اردو کا پہلا ناول مولوی نذیر احمد کا ”مراۃ العروس“ ہے ان دونوں ناولوں میں بس ایک فرق ہے کہ دنیا کا پہلا جاپانی ناول ساری دنیا کی زبانوں میں ترجمہ ہو کر پڑھا جا رہا ہے اور اردو کا پہلا ناول پاکستان میں بھی نہیں پڑھا جا رہا۔

اب تک کتب بنی کو ایک غیر ضروری یا شوقیہ چیز سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ دنیا جتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے اس حساب سے اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ”مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں ہے۔“

ہمیں یہ شوق خود میں اور موجودہ نسل میں پیدا کرنا ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کوئی حل نہیں ہے۔ ہمیں خود کو اور دوسروں کو اس طرف لانا ہی ہوگا۔ پھر

جتنا زور ہمارے مذہب نے ”علم“ پر دیا ہے اس حساب سے ہمیں تو کتاب سے سر ہی نہیں اٹھانا چاہیے۔

دنیا کے ہر ملک کی طرح ہمارے یہاں بھی بے انتہا ٹیلنٹ موجود ہے۔ میں جانتی ہوں کہ یہاں سب کچھ لکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔ ضرورت ہے تو صرف اتنی کہ بس تھوڑی سی کوشش کی جائے۔ جو لوگ کتابیں خرید سکتے ہیں، وہ کسی ایک ایسے انسان کو کتاب دینا شروع کر دیں جو کتاب تو نہیں خرید سکتا لیکن کتاب پڑھنا ضرور چاہتا ہے۔ اپنے آس پاس کے لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کریں۔ تبدیلی کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو وہ بہر حال ”فرق“ ڈالتی ہے۔

کچھ معلومات:

1: ہم مسلمانوں میں کتب خانوں کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ تاریخ میں ایسے کئی واقعات موجود ہیں جہاں لڑکیوں کو جہیز میں کتب خانے دیے جاتے تھے۔ حکیم محمد سعید مرحوم نے اپنی بیٹی کو جہیز میں ذاتی کتب خانہ (لائبریری) دیا تھا۔

2: منشیاد کا ناول ٹاواں ٹاواں تارا (راہیں) امرتسر یونیورسٹی کے ایم فل کورس میں شامل ہے اور اس کا پانچواں پرچہ ہے۔ اس پر پی ایچ ڈی کا تھیسس بھی لکھا جا رہا ہے۔ یہ مشرقی پنجاب (انڈیا) میں بے حد مقبول ناول ہے۔ اسے اکادمی ادبیات کا وارث شاہ ایوارڈ، کھدرپوش ایوارڈ کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی ایوارڈز مل چکے ہیں۔

3: شوکت صدیقی کا ناول ”جانگلوس“ اردو کے ضخیم ترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ ان ہی کا دوسرا ناول ”خدا کی بستی“ اردو کا وہ واحد ناول ہے جس کا دنیا بھر کی بیالیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ (جو

ہمارے لیے ایک اعزاز ہے۔)

4: ”آسانی سے پڑھی جانے والی تحریر بہت

مشکل سے لکھی جاتی ہے“ یہ مشہور فقرہ مایا آنگبلو نے کہا ہے۔

5: جس کتاب کو سب سے پہلے ”بیسٹ سیلر“ کتاب ہونے کا خطاب ملا، وہ امریکن ادیب ایلیس بروڈن کی ”فولز آف نیچر“ تھی۔

6: شروع میں کتاب کے ٹائٹل (سرورق) پر رائٹر کا نام نہیں لکھا جاتا تھا کیونکہ کتاب کے ٹائٹل کو آرٹ کا نمونہ مانا جاتا تھا۔ اس پر آرٹ کے ڈیزائن کے علاوہ کوئی چیز تحریر نہیں کی جاتی تھی رائٹر کا نام بھی نہیں۔

7: ہیری پوٹر دنیا کی تیسری سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اپنی اشاعت سے اب تک یہ کتاب ایک سے دس نمبر کے درمیان رہی ہے۔

8: انگریز رائٹر جارج ایلیٹ، جسے سب مرد سمجھتے رہے تھے، دراصل ایک خاتون تھیں۔ اس دور میں عورتوں کے لکھنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ان کی تحریروں کو نمایاں مقام نہیں ملتا تھا۔ یہ مانا جاتا تھا کہ عورتوں کو بس ”مخصوص“ موضوعات پر ہی لکھنا چاہیے۔

جارج ایلیٹ جن کا اصل نام ”میری این“ تھا نے یہ سب گوارا نہ کیا اور خود کو مرد ظاہر کر کے لکھنا شروع کر دیا۔ ان کے ناولوں کو دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

10: ”The tale of Genji“ جاپانی ناول، دنیا کا سب سے پہلا ناول ہے۔ جسے گیارہویں صدی کے اول دور میں لکھا گیا۔ یہ ناول اردو میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ میری سب سے درخواست ہے کہ اس ناول کو ضرور پڑھیں۔ (یہ اس سال کے اختتام تک شائع ہو جائے گا۔) ☆ ☆



خدا کی کون سی بات

ثمینہ اکرم کراچی
چل نکلے تو مڑ کے دیکھنا کیا
یہ لہر ڈبوئے یا ترلے
آئے یہ پلٹ کے پھر مسافر
راہ دیکھتی رہ گئی سرلے

سرت الطاف احمد کراچی
کہانی ختم ہوئی، داستاں تمام ہوئی
جہاں پہ سوچا نہیں تھا، وہاں تمام ہوئی
وہ شور تھا کہ شنائی نہیں دیا کچھ بھی
وہیں چلیں کہ جہاں پر خبر تمام ہوئی

منجہ اکرم کراچی
عمر رائیگاں کر دی تب یہ بات مانی ہے
سوت اور محبت کی ایک ہی کہانی ہے
فائزہ بھی کراچی
اب تک وہی خواب ہیں وہی ہیں
وہی میرے گلاب ہیں، وہی ہیں
کہتی ہے زبان محوشیوں کی
وہی درد کے باب ہیں وہی ہیں

بنو سلیم کراچی
ہے کہانی کا وہ کردار مگر باقی ہے
مذہب آئے تو کہانی سے نکل جاتا ہے

افضلہ کرامت شاہ گھوڑا
کہانی ختم ہوئی اور ایسے ختم ہوئی
کہ لوگ کہنے لگے تالیاں بجاتے ہوئے

اقصی باسیل کمالیہ
دیکھے ہو گئی بدنام مسیحا بھی
ہم نہ جانتے تھے کہ ملتی ہے کہیں آنی بھی
سیکڑوں رنج و الم، درد و مصیبت، شب و
کتنی جگمگاہ طلب ہے مری نہ بانی بھی

نسیم کوثر کراچی
تھک گیا میں کہتے کرتے یاد تھک کو
اب تجھے میں یاد آنا چاہتا ہوں

سدرہ بقرہ ملتان
پھر اس کے بعد مارے رستے آسماں ہوتے ہیں
سفر کرنے سے پہلے ماں کا چہرہ دیکھ لیتا ہوں

اقرا حبث کراچی
اب تو تمام عمر اذیت میں ہے جینا
اک بھول کی ایسی سزا دے گیا ہے

ام مادی احسان کراچی
کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکل تو ہر ایک بات پہ رونا آیا
ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم بھول گئے ان کو
کیا ہوا آج یہ کس بات پہ رونا آیا

علی شفیق کراچی
گرنے والے کو بھلا کون سہارا دیتا
خام کا وقت تھا ہر شخص کو گھر جاتا تھا

اسیہ فرید ملتان
تم کو اپنی مثال دیتی ہوں
علاقہ زندہ بھی چھوڑ دیتا ہے

عزرا ناصر، اقصی ناصر گلستان جہڑ
مشکل کہاں تھے ترک تعلق کے مرحلے
اے دل سوال مگر تیری زندگی کا تھا

زیوار فٹین سی ایس شاہ
ایک لغزش بھی جس سے ممکن ہو
وہ یقیناً خدا نہیں ہوتا !
تب نیا راستہ نکلتا ہے
جب کوئی راستہ نہیں ہوتا

نوال افضل گھمن کراچی
دل فیتیری پہ اتر آئے تو
الجب پڑتا ہے بادشاہوں سے

فوزیہ ٹریٹ کراچی
سلیقہ عشق میں میرا کمال کا تھا
کہ اختیار بھی دل پر عجب مثال کا تھا
عجبوں میں، میں قاتل تھی لب نہ کھٹنے کی
جواب دے میرے پاس ہر سوال کا تھا

حمزہ خان کراچی
اب کے احسان جتانے بھی نہیں آیا کوئی
میں جو روٹھا تو منانے بھی نہیں آیا کوئی
ایک یہ دور سونے بھی نہ دیتے تھے
ایک یہ وقت کہ جگانے بھی نہ آیا کوئی

دانیہ عقل کراچی
ڈگمگاتا تھا تو سو ہاتھ لگتے تھے مجھے
گر گیا ہوں تو اٹھانے بھی نہیں آیا کوئی

ثمرا احمد کراچی
اے کہ دوستی کے رشتے کو
دشمنی کا پوند لگانے والے
مکانات عقل کا انتظار کر
دھوکے کو اپنے معنی پہناتے والے

نمرہ، اقرا کراچی
وجہ تسکین بھی ہے خیال اس کا
عمر سے بندہ جلتے تو گراں بھی ہے
زندگی جس کے دم سے ہے نافر
یاد اس کی عذاب جاں بھی ہے

فائزہ بھی کراچی
جہاں میں عام نہ ہوتی کبھی حکومت تھی
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

علی مینا خان کراچی
ایک ہی شخص میری دواؤں کا محمد مرزا
وہ میری صبح، میری شام، میری کامیابیاں
دل دھڑکتا ہے تو دھڑکن میں وہی مثال ہے
وہ میری روح میں شامل میری زندگی گہرا

کون

ماہنامہ
اپریل 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا

کون کا دسترخوان

- نثار "روینہ عارف" سے شاہین رشید کی ملاقات.
- آماد کی دہائے "عماد سہیل" اس ماہ مہمان ہیں.
- نثار "فاطمہ جہاں زب" کہتی ہیں "میری بھی بچی".
- اسما "اقرا حبث" کے "مقابلہ آئینہ".
- "عقب قدمی عمر" رخ چوہدری کا سلسلہ ماحول.
- "ہوا میں رخ بادل گئیں" محمد عبداللہ.
- کاسلسلہ ماحول.
- "من مازم من بے کسم" ام طہور کا مکمل ناول.
- "اگر ہم ستارے ہوتے" سدرہ بقرہ کا مکمل ناول.
- "میں ہے یا غشی ہے تو" سوزیلا بدایض کا ناول.
- "داخل کی دھوپ" مدد رحمان کی ناول.
- نظیر قاسم، بشری ماہ، مارواظ اور حبیب خان
- کے افسانے اور مستقل سلسلے.



حوصلہ

جب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کیا تو دربار دہلی کی طرف سے ان دنوں میرمنور گورنر مقرر تھا۔ اس بے چارے نے پہلے تو دہلی میں امداد کے لیے بہت سی عرصیاں بھیجیں لیکن جب کوئی بھی جواب نہ آیا تو ناچار اپنی ہی مٹی بھرنے سے احمد شاہ کا مقابلہ کیا مگر احمد شاہ نے میرمنور کو شکست دے کر شالامار باغ میں آ مقام کیا۔ اب اس کو اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ناچار خود ملنے گیا۔ احمد شاہ اس کی بہادری اور جرأت دیکھ چکا تھا۔ عزت کے ساتھ بٹھا کر پوچھا۔

احمد شاہ: میر صاحب: ”آپ نے لڑائی سے پہلے ہی اطاعت کیوں نہ قبول کی؟“
میرمنور: ”صرف اس لیے کہ جو میرا آقا ہے، اس کی مرضی کے بغیر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔“
احمد شاہ: ”پھر آپ کے مالک نے آپ کی امداد کیوں نہ فرمائی۔“

میرمنور: ”اس نے خیال کیا ہوگا کہ امداد کے بغیر بھی آپ سے بخوبی نبٹ لوں گا۔“
احمد شاہ: ”اچھا اگر آپ فتح پاتے تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟“

میرمنور: ”میں آپ کو لوہے کی ایک بند گاڑی میں بٹھا کر دہلی بھیج دیتا۔ وہاں بادشاہ سلامت آپ کی بابت جو چاہتے خود حکم دیتے۔“

احمد شاہ: ”اچھا اب خدا نے مجھے فتح مند کیا ہے مجھے آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟“
میرمنور: ”اگر قصائی ہیں تو قتل کر دیجیے۔ ڈاکو ہیں تو لوٹ لیجیے۔ سوداگر ہیں جرمانہ کر دیجیے۔ بادشاہ

ہیں تو معاف فرمادیجیے۔“

میر صاحب کی راست بازی اور حاضر جوابی سے احمد شاہ اتنا خوش ہوا کہ سوالا کھ کی خلعت دے کر اپنی طرف سے بھی اس کو بدستور پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا اور کچھ سالانہ خراج پر صلح کر لی۔ واقعی حوصلہ اور صداقت بڑی چیز ہے۔

حسن طلب

روم کا شہنشاہ کیٹو اپنے پڑوسی ملک پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر مجلس شوریٰ اسے جنگ کی اجازت دینے پر رضامند نہیں تھی۔ مجلس کو راضی کرنے کے لیے جب اس کے تمام زبانی حربے بے سود ہوئے تو اس نے تین خوش رنگ ناشپاتیاں ایک تھیلے سے نکال کر مجلس کے سامنے رکھ دیں۔ ارکان نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہ ناشپاتیاں کس ملک میں پیدا ہوتی ہیں؟“
شہنشاہ نے جواب دیا۔ کاربیج میں جو یہاں سے صرف تین دن کی مسافت پر ہے۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا اور مجلس شوریٰ نے جنگ کی اجازت دے دی۔

چار مہینے اور چار دن کی بادشاہی

وہ جو کہتے ہیں ”چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات“ یہ مثل بہادر شاہ پر بالکل صادق آئی۔ 11 مئی 1857ء کو دلی انگریزوں کے قبضے سے نکلی اور بہادر شاہ کے قبضے میں آئی، 14 ستمبر 1857ء کو پھر بہادر شاہ سے چھن کر انگریزوں کے قبضے میں آ گئی۔

روشن مثال لوگ

سلطان شہاب الدین غوری جیسا عظیم اور بہادر شخص ہماری تاریخ کے زندہ اوراق ہیں۔ یہ عظیم الشان شخصیت جب راجپوتوں سے لڑائی میں کچھ افراد کے مقابلے سے منہ موڑنے اور میدان جنگ سے بھاگنے کی وجہ سے شکست سے دوچار ہوئی تو محمد غوری کو اسلام کی اس سبکی پر بہت دکھ پہنچا۔

اس نے قسم کھائی کہ جب تک میں اپنی ہزیمت کو نصرت میں تبدیل نہیں کروں گا۔ نہ پلنگ پر سوؤں گا۔ نہ لباس فاخرہ کو ہاتھ لگاؤں گا۔ نہ گوشت اور کوئی شامی طعام چکھوں گا۔

پورے ایک سال تک وہ تنگی زمین پر سوتا رہا اور روکھی سوکھی کھاتا رہا۔

اور ایک سال کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے اسے فتح سے ہم کنار کیا تو اس نے اپنی فوج کے سامنے جنگی لباس اتارا۔ فوج یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا تن ایک خون آلود اور بوسیدہ لباس سے ڈھکا ہوا ہے۔

محمد غوری نے انہیں بتایا۔ یہ وہ لباس ہے جسے میں نے گزشتہ جنگ میں پہن رکھا تھا اور آج تک مسلسل وہی لباس پہنے ہوئے ہوں۔ میں جب بھی لباس پر نظر ڈالتا تو اپنی ہزیمت کی یاد تازہ ہوتی اور انتقام کے انگاروں پر لوٹ جاتا اور آج اللہ تعالیٰ کے بے پایاں شکر کے ساتھ اپنا یہ پرانا لباس اتارتا ہوں۔

موسیقی کی قبر

تخت نشین ہونے کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے موسیقی کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ تخت نشینی کے گیارہویں برس اورنگ زیب عالمگیر نے شامی دربار کے تمام موسیقاروں کو برخاست کر دیا۔ مشہور ہے کہ اس موقع پر شامی فنکاروں نے ایک نقلی جنازہ کیا اور روتے پیچھے شامی

نشت گاہ کے سامنے سے نکلے۔ بادشاہ نے دریافت کیا۔

”کون مر گیا ہے؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”راگ مر گیا ہے اور ہم اسے دفنانے قبرستان جا رہے ہیں۔“
اورنگ زیب کچھ گیا اور اس نے مسکرا کر کہا۔ ”قبر گہری کھودنا۔“

نجی زندگی کا تحفظ

حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کی حدود مداخلت کیا ہیں اور شہری کو اس مداخلت سے کتنا تحفظ حاصل ہے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے ایک شخص کی آواز سنی جو گھر میں گانا رہا تھا۔ آپؐ کو شک گزرا اور دیوار پر چڑھ گئے۔ دیکھا وہاں شراب بھی موجود ہے اور عورت بھی۔ آپؐ نے پکار کر کہا۔
”اے دشمن خدا! تو کیا سمجھتا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا۔ اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا۔“
اس نے جواب دیا۔

”امیر المؤمنین! جلدی نہ کیجیے۔ اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپؐ نے تین گناہ کیے ہیں۔ اللہ نے تجھ سے منع کیا ہے اور آپؐ نے ہم سے منع کیا ہے۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ۔ اور آپؐ دلوں کے گھر آئے۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ دوسروں کے گھروں میں اجازت کے بغیر نہ جاؤ۔ آپؐ اہل بیت کے بغیر میرے گھر میں تشریف لے آئے۔“ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنی لٹکی کا اعتراف کیا۔ اور اس کے ظلال کوئی کارروائی نہ کی۔ البتہ اس سے وہ لہا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔



ہماری انڈسٹری بالی وڈ سے متاثر ہے۔ (متاثر.....؟
ارے بھی فوہیا ہے فوہیا) کسی مقام تک پہنچنے کے لیے
یا مقابلے کے لیے تو ابھی بہت وقت لگے گا۔ (سو تو
ہے) اس وقت پاکستانی فلم جدید ٹیکنالوجی کے
ذریعے بن رہی ہے۔ سب کا فوکس ٹیکنالوجی ہے
جبکہ میرے خیال میں کہانی سب سے پہلی ترجیح ہونا
چاہیے۔ کہانی اچھی ہوگی تو کردار بھی جان دار ہو
جاتے ہیں۔

منشائے مزید کہا کہ میں نے آئی فلم تھیٹریا
ٹیوی تک محدود نہیں رکھا۔ مجھے تو جس اچھی کہانی اور
اسکرپٹ سے غرض ہے۔ مجھے اچھا کام کرنا پسند ہے
چاہے وہ فلم ہوئی دی ہو یا تھیٹر۔ جس میں اداکاری کا
زیادہ سے زیادہ موقع ملے۔“

سچائی

اسلام آباد میں ہونے والی ایک تقریب میں
پنجاب فلم سنسر بورڈ کی چیئر پرسن اداکارہ زبیرا نے کہا
ہے کہ اس ملک اور فلم کی ترقی جب ہی ہوگی جب ہر
کوئی حق اور سچ بات کہے (پر فلم والے تو سچ سنتے ہی
نہیں ورنہ انڈسٹری کا آج یہ حال نہ ہوتا) اظہار رائے
کی آزادی ہونا چاہیے میں جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی
جرات رکھتی ہوں۔ سابق وزیراعظم نواز شریف نے
آرٹس فنڈز کے لیے بیس لاکھ روپے دیے۔ جس
سے میں نے مستحق آرٹسٹوں کی مدد کی یہ بیس لاکھ کچھ
بھی نہیں ہیں۔ (پر کچھ تو ہیں ناں، نہ ہونے سے تو)
ہمارے آرٹسٹ بہت برے حالوں میں ہیں۔
(زیبا جی! اس وقت تو پورا ملک ہی برے حال میں
ہے انڈسٹری اور فنکار کیا.....؟)

ادھر ادھر سے

☆ اس وقت سوشل میڈیا پر سب سے بڑی خبر
یہ گردش کر رہی ہے۔

”بھارتی ٹی وی میڈیا کی ”باتھ ٹب“ میں ڈوب

ارادہ رکھتی ہیں۔ جس میں تمام کردار خواتین ہی
نبھائیں گی۔ (کیوں کیا مرد.....؟) لنزے لوہن
کافی عرصے سے دبئی میں مقیم ہیں اور وہ دبئی میں
اپنے لیے ایک جزیرہ بھی ڈیزائن کر رہی ہیں۔ جس کا
نام لوہن آئر لینڈ ہوگا۔ (کیا..... ہیں..... جزیرہ
اور.....؟)

توجہ

اداکارہ منشا پاشا نے کہا ہے کہ ”ہمیں اپنی
کہانیوں پر توجہ دینا چاہیے۔ کسی بھی فلم کی کامیابی میں
سب سے اہم کردار اسکرپٹ کا ہوتا ہے۔ (دلے
آپ نے راجہ ہندوستانی دیکھی ہے.....؟) ماضی کی
بات کریں یا موجودہ دور کی۔ جن فلموں کی کہانیاں
جان دار تھیں ان ہی فلموں کو لوگوں نے بار بار دیکھا۔
(جی جیسے مولا جٹ.....؟) بلاشبہ ہمارے یہاں
اچھی فلمیں بن رہی ہیں (ہیں آہم آہم.....) لیکن



تنقید

ایک طرف اگر یورپی ممالک میں حجاب پہننے
والی مسلمان خواتین کو تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے تو
دوسری طرف مشہور اور خوب اداکارہ لنزے لوہن
حجاب پہن کر فیشن شو میں شرکت کر رہی ہیں۔
لنزے نے گزشتہ دنوں لندن میں ہونے
والے موڈیسٹ فیشن ویک میں حجاب پہن کر شرکت
کی تھی۔ کچھ مغربی حلقوں نے انہیں اس پر تنقید کا نشانہ
بنایا ہے۔ جس پر لنزے نے میڈیا سے بات کرتے
ہوئے کہا کہ ”فیشن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مکمل
لباس نہ پہنیں یا بغیر لباس کے گھومیں۔ فیشن بہت
خوب صورت ہو سکتا ہے۔ اگر اس کے پیچھے مضبوط
خواتین ہوں (مطلب کچھ اینکرز جیسی نہیں جو سر تو
ڈھانپ لیتی لیکن چہرے پر من بھر میک اپ تھوپ
لیتی ہیں) لنزے لوہن سعودی عرب میں فلم بنانے کا

کرموت ہو گئی۔“
یہ لطیفہ نہیں بلکہ اس بے زاری اور ناپسندیدگی کا
اظہار ہے جو نوز محنتوں کی کھیا حرکتوں نے لوگوں میں
پیدا کر دی ہے۔ (عمر فاروق..... مکتوب بھارت)
☆ کچھ ٹی وی اینکرز کو تجزیہ نگار کا درجہ ایسے ملا
ہے جیسے گاؤں میں بھینس کو ٹیکہ لگانے والے گوالے کو
ڈاکٹر کا درجہ ملتا ہے۔

(طارق حبیب..... سوشل میڈیا)
☆ مقتدر حلقوں کی بے بسی کا اندازہ اس بات
سے لگائیے کہ ایک بار پھر اسی عطار کے لونڈے سے
دوا لینے لائن میں کھڑے ہیں جس کے سبب یہ سارا
ملک کرپشن کی بیماری میں مبتلا تھا۔
(روزنامہ امت..... وقائع نگار خصوصی)





- "کاوش بے سود" نعیمہ ناز کا مکمل ناول ، • میراجید، مہناز نعیم، قرۃ العین خرم ہاشمی، عفت سلطان
- "تو کمین شہر جمال کا" فرزادہ کمرل کا مکمل ناول، امت العزیز شہزاد اور قرۃ العین سکندر کے افسانے،
- "دھبہ جنوں" آمنہ ریاض کا ناول، • ڈراما، فلم رائٹر اور گیت نگار "عقیقہ امیر علی" سے ملاقات،
- "حالم" نمرہ احمد کا ناول، • کرن کرن روشنی احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- بشری احمد، سنیہ عمیر اور ام طہیور کے ناول، • ہمارے نام اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
- معروف ٹی وی فنکار "اومی بٹ" سے ملاقات،

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل 2018ء کا شمارہ سالگرہ نمبر آج ہی شائع ہوا

گھر میں بنے نکلش

تیل
گرم مسالا پاؤڈر
ہر مسالا
لال مرچ پاؤڈر
لہسن، ادراک پیسٹ
پیاز (براؤن پس ہوئی)
اسپیگیٹھی
نمک
چلی گارلک ساس
سلاد پتہ
جب ضرورت
ڈیڑھ چائے کا چمچ
تین چائے کے چمچے
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
دو چائے کے چمچے
ایک پکٹ
حسب ذائقہ
ایک کپ
حسب ضرورت

اجزاء:
مرچی کا گوشت
کالی مرچ پس ہوئی
نمک
تیل
میدہ
بریڈ کرمرز
کارن فلوور
انڈا
پیاز
سرکہ
سویا ساس
تیل
ہری مرچ
لہسن
آدھا کلو
آدھا چمچ
حسب ضرورت
دو چمچے
ایک چمچ
حسب ضرورت
ایک چمچ
ایک عدد
ایک عدد
دو چمچے
ایک چمچ
تلنے کے لیے
حسب پسند
چار جوئے

قریب:
مرچی کے قیے کو باریک پس کر اس میں ہر
مسالا (جس میں ہری مرچ، ہراضیا، پودینہ شامل
ہے، پس لیں) گرم مسالا پاؤڈر، نمک، لال مرچ
پاؤڈر، لہسن، ادراک پیسٹ، براؤن کی ہوئی پیاز اور
دو چائے کے چمچے تیل ڈال کر تمام چیزیں اچھی طرح
مکس کر کے حسب پسند سائز کے کباب بنا کر ڈیڑھ
گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

ایک پتلی میں پانی ابلنے کے لیے رکھ دیں اور
اسپیگیٹھی اس میں توڑ کر ڈال دیں، ساتھ ہی
ایک چائے کا چمچ تیل ڈال دیں۔ اسپیگیٹھی
اُبل جائے تو چھان لیں۔ تھوڑی دیر کے لیے
ٹھنڈے پانی میں ڈال دیں، اس کے بعد دوبارہ
چھان لیں۔ ایک ٹرے میں چند سلاد کے پتے بچھا کر
ان پتوں پر اسپیگیٹھی ڈال دیں اور اس پر چلی
گارلک ساس جگہ جگہ ڈالیں۔ آخر میں کباب تل کر
اوپر رکھیں پھر ان کبابوں پر بھی چلی گارلک ساس
تھوڑا تھوڑا ڈالیں، آخر میں ایک سلاد پتہ باریک
کاٹ کر ڈالیں۔

مرچی کا گوشت بغیر ہڈی والا لیں اس میں تمام
چیزیں ملا کر پس لیں اور حسب پسند شکل دے کر
تھوڑی دیر فریج میں رکھ دیں پھر بریڈ کرمرز میں لپیٹ
لیں، کڑائی میں تیل گرم کر کے سنہرا ہونے تک تل
لیں۔ یہ نکلش تیار کر کے فریج میں رکھے جاسکتے
ہیں۔

مزے دار نکلش تیار ہیں۔

چکن کباب ود اسپگیٹھی

اجزاء:
مرچی کا قیہ
ڈیڑھ کلو

کے لیے نہایت مددگار ہے۔

کالی مرچ کی اوپر والی تہ ایسے اجزا سے بھر پور ہوتی ہے جو چکنائی سے بھر پور خلیوں میں کمی کرنے کا سبب بنتی ہے۔

اس کے علاوہ رنگ صاف کرنے والی کریم میں پسلی ہوئی کالی مرچ ملا کر استعمال سے جلد کے مردہ خلیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، جس سے جلد صاف اور چمک دار بن جاتی ہے۔

وزن کم کرنے کا مکمل علاج

وزن کم کرنے کے لیے کھانے پینے میں احتیاط اور باقاعدگی سے ورزش بھی کرنا ضروری ہوتی ہے، صرف گولیاں اور ڈرنک وزن کم نہیں کر سکتے۔ البتہ وزن کم کرنے کے لیے عربی عرق کا استعمال مفید ثابت ہوا ہے۔

عربی عرق

اجزاء

پانی

ایک لیٹر

کٹی ہوئی سوئف

دو چائے کے چمچے

نوشادر

آدھا چمچ

چھوٹی بڑ

ایک چائے کا چمچ

سبز الائچی

سات سے آٹھ عدد

براؤن چینی

بیس گرام

پسی جاو تری

ایک چوتھائی چائے کا چمچ

بڑی الائچی

دو چائے کے چمچے

سب چیزوں کو پانی میں یکا کر ٹھنڈا کر لیں اور فریج میں رکھ دیں۔ روزانہ ایک گلاس پی لیں۔ اس عرق سے آپ کے چہرے کی رنگت نکھرے گی، چہرہ صاف ہوگا، پیشاب کی جلن ختم ہوگی، چربی گھلے گی اور آپ کے بالوں پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ اس عرق کو تین سے چار دن تک فریج میں رکھ کر استعمال کرتی ہیں۔

☆

وزن گھٹائیں، مسالوں سے!

دارچینی

موٹاپا آج کل کا عام مسئلہ ہے، یہ مسئلہ دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے، کیوں کہ آج کل کھانوں میں لوگ فاسٹ فوڈ کو ترجیح دینے لگے ہیں جو جسم میں بہت زیادہ چربی بڑھاتا ہے اور پھر لوگ وزن کم کرنے کے لیے طرح طرح کے ٹوٹکے استعمال کرتے ہیں، لیکن ہم آپ کو آج جو ٹوٹکا بتا رہے ہیں، اس سے آپ اپنے وزن کو بہت جلدی کم کر سکتے ہیں۔

موٹاپا کم کرنے کے لیے دارچینی کا استعمال

دو چائے کے چمچے شہد، ایک چمچ دارچینی اور ایک کپ پانی لیں۔

ایک کپ پانی میں دارچینی اور شہد ڈال کر ابال لیں اور اس پانی کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب یہ پانی ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں تھوڑا سا شہد ملائیں۔

رات کو سونے سے پہلے اس چائے کو پیئیں، اگر پوری نہ پی جائے تو بچا کر رکھ لیں اور دوسری صبح پی لیں۔ اس کے استعمال سے آپ کا وزن بہت جلد کم ہو جائے گا۔

کالی مرچ کا استعمال

کالی مرچ کئی بیماریوں کی دوا ہے، یونیورسٹی آف مشی گن کی ایک تحقیق کے مطابق کالی مرچ میں موجود پیرائین نامی جز انسانی بدن میں نہ صرف چکنائی کو جمنے سے روکتا ہے بلکہ چکنائی کو نیا خلیے بنانے سے بھی باز رکھتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ اس کے علاوہ نزلہ وز کام کی وجہ سے بندناک کو کھولنے، ڈپریشن میں کمی، قوت قلب میں اضافہ اور اینٹی آکسیڈنٹ میں اضافہ کے لیے بھی کالی مرچ کا استعمال مفید ہے۔